Digitized By eGangotri

عصری ثقافت

(تنقیدی مضامین و تبصرے)

دیپک بُدکی

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

دیپک بُدکی

عصری تقاضے

(تنقیدی مضامین وتبصرے)

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

مصنف کی دیگر تصانیف

- ادھورے چہرے (افسانوی مجموعہ)
- چنار کے پنجے (افسانوی مجموعہ)
- زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی (افسانوی مجموعہ)
- ریزہ ریزہ حیات (افسانوی مجموعہ)
- عصری تحریریں (تنقیدی مضامین وتبصرے)
- عصری شعور (تنقیدی مضامین وتبصرے)

ھندی

- ادھورے چہرے (کہانی سنگرہ)
- چنار کے پنجے (کہانی سنگرہ)

مصنف پر لکھی گئی کتابیں

- ورق ورق آئینہ دیپک بُدکی۔ شخصیت اور فن

پروفیسر شہاب عنایت ملک، ڈاکٹر فرید پربتی، ڈاکٹر انور ظہیر انصاری

- دیپک بُدکی کی افسانہ نگاری

(جاوید اقبال شاہ، ایم فل جموں یونیورسٹی)

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

عصری تقاضے

(تنقیدی مضامین وتبصرے)

دیپک بُدکی

میزان پبلشرز (رجسٹرڈ)
متصل فائر اینڈ ایمرجنسی سروسز ہیڈکوارٹرس
بٹہ مالو۔سرینگر کشمیر۔۱۹۰۰۰۱

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

© جملہ حقوق محفوظ ہیں

ISBN-978-81-909941-0-1

نام کتاب : عصری تقاضے

نوعیت : تنقیدی مضامین وتبصرے

مصنف : دیپک بدکی

زیراہتمام : شبیر احمد

قیمت =/450 روپے (چارسو پچاس روپے)

مطبوعہ : میزان سروسز

کمپیوٹر کتابت : مقصود احمد

میزان پبلشرز (رجسٹرڈ)

متصل فائر اینڈ ایمرجنسی سروسز ہیڈ کوارٹرس

بٹہ مالو سرینگر

Ph:2470851, Fax : 2457215, Moblie : 9419002212
email:meezanpublishers@rediffmail.com@gmail.com

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

انتساب

اُن محترم اساتذہ کے نام
جنہوں نے مجھے قلم کی قدر و قیمت سے آشنا کیا۔

- یٰسین صاحب۔
  ھیڈ ماسٹر، گانی آٹ منز سکول، مہاراج گنج سرینگر
- شمبو ناتھ کاچرو صاحب۔
  ٹیچر، ڈی اے وی سکول، امیرا کدل سرینگر
- بشیر صاحب۔
  لیکچرار، بوٹنی، ایس بی کالج، سرینگر
- جی ایم وفائی صاحب۔
  ٹیچر، اورینٹل سکول، (ایم بی ھائیر سیکنڈری سکول) سرینگر

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

سپاس نامہ

شکر گزار ہوں۔

- ان دوستوں کا جنہوں نے میری کوششوں کو سراہا اور زندگی کے ہر موڑ پر میری حوصلہ افزائی کی۔
- ان قلم کاروں کا جنہوں نے مجھے اپنی تصنیفات بھیج کر ان پر تبصرہ کرنے کا موقع فراہم کیا۔
- ان مدیروں کا جنہوں نے میرے تحریر کیے ہوئے تبصرے اپنے گراں قدر رسالوں میں شائع کیے۔
- کمپیوٹر کمپوزر، پروف ریڈر اور ناشر کا جن کی محنت اور لگن کے بغیر اس کتاب کو منظر عام پر لانا مشکل ہو جاتا۔

دیپک بُدکی

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

فہرست

۱. حرفِ آغاز ۱۳

مضامین

۲. موجودہ دور میں اُردو کے مسائل اور ان کا حل ۱۵

۳. ریاست جموں و کشمیر میں اردو کا مستقبل ۲۶

۴. بشری درد و کرب کا عکاس ــــ پُشکر ناتھ ۳۴

۵. اساطیر کی جمالیات اور شکیل الرحمٰن ۴۴

۶. روپ جگاتا اک بنجارہ ــــ سوہن راہی ۴۹

۷. زنفر کھوکھو کی افسانوی دنیا ۶۰

۸. آغا گل کا افسانوی مجموعہ 'گوانکو' ــــ ایک تجزیہ ۶۹

۹. آفاق احمد کی تخلیقی دنیا ۸۱

۱۰. وکیل نجیب اور بچوں کا ادب ۹۰

تبصرے

منٹویات

۱۱. فسانے منٹو کے اور پھر بیاں اپنا ۱۰۳

۱۲. منٹو شناسی اور شکیل الرحمٰن ۱۰۸

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

شعری مجموعے

۱۳. دعا زمین	پروین کمار اشک	۱۱۲
۱۴ ہوا دشتِ دیار	مظفر ایرج	۱۱۶
۱۵. نرم جھونکوں کی صدا	فرحت کانپوری	۱۲۰
۱۶. چراغ پچھلے برس	اعجاز احمد اعجاز	۱۲۷
۱۷. جنگلی پھول	منور رانا	۱۳۱
۱۸. کارِ زیاں	عالم خورشید	۱۳۶
۱۹. گلاب زخموں کے	گلشن کھنہ	۱۴۱
۲۰. خیال موسم	جاوید ندیم	۱۴۵
۲۱. خواب پارہ	خالد بشیر احمد	۱۵۱
۲۲. اسفار	اقبال خسرو قادری	۱۵۴
۲۳. سوا نیزے پہ سورج	شیخ خالد کرار	۱۵۷
۲۴. جیب میں سورج	سسی سری	۱۶۱
۲۵. اکتساب	احمد امام بالاپوری	۱۶۵
۲۶. دل سے اٹھا دھواں	ہری کرشن راز داں راز	۱۷۰
۲۷. ہر لمحہ اور	ہری کرشن راز داں راز	۱۷۴
۲۸. نئے سفر کا آغاز	آغاز بلڈانوی	۱۷۸
۲۹. طلسم	اویس جمال شمسی	۱۸۱
۳۰. چندا کے دیس میں	احمد کلیم فیض پوری	۱۸۴

افسانوی مجموعے

۳۱. نیا منظر نامہ	مظہر سلیم	۱۸۶
۳۲. رام جی کا دُکھ اور ابراہیم اشک۔ افسانے اور تجزیے	ابراہیم اشک ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی	۱۹۰
۳۳. لاوا	رحمان شاہی	۱۹۷

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

۳۴. کوئی چارہ ساز ہوتا۔	ڈاکٹر رینو بہل	۲۰۲
۳۵. تم نے جفا بھی کی تو صنم مدتوں کے بعد	اقبال مہدی	۲۰۶
۳۶. بدلتے زمانے بکھرتے لوگ	صفیہ صدیقی	۲۱۲
۳۷. زندگی کی تلاش میں	ڈاکٹر انوار احمد انصاری	۲۱۶
۳۸. فرشتے کے آنسو	ڈاکٹر بلند اقبال	۲۱۹
۳۹. لمحوں کی داستاں	کرشن بیتاب	۲۲۵
۴۰. درد کی فصیل	کرشن بیتاب	۲۲۸
۴۱. اور خون جلتا رہا	ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی	۲۳۰
منی افسانے/نثر پارے		
۴۲. نقطۂ نوگریز	محمد خالد عابدی	۲۳۳
۴۳. پنجرے کا آدمی	رونق جمال	۲۳۵
۴۴. نئی صبح	ڈاکٹر ایم اے حق	۲۳۸
۴۵. باریکہ	ڈاکٹر ساغر جیدی	۲۴۱
ڈرامے		
۴۶. سنگ ریز ہوائیں	رشید انجم	۲۴۴
۴۷. وتستا کی سیر	ڈاکٹر عزیز حاجنی	۲۴۸
۴۸. ہزار روپے کا نوٹ	ایم مبین	۲۵۱
ناول		
۴۹. یہ پھول خاموش تھا	نقشبندی قمر نقوی	۲۵۳
۵۰. سسکتا سماج	پشوری لال شرر	۲۵۷
سوانح عمری		
۵۱. یہ تو سچا قصہ ہے	سیفی سرونجی	۲۶۱
طنز و مزاح		
۵۲. ترا ممنون	ڈاکٹر بانو سرتاج	۲۶۴

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

انشائیے اور خاکے

۵۳. چہرے یاد رہتے ہیں — منور رانا — ۲۶۹

شکار نامہ

۵۴. خونخوار تیندوے — نقشبندی قمر نقوی — ۲۷۳

تنقید

۵۵. ادبی گفتگو — اسلم عمادی — ۲۸۰
۵۶. شعور ادب — ڈاکٹر انور ظہیر انصاری — ۲۸۶
۵۷. زرِ نقد — محمد شاہد پٹھان — ۲۹۱
۵۸. نثر رنگ و آہنگ — شہناز انجم — ۳۰۰
۵۹. زاویۂ نقد و نظر — ڈاکٹر محبوب راہی — ۳۰۳
۶۰. نظر و قدر — ڈاکٹر انوار احمد انصاری — ۳۱۱
۶۱. تفہیم و توازن — ڈاکٹر انوار احمد انصاری — ۳۱۷
۶۲. بکھرے شیرازے — محمد توفیق خان — ۳۱۹
۶۳. ادبی معاصرین کا مطالعہ — معین الدین عثمانی — ۳۲۳

تحقیق

۶۴. جاں نثار اختر — ڈاکٹر کشور سلطان — ۳۲۶
۶۵. راس المال — عرفان ترابی — ۳۳۱
۶۶. جگن ناتھ آزاد۔ اُردو ادب کی آبرو — محمد توفیق خان — ۳۳۶
۶۷. محمد خالد عابدی۔ ایک مطالعہ — رضیہ حامد اور رہبر جونپوری — ۳۳۹
۶۸. مختار شمیم۔ ایک تاثر — محمد رفیق خان — ۳۴۳
۶۹. ہماری فلمیں اور اردو — محمد خالد عابدی — ۳۴۶
۷۰. پونے میں اُردو افسانہ۔ ایک تحقیق — نذیر فتح پوری — ۳۵۱

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

حرفِ آغاز

تنقیدی مضامین وتبصروں پر مبنی ایک اور کتاب قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ اس سے پہلے ۲۰۰۶ء میں 'عصری تحریریں' اور ۲۰۰۸ء میں 'عصری شعور' منظر عام پر آئی تھیں جن کی توقع سے کہیں زیادہ پذیرائی ہوئی۔ 'عصری تقاضے' بھی اسی سلسلے کی اہم کڑی ہے۔

جیسا کہ عنوانات سے ظاہر ہے ان تصانیف میں مصلحتاً دور حاضر کے قلمکاروں کی کاوشوں کا احاطہ کیا گیا ہے تا کہ ان کے خیالات، محسوسات اور نظریات اُردو کے قارئین تک پہنچ جائیں اور وہ ان سے استفادہ کر پائیں۔

مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ اس بار میں ان سبھی کتابوں پر تبصرے قلمبند نہیں کر سکا جو گذشتہ دو برس میں مجھے موصول ہوئیں۔ وجہ.....؟ دفتری مصروفیات اور ڈھلتی عمر.....! تاہم خاکسار سے جتنا بھی ہو سکا، وہ پیش خدمت ہے۔ بہر حال جن کتابوں پر میں تبصرہ نہیں لکھ پایا ان کے مصنفوں سے معافی کا خواستگار ہوں۔ میری یہ آرزو ہے کہ ہم عصر اردو ادب کا مجمل خاکہ آنے والی نسلوں کی خاطر محفوظ کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً مخلص ادیب سامنے آتے رہیں اور میرے اس مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتے رہیں۔ اُردو میں نہ تو شاعروں کی کمی ہے اور نہ ہی نثر نگاروں کی، نہ واعظوں کی کمی ہے اور نہ منافقوں کی۔ اگر کمی ہے تو سنجیدہ قارئین کی اور غیر جانب دار نقادوں کی جو تنقید کو محض روزی روٹی کا وسیلہ یا گروہی نظریات کا اشتہار نہ سمجھ کر

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ادب کی خدمت کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ ایسی کاوشوں سے قارئین دُنیا کی مختلف اور دور افتادہ اُردو کی بستیوں میں تحریر ہو رہے ادب سے واقفیت حاصل کر سکیں گے، اپنی پسند کی تخلیقات کی نشاندہی کر سکیں گے اور پھر ان کا سنجیدگی سے مطالعہ کر سکیں گے۔

مجھے امید ہے کہ قارئین اس بار بھی میری اس پر خلوص کوشش کو پسند فرمائیں گے اور اپنی گراں قدر رائے سے نوازیں گے۔

وسندھرا، غازی آباد (یوپی) ۔۲۰۱۰۱۲ دیپک بُدکی

۱۲/جنوری ۲۰۱۱ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

مضامین

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

موجودہ دور میں
اُردو کے مسائل اور ان کا حل

بہت سمجھے تھے ہم اس دور کی فرقہ پرستی کو
زبان بھی آج شیخ و برہمن ہے ہم نہیں سمجھے
اگر اُردو پہ بھی الزام ہے باہر سے آنے کا
تو پھر ہندوستان کس کا وطن ہے ہم نہیں سمجھے

(راشد بنارسی)

اُردو محض زبان نہیں ہے بلکہ مشترکہ تہذیب کا آئینہ ہے۔ یہ عربی، فارسی، ترکی، کھڑی بولی اور دیگر مقامی زبانوں کے باہمی اختلاط اور امتزاج کا نتیجہ ہے۔ مغل اور دیگر دکنی حکومتوں نے اس ننھے پودے کی آبیاری کی، انگریزوں نے اسے پروان چڑھایا اور قوم پرست رہنماؤں نے اسے آزادی، قومی یکجہتی، سوشلزم اور سیکولرزم کا علامیہ بنایا یہاں تک کہ بھگت سنگھ 'انقلاب زندہ باد' کے نعرے لگاتا ہوا شہید ہوا۔ لفظ اُردو کا ذکر سب سے پہلے تزک بابری میں ملتا ہے لیکن 'اردو معلیٰ' کا استعمال میر محمد عطا حسین خان تحسین نے کیا۔ کبھی یہ زبان ریختہ کہلائی، کبھی ہندی اور کبھی ہندوی البتہ گذشتہ دو سو سال سے اب 'اردو' کے نام سے جانی جاتی ہے۔ اس قلیل عرصے کے باوجود اس زبان کا ادب کسی بھی زبان کے عمدہ ادب کے ہم پلہ رکھا

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

جاسکتا ہے۔ خوش آئند بات یہ ہے کہ آج اردو نہ صرف برصغیر ہندو پاک بلکہ یورپ اور امریکا کے کئی شہروں میں پھیل چکی ہے۔ اپنے ملک میں ۱۹۹۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۴ء۳ کروڑ اردو جاننے والے لوگ ہیں۔

زبان وادب کی نشو ونما مندرجہ ذیل عناصر پر منحصر ہوتی ہے۔

- جغرافیائی اور تواریخی تغیرات
- حکومت کی سرپرستی
- غیر حکومتی ارادے
- ادب منظوم ومنثور
- ذرائع ابلاغ۔ صحافت، ریڈیو اور ٹی وی

جغرافیائی اور تواریخی تغیرات کی بات کی جائے تو یہ کہنا کافی ہوگا کہ ماضی میں کئی قوموں، جیسے آریائی، عبرانی، یونانی، سائتھین، منگول، ترک وغیرہ نے مختلف وجوہات کی بنا پر نقل مکانی کر کے ہندوستان کو اپنی آماجگاہ بنالیا۔ کئی حکمران وقتاً فوقتاً اس دھرتی پر حملہ آور ہوئے، چند ایک لوٹ کھسوٹ کر کے واپس چلے گئے جبکہ اکثر وبیشتر یہاں کے ہی ہو کر رہ گئے۔ مقامی اوتاروں، مفکروں اور فلسفیوں نے نت نئے مذہبوں اور فلسفوں سے اس قوم کو مالا مال کیا جبکہ دوسری جانب کئی راہبوں اور مبلغوں نے غیر ملکی مذاہب کا کھل کر پرچار کیا۔ ان ہی محرکات کے سبب جہاں ایک طرف اردو اس وسیع ملک میں رابطے کی زبان بن گئی اور مختلف ریاستوں کے لوگ اسے سمجھنے اور بولنے لگے وہیں دوسری طرف تقسیم وطن نے اسے اتنا زک پہنچایا کہ نہ صرف مشترکہ تہذیب بلکہ اس تہذیب کی سب سے بڑی دین 'اردو' اس کے ہتھے چڑھ گئی۔ سرحد کے اس پار فرقہ پرست ادیب، ''پاکستان کو نہ مسلم لیگ نے بنایا اور نہ ہی محمد علی جناح نے بلکہ پاکستان کو اردو نے بنایا'' جیسے زہریلے خیالات کا اظہار کرنے لگے جبکہ سرحد کے اس پار اس زبان کو غیر ملکی اور مسلمانوں کی زبان گردانے لگے۔ ایسے ہی نظریات نے جب دونوں طرف فروغ پایا تو ہندو قارئین اس زبان سے کنارہ کش ہونے لگے یہاں تک کہ من موہن تلخ شمس الرحمٰن فاروقی سے پوچھنے لگا کہ ''میرے گھر میں سبھی لوگ مسلمانوں سے بہتر اُردو بولتے ہیں پھر یہ زبان آخر کس کی ہے؟'' شرپسند عناصر نے اُردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دینے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی اور ہندوؤں کے یوگدان کو نظر انداز کیا جس کے باعث پریم چند، اوپندر ناتھ اشک اور گیان چند جین جیسے اُردو کے متوالے اُردو سے بدظن ہو گئے۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

آزادی کے بعد لسانی بندر بانٹ میں اردو کو نہ تو قومی سطح پر اس کا جائز مقام دیا گیا اور نہ ہی کسی علاقے سے منسوب کر کے وہاں کی سرکاری یا رابطے کی زبان قرار دیا گیا۔ ریاست جموں و کشمیر کو چھوڑ کر اُردو کسی بھی ریاست کی سرکاری زبان نہیں ہے۔

اتر پردیش میں سہ لسانی فارمولہ کے تحت اسے دوسری زبان کا درجہ حاصل کرنے میں آدھی صدی کا انتظار کرنا پڑا۔ آج صورت حال یہ ہے کہ ہر ریاست میں علاقائی زبان کو ترجیح دی جا رہی ہے جبکہ قومی سطح پر صرف انگریزی اور ہندی کا بول بالا ہے۔ اردو کا وہی حشر ہو چکا ہے جو انیتا ڈیسائی کے ناول 'In Custody' میں شاعر نور کا ہوتا ہے۔

جہاں تک ثقافتی وابستگی کا تعلق ہے، یہ امر ضروری ہے کہ زبان یا تو اس دھرتی کی پیداوار ہو جہاں اس کی نشو و نما مطلوب ہے یا پھر صدیوں کے استعمال سے وہ زبان اس دھرتی میں رچ بس گئی ہو۔ پہلے زمرے میں سنسکرت اور عربی کی مثالیں دی جا سکتی ہیں جبکہ دوسرے زمرے میں انگریزی، فارسی اور ہسپانوی شامل کی جا سکتی ہیں۔ ایسپرانٹو Esparanto کی ناکامی کا سبب یہی رہا کہ وہ ان میں سے کسی ایک زمرے میں شامل نہیں ہو سکی۔ اُردو ہندوستان میں پیدا ہوئی اور یہیں پر پھلی پھولی۔ یہ الگ بات ہے کہ لوگ انگریزی پڑھنے اور بولنے میں تو فخر کرتے ہیں مگر اُردو میں بات کرنے سے ہچکچاتے ہیں۔ اردو جس مشترکہ تہذیب کی نشانی ہے، وہ تہذیب بٹوارے کے بعد کہیں کھو سی گئی۔ مذہبی اور علاقائی تعصب نے اتنا زور پکڑا کہ قومی نشان تک زائل ہوتے گئے۔ انہی نشانات میں اردو بھی ایک ہے۔ جو لوگ اردو بولتے تھے انہوں نے فارسی اور عربی الفاظ کو ترک کر کے سنسکرت اور دیگر علاقائی زبانوں کے الفاظ کو اپنایا اور اسے ہندی کا نام دیا۔ فلم نگری ممبئی کی فلموں میں اکثر و بیشتر مکالموں اور گیتوں میں اردو کا استعمال ہوتا ہے، مگر انہیں ہندی فلمیں کہا جاتا ہے اور اسکرپٹ نستعلیق کے بدلے دیوناگری میں لکھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ پاکستان میں بھی ہندی فلموں کا اتنا چلن ہو چکا ہے کہ لوگ عام بول چال میں بھی ہندی کے الفاظ برتنے لگے ہیں۔

دیکھا جائے تو اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں کوئی زیادہ تفریق نہیں ہے۔ اردو میں فارسی اور عربی الفاظ کی کثرت ہے جبکہ ہندی میں سنسکرت الفاظ کی۔ اس لیے ایک زبان کو جاننے والے دوسری زبان کو بہ آسانی اختیار کر سکتے ہیں۔ مسئلہ صرف لفظیات اور رسم الخط کا ہے۔ چونکہ ہندوستان میں ہندی کو قومی زبان قرار دیا گیا اور سرکاری نوکریاں پانے کے لیے انگریزی کے بعد ہندی کو ترجیح دی جانے لگی۔ اس لیے اردو بولنے اور لکھنے والے جستہ جستہ معرب و مفرس الفاظ کو ترک کرنے لگے اور نستعلیق کے بدلے دیوناگری لکھنے

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

لگے۔ حالاں کہ مسلمانوں کو اردو سے منسوب کیا جاتا ہے مگر ان میں بھی اونچے طبقے کے پڑھے لکھے لوگ انگریزی میں تعلیم حاصل کرتے ہیں اور اُردو سے نابلد ہیں جبکہ متوسط طبقے کے طالب علم ملازمت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہندی سکولوں کا رخ کرنے لگے ہیں۔ مکتبوں اور اُردو سکولوں میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبا ایک عجیب سی احساس کمتری کا شکار ہونے لگے ہیں۔ اردو میں گفتگو کرتے وقت بھی عام طور پر اُردو بولنے والے اکثر انگریزی الفاظ کا استعمال کرتے ہیں جو ان کی علمیت کا اظہاریہ بن جاتا ہے۔

بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری: ''اردو ہندی قضیہ کا آغاز بھی حقیقتاً رسم الخط کے سوال سے پیدا ہوا۔'' مولوی عبدالحق تو اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر فرماتے ہیں: ''اُردو ہندی تنازع ہی آگے چل کر دوقومی نظریے کو واضح کرنے اور قیام پاکستان کے لیے راہ ہموار کرنے کا سبب بنا۔''

اُردو رسم الخط کو بدلنے اور سنوارنے کی باتیں برسوں سے ہوتی رہی ہیں حالانکہ زیادہ تر اُردو دانشور اس کی حق میں نہیں ہیں۔ وہ نہ تو اردو کو ترکی زبان کی طرح رومن میں لکھنے کے حق میں ہیں اور نہ ہی دیوناگری رسم الخط اپنانے کے حق میں ہیں۔ میرا خیال بھی یہی ہے کہ اگر ہم دیوناگری کو اپناتے ہیں تو اُردو کی آئڈینٹٹی ختم ہو جائے گی اور صرف ہندی بچے گی اور اگر ہم رومن خط کا استعمال کریں گے تو اپنے ماضی اور اسطوری ورثے سے کٹ کر رہ جائیں گے۔ یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ کمپوٹر نے وہ سب مسائل حل کر دیے جن کے باعث ہمیں نستعلیق میں ٹائپ کرنے میں اور کتابوں کی اشاعت میں دشواریاں پیش آرہی تھیں۔

اب تک تو یہ بھی واضح ہو چکا ہوگا کہ جمہوری ہندوستان میں کبھی کسی حکومت نے اُردو کے تئیں دلی ہمدردی نہیں جتائی۔ صرف میٹھے بول بول کر ووٹوں کی سیاست کی۔ سابق وزیراعظم اندر کمار گجرال نے فرمایا۔

> ''اردو کی تمام انجمنیں، ادارے اور اکیڈمیاں یہ طے کریں کہ وہ ایسے کسی بھی شخص کو، جس کی مادری زبان اُردو ہے، ان پڑھ نہیں رہنے دیں گے۔ تو اُردو زبان یقیناً ترقی کرے گی۔
>
> (بحوالہ اُردو دُنیا جولائی ستمبر ۱۹۹۰ء، صفحہ۔۱۱)

بقول سابق وزیراعظم اٹل بہاری واجپئی۔

> ''اُردو ہندوستان کی قومی زبانوں میں سے ایک ہے۔ اس کی ترقی کی راہ میں ابھی رکاوٹیں ضرور ہیں لیکن یہ رکاوٹیں ایک دن دور ہو جائیں گی۔''
>
> (غالب انٹرنیشنل سمینار، ۱۲ دسمبر ۱۹۹۶ء)

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

اُردو کے مسائل کا جائزہ لینے کے لیے گجرال کمیٹی نے، جس کے صدر نشین اندر کمار گجرال تھے، ۱۹۸۴ء میں حکومتِ وقت کو اپنی رپورٹ پیش کی جو تب سے سرد خانے میں پڑی ہوئی ہے۔ خود گجرال صاحب کے دورِ حکومت میں بھی اس طرف کسی نے توجہ نہیں دی۔ اظہر فاروقی 'اکانامک اینڈ پولیٹیکل ویکلی' (۲/اپریل ۱۹۹۴ء) میں رقمطراز ہیں کہ ''اتر پردیش، جو اردو کا گڑھ مانا جاتا ہے، میں ایک بھی اردو میڈیم پرائمری سکول کام نہیں کر رہا ہے۔ اتنا ہی نہیں اردو کو بطور اختیاری زبان لینے کی سہولت بھی مہیا نہیں کی گئی ہے۔ یہ بات سچ ہے کہ کئی ریاستوں میں اردو کو دوسری زبان کا درجہ حاصل ہے مگر یہ سب کاغذی کارروائی ہے جبکہ زمینی حقیقت اس کے برعکس ہے۔ سکولوں اور کالجوں میں اُردو کی تعلیم مفقود ہونے کے ساتھ ساتھ اردو اساتذہ کی تعداد بھی نہ ہونے کے برابر ہے۔ حالانکہ اتنے بڑے ملک میں چند ایک اُردو یونیورسٹیاں قائم کی جا چکی ہیں مگر وہاں کا حال تو اس سے بھی برا ہے۔ جب نیچے سے ہی اُردو جاننے والے طلبا نایاب ہوں تو پھر ان بڑی بڑی یونیورسٹیوں کا کیا فائدہ؟''

حکومت کو کیا دوش دیں یہاں تو نیم حکومتی اور غیر حکومتی ادارے بھی اردو کی بیخ کنی پر تلے ہوئے ہیں۔ جو لوگ اُردو کی روزی روٹی کھاتے ہیں وہی ان اداروں کو دیمک کی طرح چاٹ رہے ہیں۔ بے ایمانی، کنبہ پروری اور رشوت خوری نے ان اداروں کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ اگر کوئی نیا مفلوک الحال شاعر، افسانہ نگار یا ناول نگار اپنی تصنیف چھپوانے کی غرض سے مسودہ لے کر ان کے پاس جائے تو اسے دور ہی سے جواب دیا جاتا ہے جبکہ آسودہ حال ادیبوں کی تخلیقات کو رسوخ کے باعث بلا تاخیر منظور کیا جاتا ہے۔ کتابوں کی خریداری کے لیے ایسی ایسی شرطیں رکھی جاتی ہیں کہ بے چارہ ادیب ان بھول بھلیوں کو دیکھ کر ہی توبہ کر لیتا ہے۔ ان اداروں سے دو صدیاں پہلے تحریر کی گئیں ڈکشنریاں، اَپ ڈیٹ کیے بغیر، لاکھوں کی تعداد میں شائع ہو رہی ہیں اور جب وہ بکتی نہیں تو ان پر نوے فیصد رعایت دے کر اپنے گودام خالی کروائے جاتے ہیں تاکہ ایسے ہی دوسرے پراجیکٹ ہاتھ میں لیے جائیں۔ اس کے برعکس نئے ادیبوں کے لیے ان اداروں کے دروازے ہمیشہ بند رہتے ہیں۔ ہاں صرف ان ادیبوں کی خاطر داری ہوتی ہے جو یا تو ان اداروں کی اعلیٰ کرسیوں پر فائز ہوتے ہیں یا پھر ان کی لشکر کے سپاہی ہوتے ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ برصغیر ہندو پاک میں یہ حکومتی، نیم حکومتی اور غیر حکومتی ادارے سفید ہاتھی (White Elephants) بن کر رہ گئے ہیں۔

حکومت کی سرپرستی کے بارے میں اتنا کہنا کافی ہوگا کہ ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

اور۔ کاغذ کارروائی، جس سے حکومت کی تشہیر ہو سکے، سرعت سے انجام دی جاتی ہے مگر عملی طور پر ٹھوس قدم اٹھانے میں سبھی حکومتوں نے لیت ولعل سے کام لیا۔ آج صورت حال یہ ہے کہ نہ دفتروں میں اردو میں کام ہو رہا ہے، نہ تعلیم میں اردو کا کوئی عمل دخل ہے اور نہ ہی حکومت نے اردو کی ترویج کے لیے کوئی ترغیباتی سکیم شروع کی ہے۔

جہاں تک تعلیمی اداروں کی کارکردگی کا سوال ہے، اس ضمن میں بھی یہی کہنا کافی ہوگا کہ مختلف حکومتوں نے کبھی اس طرف خلوص نیت سے دھیان نہیں دیا اور نہ ہی اردو میں تعلیم کو بڑھاوا دینے کی کبھی کوشش کی۔ رہا سوال انعامات واکرامات کا۔ اس کا حال تو روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ مفاد پرست بازیگر سیاسی اثر ورسوخ سے متعدد اداروں پر قابض ہو کر باہمی انعام واکرام کا ایک چکر چلائے ہوئے ہیں۔ جو ادب کی بدنامی اور بے زاری کا موجب بن چکا ہے۔ حکمران اور حکومتی ادارے تو ہمیشہ ہی سے قصیدہ نگاروں اور مداحوں کی سرپرستی کرتے آئے ہیں۔ غالب، پریم چند اور منٹو جیسے جید ادیبوں کو نہ کسی عالمی اور نہ ہی کسی قومی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اچھا اور حساس ادیب تو فطرتاً باغی ہوتا ہے پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اس پر حکومت اپنی محبتوں کی بارش برسائے۔ یہاں تو معاملہ اس سے بھی زیادہ سنگین ہے۔ انعام واعزاز پانے کے لیے آپ کو کسی خاص نظریے یا گروہ کا فرد ہونا پڑتا ہے ورنہ نظر انداز ہونا یقینی ہے۔ غیر سرکاری انجمنوں کا حال بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ اکثر انجمنیں اردو کا سہارا لے کر یا تو سیاست کرتی ہیں یا پھر مذہب کا پرچار کرتی ہیں۔ اردو ناشر تو شاعروں اور نثر نگاروں کا خاصا استحصال کرتے ہیں۔ مارکیٹ نہ ہونے کا بہانہ بنا کر وہ ان غریب ادیبوں کو لوٹتے رہتے ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ ان پر احسان بھی جتاتے ہیں۔ میں ان لوگوں سے پوچھتا ہوں کہ اگر ان کتابوں کا مارکیٹ نہیں ہے تو آپ اپنی دکانیں کیوں کھولے ہوئے ہیں؟ کوئی اور پیشہ کیوں نہیں اختیار کرتے؟ بے شمار اکیڈمیوں اور لائبریریوں کو جو اردو کتابیں بیچی جاتی ہیں کیا ان سے کمائی نہیں ہوتی۔ ناشروں اور ادیبوں دونوں کے لائف اسٹائیلوں کا موازنہ کیجیے تو آپ میرے سوال کا جواب پائیں گے۔ ماضی میں چند ایک والنٹری تنظیموں نے وقتاً فوقتاً اپنے ممبروں کی کتابوں کی اشاعت شروع کر لی تھی لیکن دیر سویر تھک ہار کر بیٹھ گئیں۔ وجہ؟ ان کے پاس مارکیٹنگ سیٹ اَپ نہیں ہوتا۔ یہاں یہ سمجھنا بھی ضروری ہے کہ کتابوں کی فراہمی خاص کر نصابی اور بچوں کی کتابوں کی فراہمی اور وہ بھی کم قیمتوں پر کسی بھی زبان کے پھلنے پھولنے کے لیے اشد ضروری ہے۔

اردو کا منظوم ومنثور ادب گذشتہ دو سو سالوں میں اتنا ترقی کر چکا ہے کہ کسی بھی زبان کے اعلیٰ ترین

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ادب کا مقابلہ کرسکتا ہے۔ اردو غزل تو اتنی مقبول ہو چکی ہے کہ ہندی اور دوسری علاقائی زبانوں میں بھی رواج پا رہی ہے۔ میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ اور فیضؔ تو پیکرِ پرستش (icon) بن کر رہ گئے ہیں۔ فکشن میں پریم چند، کرشن چندر، منٹو، بیدی، عصمت اور قرۃ العین حیدر نے عالمی شہرت حاصل کی ہے۔ البتہ جدید ترین ادب طرح طرح کے انحرافات کا شکار ہو کر بے راہ روی میں مبتلا ہو چکا ہے۔ مغرب کی تقلید، لایعنی تجربات اور مہمل اصطلاحات نے اردو ادب کے زوال وانتشار میں مہمیز لگائی ہے۔

ذرائع ابلاغ کی بات کریں تو اردو صحافیوں نے نہ صرف یہ کہ کسمپرسی کے باوجود اردو اخبارات ورسائل نکالے بلکہ جنگ آزادی میں نمایاں رول ادا کیا۔ آزادی سے پہلے اردو ہی ایک ایسی زبان تھی جس نے محکوم لوگوں کے دلوں میں چنگاریاں پیدا کیں اور پھر ان چنگاریوں کو ہوا دے کر شعلوں میں تبدیل کر دیا۔ کون نہیں جانتا کہ ہفتہ وار بلٹز (Blitz) میں خواجہ احمد عباس کا آخری صفحہ پڑھنے کے لیے لوگ پورے ہفتے انتظار کرتے رہتے تھے۔ پھر بھی ایسی کیا وجہ تھی کہ شمع، کتاب، تعمیر، شب خون، بیسویں صدی جیسے رسالے بند ہو گئے سچ تو یہ ہے کہ انہیں کوئی خریدنے والا ملا نہ پڑھنے والا۔ ادھر سماعی اور بصری ذرائع ابلاغ نے بھی گذشتہ صدی میں اردو کی نشو ونما میں خاصا کردار نبھایا مگر افسوس یہ ذرائع ابلاغ آج کل کی نمائشی اور صارفی دنیا کے شکار ہو گئے۔ حالانکہ حال ہی میں ای ٹی وی (اردو) اور ڈی ڈی (اردو) چینلیں شروع کی گئیں مگر ان کی ٹی آر پی ریٹنگ سے ان کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

اس مختصر سے جائزے کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ عملی طور پر ہمیں جو قدم اٹھانے چاہیے ان کی نشاندہی کرنا ضروری ہے۔ اس ضمن میں چند تجاویز ذیل میں رقم کرتا ہوں۔

- بقول دانیال لطیفی ''اُردو بولنے والوں کے لیے اُردو زبان جذباتی اور فکریاتی عمل کا وسیلہ بن کر رہ گئی ہے۔ اس لیے ہم صرف اُردو زبان کے ذریعے ہی مادی خوشحالی اور روحانی ترقی پا سکتے ہیں۔'' اس تناظر میں دیکھا جائے تو ہم سب پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اُردو کے فروغ کے لیے خلوص اور نیک نیتی سے کام کریں۔
- رالف رسل 'اکانامک اینڈ پولیٹکل ویکلی' ۲۹ر جنوری ۱۹۹۹ء میں رقم طراز ہیں: ''اُردو والوں کے لیے یہ از حد ضروری ہے کہ وہ اپنے بچوں اور آنے والی نسلوں کو انفرادی اور جماعتی کاوشوں سے اردو سے متعارف کرائیں اور انہیں اُردو کی تعلیم دیں۔''
- سب سے بڑی بات یہ کہ اردو کو ترقی پسند سوچ اور فکر ہمیشہ اپنانا چاہیے اور کسی تعصباتی یا غیر فطری فکر

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ونظر سے گریز کرنا چاہیے۔

- گورنمنٹ سکولوں میں، جہاں اُردو جاننے والی آبادی سے بچے تعلیم حاصل کرنے کے لیے آتے ہیں، اُردو میڈیم میں تعلیم دی جائے۔ ان سکولوں میں اردو جاننے والے اساتذہ کی تقرری عمل میں لائی جائے۔ ایسے علاقوں میں خالص اردو میڈیم سکول بھی قائم کیے جاسکتے ہیں اور طلباء کو فیس دینے اور کتابیں اور یونیفارم خریدنے کی خاطر مالی امداد دی جاسکتی ہے تاکہ نہ صرف غریب طلباء سکولوں میں داخلہ لیں گیں بلکہ اس کے بعد Wastage اور Stagnation بھی روکی جاسکے۔ کوشش یہ ہونی چاہیے کہ طالب علم سکول چھوڑ کر کام دھندے کی طرف مائل نہ ہوں۔ ان سکولوں میں دوپہر کے کھانے Mid-day Meal کا انتظام بھی کیا جانا چاہیے۔
- چونکہ اسلام میں زکوٰۃ دینا ایک اہم فریضہ سمجھا جاتا ہے اور اسلامی تنظیمیں درس وتدریس کے میدان میں کافی فعال رہتی ہیں، کتنا اچھا ہوتا اگر ایسی تنظیمیں اُردو میڈیم سکولوں میں خیرات سے جمع کی گئی رقوم سے دوپہر کے کھانے Mid-day Meal کا انتظام کروالیتیں۔
- اُردو میڈیم پرائیویٹ سکول کھولنے کے لیے خصوصی مراعات دی جائیں تاکہ انٹرپرینور (Entrepreneur) ایسے سکول کھولنے کی طرف راغب ہوجائیں۔
- سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اردو کے ذریعے دیگر علوم حاصل کرنے کی سہولیت فراہم ہونی چاہیے۔ خاص طور پر پروفیشنل کورسز میں اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے لیے اقدام کیے جانے چاہیے۔
- یہ بات ضروری ہے کہ اردو کو ہم عصر سائنسی اور تکنالوجی سے ہم کنار ہونا پڑے گا۔ یہی اس زبان کی ترقی کی ضمانت ہے اور اسی طرح روزگار کے دروازے بھی کھل جائیں گے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہمیں اپنے ورثے، فکر ونظر، مذہب اور فلسفے سے قطع تعلق کرنا چاہیے۔ ان شعبہ جات کو بھی برابر بڑھاوا دینا ضروری ہے۔
- ثانوی تعلیم کے دوران عموماً طالب علم کسی مخصوص سٹریم کو اپنا لیتے ہیں۔ اکثر وبیشتر طلباء انجینئرنگ، ڈاکٹری، کامرس یا کئی اور پیشہ ورانہ کورسز کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ ان کورسز کے لیے ہمارے ہاں اردو کے ذریعے تعلیم دینے کے معقول انتظامات نہیں ہیں۔ نہ اردو میں ترجمہ کی گئی کتابیں ہیں اور نہ ہی اردو میڈیم کے ذریعے پڑھانے والے استاد دستیاب ہیں۔ چنانچہ اس مسابقتی دور میں ہر کوئی دوسرے سے آگے بڑھنے کی تگ ودو میں لگا رہتا ہے، ہمیں نہ صرف اردو کے ذریعے کالجوں اور یونیورسٹیوں

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

میں تعلیم دینے کے مواقع فراہم کرنے پڑیں گے بلکہ اس بات کا بھی خاص خیال رکھنا پڑے گا کہ اردو کے ذریعے تعلیم پائے ہوئے نوکری کے خواہاں امیدواروں کے ساتھ کسی قسم کا بھید بھاؤ نہ ہو۔

- مراسلاتی کورسز (Correspondence courses) پر خاص دھیان دیا جائے تا کہ اُردو کے ذریعے طالب علم گھر بیٹھے آرٹس، سائنس اور کامرس تینوں شعبوں کے کورسز کی تعلیم حاصل کر سکیں۔ اس کے علاوہ فاصلاتی تعلیم (Distance Education) کے ذریعے جہاں تک ممکن ہو پیشہ ورانہ تعلیم کا بھی معقول انتظام ہونا چاہیے کیونکہ جو طلباء معاشی یا سماجی حالت کے باعث سکول چھوڑنے پر مجبور ہو جاتے ہیں وہ گھر بیٹھے مزید تعلیم حاصل کر سکیں۔
- اُردو میں سکول، کالج اور یونیورسٹی سطح پر سائنس، تکنالوجی اور دیگر مضامین پر سمینار اور ورکشاپ منعقد ہوں جہاں طلبہ اپنی صلاحیت اور ہُنر کا مظاہرہ کر سکیں۔
- اردو میڈیم کے ذریعے تعلیم پانے والوں کو امتیازی نمبرات (Distinction) حاصل کرنے پر اعزازات اور انعامات سے نوازا جائے۔ اسی طرح اردو مضامین میں پہلے تین امتیازی مقام حاصل کرنے والوں کو یونیورسٹی، کالج اور سکول لیول پر انعامات دیے جائیں۔
- اُردو نہ جاننے والے اساتذہ کو سروس کے دوران اُردو سیکھنے اور اس میں مہارت حاصل کرنے کے لیے انتظامات ہونے چاہئیں اور ترغیب کے طور پر ایسے کورسز کامیاب کرنے پر انہیں انکریمنٹ (Increment) دی جانی چاہیے۔
- اُردو میں کتابوں کی اشاعت کا پورے خلوص کے ساتھ انتظام کیا جائے اور یہ کتابیں خاص کر بچوں کے لیے خوبصورت، دلکش اور بامصور ہوں۔ نصابی کتابیں بھی دلکش بنائی جائیں اور بہت ہی کم قیمتوں پر مہیا کی جائیں۔
- انگریزی اور دوسری زبانوں سے ترجمے کے انتظامات بالخصوص کیے جائیں اور یہ دیکھا جائے کہ یہ ترجمے غیر مانوس اور ثقیل نہ ہوں۔ عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ ترجمہ نگار ترجمہ کرتے وقت عربی اور فارسی کی ڈکشنریاں کھول کر بیٹھ جاتے ہیں جبکہ بہت سارے عام فہم انگریزی کے الفاظ بڑی آسانی سے اردو میں سما سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں جو کتاب تیار ہوتی ہے وہ محض لائبریریوں کی زینت بن جاتی ہے۔ اس ضمن میں دارالترجمہ عثمانیہ کی کتابیں کھول کر دیکھی جا سکتی ہیں جو کتب خانوں میں دھول سے اَٹی پڑی ہیں۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

- اردو میں کتابیں شائع کرنے کے لیے ادیبوں اور ناشروں کو مالی امداد دینی چاہیے تا کہ وہ نہ صرف طبع زاد کتابیں شائع کریں بلکہ ترجمہ کر کے بھی دنیا کے علم وادب، سائنس، تکنالوجی اور جدید فکر وفن سے اردو داں طبقے کو روشناس کرائیں۔
- فورٹ ولیم کالج کی طرز پر انگریزی اور دیگر زبانوں سے ترجمہ کرنے کے لیے ایک دارالترجمہ کا قیام عمل میں لانا چاہیے جس میں خصوصی طور پر سائنس اور تکنالوجی کی کتابوں پر زور دینا چاہیے۔
- اردو کتابوں کی مارکیٹنگ کا انتظام کیا جانا چاہیے۔ اردو رائٹرس کو اعزازات اور خلعتیں دینے کے بجائے اگر ان کی کتابوں کی اشاعت اور تقسیم کاری یقینی بنائی جائے تو بہتر ہوگا۔ یہ انتظام بین ریاستی ،قومی اور عالمی سطح پر ہونا چاہیے۔
- کتابوں اور رسالوں کے لیے سستے داموں پر کاغذ اور سبسڈی فراہم کی جائے۔
- اردو میں ایک گلی میں صبح سویرے کوئی رسالہ شائع ہوتا ہے اور سورج ڈوبتے ہی دم توڑتا ہے۔ پھر دوسری گلی میں دوسری صبح ایک اور رسالے کی اشاعت کی تیاری ہوتی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم سب مل کر کوشش کریں کہ رسالوں کی تعداد کم ہی کیوں نہ ہو مگر ان کو تنظیمی بیک اپ حاصل ہو اور ان کی عمر دراز ہو۔ کارپوریٹ بیک اَپ سے نہ صرف اردو رسالے نکھر سکتے ہیں بلکہ ان کی تقسیم کاری بھی آسان ہو سکتی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اشاعت پر ادیبوں کو معقول معاوضہ بھی مل سکے۔ یہاں پر یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس وقت جو حکومتی اور نیم حکومتی ادارے اردو رسالے شائع کرتے ہیں ان پر چند افراد کی اجارہ داری رہتی ہے۔ ان رسالوں کے منتظمین سے میری درخواست ہے کہ مواد چننے میں کنبہ پروری اور بھائی بندی کو فروغ نہ دیں اور رسالے پر چمکیلے آرٹ پیپر جیسے فالتو اخراجات نہ لادیں جس سے ادارے کی کمر ٹوٹ جاتی ہے اور رسالے کا تسلسل کھٹائی میں پڑتا ہے۔ ان رسالوں میں کفایت شعاری سے کام لیا جائے تو ان کی عمر بھی بڑھ سکتی ہے اور ان کے صفحات بھی۔
- کمپیوٹر سافٹ ویئر کی فراہمی آسان ہو اور اگر ضروری ہو اس میں سبسڈی بھی دی جائے۔ ایسے سکولوں میں جہاں میڈیم اردو ہو، کمپیوٹروں میں اردو سافٹ ویئر ڈالا جائے اور کمپیوٹر سیکھنے کے انتظامات کیے جائیں۔
- ہمارے ملک میں لائبریری نظام بھی بڑا ناقص ہے۔ کہیں کہیں پر اگر کتب خانے ہیں بھی تو وہ شہر کے

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

کسی دور دراز علاقے میں واقع ہیں یا پھر ان میں ضرورت کی کتابیں دستیاب نہیں ہوتیں۔ جتنی بھی کتابیں میسر ہیں ان پر برسوں کی دھول چڑھی ہوتی ہے۔ خیر ادب اور مذہب کی کتابیں تو مل بھی سکتی ہیں مگر اردو میں لکھی گئی سائنسی اور جدید علوم کی کتابیں تو بالکل ہی ناپید ہیں۔

- اردو اکادمیوں اور ترقیاتی اداروں میں قابل اور مخلص عہدیدار لگائے جانے چاہیے جنہوں نے نہ صرف اردو ادب اور زبان میں اپنا یوگدان دیا ہو بلکہ انتظامی صلاحیت بھی رکھتے ہوں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ان کی ایمانداری پر کوئی شک وشبہ نہ ہو۔
- ٹیلی ویژن پر اردو چینلوں کو دکھانا لازمی قرار دیا جانا چاہیے۔ ڈی ڈی (اُردو) اور ای ٹی وی (اردو) وغیرہ کو ایسے بینڈ پر رکھا جائے جہاں وہ کسی پریشانی کے بغیر صاف طور پر دکھائی دیں۔
- نوکری حاصل کرنے والے امیدواروں کا ذریعہ تعلیم اگر اُردو رہا ہو تو زبان کی بنیاد پر اس کے مدمقابل کو ترجیح نہیں ملنی چاہیے۔
- ہندوستان اور پاکستان کے بیچ اردو کو قربانی کا بکرا بنانے کے بجائے باہمی اشتراک کی ضرورت ہے تاکہ ہندوستان میں کاپی رائٹ شدہ کتابیں پاکستان میں، اور پاکستان میں جملہ حقوق پائی جانے والی کتابیں ہندوستان میں جعلی طور پر نہ بیچی جاسکیں۔
- ہندوستان اور پاکستان کے بیچ ڈاک محصول، خصوصاً کتابوں اور میگزینوں کے لیے، رعایتی درجے پر لاگو ہونا چاہیے تاکہ کتابیں اور رسالے آسانی سے دونوں جگہ پڑھی جائیں اور مستقبل میں کسی قرۃ العین حیدر کو یہ دیکھ کر حیرانی نہ ہو کہ اس کی کتابوں پر ناشروں نے پاکستان میں لاکھوں روپے کمائے جبکہ اس کو ایک پیسہ بھی نہ ملا۔
- اردو زبان میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ دلوں کو جوڑ سکتی ہے اور پاکستان اور ہندوستان کے درمیان پل بنا سکتی ہے۔ برصغیر میں امن وآشتی لاسکتی ہے۔ ہوسکتا ہے مولوی عبدالحق اپنی جگہ صحیح ہوں مگر میرا یہ ماننا ہے کہ اردو ہی ایک ایسی زبان ہے جو دو ملکوں کو سیاسی پر نہ سہی مگر ثقافتی طور پر ایک بار پھر جوڑ سکتی ہے۔

❖ ❖ ❖

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ریاست جموں وکشمیر میں اُردو کا مستقبل

زبان وادب کی نشو ونما کے لیے مندرجہ ذیل عناصر اہم رول ادا کرتے ہیں۔

- ثقافتی وابستگی
- حکومت کی سرپرستی
- ادب منظوم ومنثور
- ذرائع ابلاغ۔صحافت، ریڈیو اور ٹی وی
- غیر حکومتی ادارے

جہاں تک ثقافتی وابستگی کا تعلق ہے۔ یہ امر ضروری ہے کہ زبان یا تو اس دھرتی کی پیداوار ہو جہاں اس کو نشو ونما مطلوب ہے یا پھر صدیوں کے استعمال سے وہ زبان اس دھرتی میں رچ بس گئی ہو۔ پہلے زمرے میں سنسکرت اور عربی کی مثالیں دی جاسکتی ہیں جبکہ دوسرے زمرے میں انگریزی اور فارسی۔ ایسپرانٹو(Esperanto) کی ناکامی کا سبب بھی یہی ہے کہ وہ ان میں سے کسی بھی زمرے میں شامل نہیں۔

ریاست جموں وکشمیر کو لارڈ بَرڈوڈ (Lord Birdwood) نے جغرافیائی بدقطع جانور (Geographical Monster) سے اس لیے مشابہت دی تھی کیوں کہ اس ریاست کے تین اہم حصے (جموں، کشمیر اور لداخ) رسم ورواج اور زبان کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ تاہم اس کثیر الزبان اور کثیر التمدن ریاست نے انیسویں صدی کے اواخر میں اردو کو گلے لگایا، اس کو اپنایا اور پھر

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

رابطے کی زبان(Lingua franca) کے طور پر اختیار کیا۔۱۸۸۹ء میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا،۱۹۴۰ء میں خواجہ غلام السیدین کی سفارشات پر اسے سکولوں میں ذریعہ تعلیم بنایا گیا اور پھر آزادی کے بعد جموں وکشمیر آئین ساز اسمبلی کے دفعہ ۱۴۵ کی رو سے اردو کو ریاست کی سرکاری زبان تسلیم کیا گیا۔ساتھ ہی سکولوں اور کالجوں میں اردو اساتذہ کی تقرری عمل میں لائی گئی۔اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اردو زبان ایک جانب ہند آریائی زبان ڈوگری کے قریب تھی اور دوسری جانب درد (پشاچ) خاندان کی کشمیری زبان پہلے ہی سے عربی اور فارسی کی لفظیات اور تلمیحات کی بدولت اس کے قریب آچکی تھی۔ادھر لداخ کے بیشتر علاقوں میں ترکوں کی آمد اور باہمی تجارت کے سبب اردو کو سمجھنے میں کوئی دشواری پیدا نہیں ہوئی۔

۱۸۸۲ء میں گورنمنٹ گزٹ 'بدیا بلاس' کے اجرا ہونے سے حکومت کی سرپرستی میں اردو صحافت کی بنیاد پڑی۔اس وقت ریاست کے مختلف اضلاع سے شائع ہونے والے اردو اخبارات کی تعداد ستر سے تجاوز کر چکی ہے۔یہی وجہ تھی کہ بابائے اردو مولانا عبدالحق نے اپنے خطبے میں کہا تھا کہ ''شاید ہندوستان کے کسی صوبے میں اردو اس قدر مقبول اور رائج نہیں جس قدر کشمیر میں ہے۔'' آج حالت یہ ہے کہ اردو اس دھرتی کی بو باس میں پوری طرح رچ بس گئی ہے اور ریاست کے بیشتر لوگ اردو میں گفتگو کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔

ریاستی حکومت کی سرپرستی کے بارے میں اتنا کہنا کافی ہوگا کہ ہاتھی کے دانت دکھانے کے اور کھانے کے اور۔کاغذی کارروائی، جس سے حکومت کی تشہیر ہو سکے، سرعت سے انجام دی جاتی ہے مگر عملی طور پر ٹھوس قدم اٹھانے میں سبھی حکومتوں نے لیت ولعل سے کام لیا۔میں نے ابتدائی پراگراف میں ریاست میں اردو کے ارتقاء پر روشنی ڈالی ہے لیکن آج صورتِ حال یہ ہے کہ دفتروں میں اردو میں کام ہو رہا ہے نہ تعلیم میں اردو کا کوئی عمل دخل ہے۔نہ ہی حکومت نے اردو کی ترویج کے لیے ترغیباتی سکیمیں شروع کی ہیں۔

جہاں تک اردو ادب کا تعلق ہے، ریاستِ جموں وکشمیر اردو شاعروں، افسانہ نگاروں، ناول نگاروں، محققوں اور تنقید نگاروں کا ایک کبھی نہ رکنے والا کارواں پیدا کرتی رہی ہے جن میں سے چند ایک نے عالمی سطح پر اپنی مہر ثبت کی ہے۔برادران ہرگوپال خستہ اور سالگ رام سالک کے یوگدان کو کون بھلا سکتا ہے۔ میر غلام رسول نازکی، رسا جاودانی، عابد مناوری، میکش کاشمیری، مظفر ایرج، عرش صہبائی، حکیم منظور، حامدی کاشمیری، پرتپال سنگھ بیتاب، فرید پربتی، رفیق راز، شبنم عشائی، سیدہ نسرین نقاش، شفق سوپوری وغیرہم نے شاعری میں، پریم ناتھ پردیسی، قدرت اللہ شہاب، پریم ناتھ در، رامانند ساگر، نرسنگھ داس نرگس، ٹھاکر

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

پونچھی، موہن یاور، تیج بہادر بھان، پشکر ناتھ، کے ڈی مینی، نور شاہ، رام کمار ابرول، برج کتیال، ویدراہی، کلدیپ رعنا، خالد حسین، دیپک کنول، ویریندر پٹواری، عمر مجید، عبدالغنی شیخ، شمس الدین شمیم، آنند لہر اور راقم التحریر نے فکشن میں، حامدی کاشمیری، اکبر حیدری، برج پریمی، ظہور الدین، پریمی رومانی نے تنقید میں، اور محمد دین فوق، شہ زور کاشمیری اور محمد یوسف ٹینگ نے تحقیق میں اپنا لوہا منوایا ہے۔ نام تو خیر اَن گنت ہیں اور یہ سفر ہنوز جاری ہے مگر سچ یہ بھی ہے کہ اتنے بڑے کارواں میں دو تین ہی نام ایسے ہیں جنہوں نے عالمی سطح پر اپنا مقام بنایا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اردو ادب کے حوالے سے نہ تو ادبی تنظیموں نے اور نہ ہی ریاستی حکومت نے ریاستی قلمکاروں کو اردو دنیا میں پہچان بنانے میں مدد کی۔ خود شاعر اور افسانہ نگار بھی کلچرل اکادمی کے شیرازہ سے اس طرح بندھے رہے جیسے اردو دنیا وہیں تک محدود ہو۔ غیر ریاستی ناقدوں نے بھی کشمیر کے اردو رائٹرس کو ہمیشہ نظر انداز کرنے کی کوشش کی۔

ذرائع ابلاغ کی بات کریں تو اردو صحافیوں نے نہ صرف یہ کہ اردو اخبارات و رسائل نکالے بلکہ جنگ آزادی میں بھی نمایاں رول ادا کیا۔ ۱۹۳۰ء کے بعد اردو ہی ایسی زبان تھی جس نے محکوم لوگوں کے دلوں میں چنگاریاں پیدا کیں اور پھر ان چنگاریوں کو ہوا دے کر شعلوں میں تبدیل کیا۔ پریم ناتھ بزاز (وتستا، مارتنڈ) محمد سعید مسعودی، ملک راج صراف (رہبر)، کشپ بندھو، محمد دین فوق، غلام نبی رفیقی، جیالال کلم، لالہ شیورام گپتا کے نام کون بھول سکتا ہے۔ آزادی کے بعد بھی یہ کارواں جاری ہے۔ چند نام ہیں۔ خواجہ ثناء اللہ بٹ، غلام محمد صوفی، شمیم احمد شمیم، وید بھسین، فاروق مضطر، رشید تاثیر، شبنم قیوم اور طاہر مضطر۔ اخبارات کی تعداد کے باوجود ٹیلی ویژن اور دوسری زبانوں کو ترجیح دیے جانے کے باعث اردو کی صحافتی دنیا بھی روز بروز سکڑتی جا رہی ہے۔ دوسری طرف ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے اردو کی نشو و نما میں خاص کردار نبھایا ہے۔ دونوں اداروں سے اردو کے پروگرام بھی نشر ہوتے ہیں اور ڈرامے و سیریل بھی۔ نتیجتاً مقامی ٹیلنٹ کو نہ صرف اپنے جوہر دکھانے کے مواقع میسر ہوتے ہیں بلکہ ان کی ایمپلائمنٹ کی راہیں بھی کھل جاتی ہیں۔ رامانند ساگر، برج کتیال، ویدراہی، وحشی سعید ساحل، ایم کے رینا فلموں سے وابستہ ہو گئے جبکہ قیصر قلندر اور وجے سوری نے ریڈیو اور ٹی وی کو ہی روزگار کا وسیلہ بنایا۔

غیر حکومتی اداروں خصوصاً ادبی تنظیموں کی بات کی جائے تو یہاں بھی ایک کہکشاں نظر آتی ہے۔ بدیا بلاس سبھا، انجمن نصرت الاسلام، بزم سخن، بزم مشاعرہ، اخوان الصفا، کشمیر رائٹرس لیگ، انجمن ترقی پسند مصنفین، اردو سبھا، بزم ادب، قومی کلچرل محاذ، اکادمی آف آرٹ لنگویجز اینڈ کلچر، اردو ہندی سنگم چند ایک

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

نام ہیں جن کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ ان کے علاوہ جموں اور کشمیر دونوں یونیورسٹیوں کے شعبۂ اردو کافی فعال ہیں۔ پوسٹ گریجویشن، ایم فل اور ڈاکٹریٹ کی تعلیم کے علاوہ ان کے مجلّے تواتر کے ساتھ نکلتے ہیں۔ البتہ سِکّے کی دوسری طرف دیکھیں تو یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ جموں و کشمیر ہی واحد ریاست ہے جہاں اردو کے لیے الگ سے کوئی اکادمی نہیں ہے، دو تین تنظیموں کو چھوڑ کر کوئی تنظیم فعال نہیں ہے۔ نہ ہی یہاں سے کوئی ادبی رسالہ مستقل طور پر شائع ہو رہا ہے۔

اس پس منظر میں دیکھا جائے تو ہمارے معاشرے میں اردو کا ہمیشہ اہم رول رہا ہے۔ اس کے باوجود ہم شتر مرغ کی مانند ریت کے اندر سر چھپائے بیٹھے دشمن کے وجود کی نفی کر رہے ہیں۔ سچ یہ بھی ہے کہ اردو کو آج جس چیلنج کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اس سے پہلے ایسی حالت کبھی نہ تھی۔ عالمی گاؤں میں انگریزی آکٹوپس کے پھیلتے پنجے، انٹرنیٹ پر انگریزی کا چلن، مغربی کلچرل جارحیت، سائنس اور تکنالوجی میں انگریزی کا بول بالا، ہندی اور اُردو کی آپسی مسابقت، سیاسی تعصب اور مقامی ادیبوں کی علاقائی عصبیت نے آزادی کے بعد اُردو کو شدید زک پہنچائی ہے اور ایسے مُحبس ماحول میں اس میٹھی زبان کا دم گھٹتا چلا جا رہا ہے۔ گذشتہ مردم شماری میں اردو کو مادری زبان لکھوانے والوں کی تعداد بہت کم ہو گئی ہے۔ ایسے تناظر میں ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو کی بقاء کے لیے اور اس کی ترویج کے لیے ہر سطح پر ضروری اقدامات کیے جائیں جس کے لیے نہ صرف حکومت کو بلکہ ہم سب کو آگے آنا پڑے گا۔

سب سے پہلے میں تعلیمی نظام کی بات کروں گا۔ آزادی کے بعد ہم نے یونیورسٹیوں اور کالجوں میں اردو کے شعبے تو کھولے مگر ان میں طالب علم کہاں سے آئیں گے جب تک کہ بنیادی اور ثانوی تعلیم کی سطح پر اردو میڈیم کے ذریعے تعلیم حاصل کرنے کی سہولتیں میسر نہ ہوں۔ آج بنیادی تعلیم میں یہ ضروری ہے کہ بچے اردو، انگریزی یا ہندی میں سے کسی ایک زبان کو ذریعہ تعلیم اختیار کر لے۔ اردو زبان کی تعلیم کسی بھی لیول پر لازمی نہیں ہے۔ نہ ہی بنیادی تعلیم کے بعد سکولوں اور کالجوں میں اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کی سہولتیں مہیا کی گئی ہیں۔ دیکھا جائے تو اکثر بچے انگریزی یا پھر ہندی میڈیم کی طرف راغب ہوتے ہیں۔ ایسی صورتِ حال میں ریاست میں اُردو کو سرکاری زبان کا درجہ دینا محض ایک کاغذی کارروائی بن کر رہ گیا ہے۔ سرکاری فائیلوں میں روزمرہ کا کام انگریزی ہی میں ہوتا ہے۔ ریونیو ریکارڈ میں اردو کا استعمال تو خیر اب بھی جاری ہے مگر جس لکھاوٹ میں یہ کاغذات بنائے جاتے ہیں وہ پٹواری اور عدالت کے چند کرمچاریوں کے سوا کسی کی سمجھ میں نہیں آتی۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ثانوی تعلیم کے دوران عموماً طالب علم کسی مخصوص سٹریم کو اپناتے ہیں۔ اکثر و بیشتر طالب علم انجینئرنگ، ڈاکٹری، کامرس یا پھر دیگر پیشہ ورانہ کورسز کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ ان کورسز کے لیے ہمارے ہاں اردو کے ذریعے تعلیم دینے کے معقول انتظامات نہیں ہیں۔ نہ اردو میں ترجمہ کی گئی کتابیں دستیاب ہیں اور نہ ہی اُردو میڈیم کے ذریعے پڑھانے والے استاد موجود ہیں۔ چنانچہ اس مسابقتی دنیا میں ہر کوئی دوسرے سے آگے بڑھنے کی تگ ودو میں لگا رہتا ہے۔ ہمیں نہ صرف اردو کے ذریعے کالجوں اور یونیورسٹی میں تعلیم دینے کے مواقع فراہم کرنے پڑیں گے۔ بلکہ اس بات کا بھی خیال رکھنا پڑے گا کہ اردو کے ذریعے تعلیم پائے ہوئے نوکری کے خواہاں امیدواروں کے ساتھ کسی قسم کا بھید بھاؤ نہ ہو۔

جموں وکشمیر میں لائبریری نظام بھی بڑا ناقص ہے۔ کہیں کہیں پر اگر لائبریریاں ہیں بھی، وہ یا تو شہر کے کسی دور دراز علاقے میں واقع ہیں یا پھر ان میں ضرورت کی کتابیں دستیاب نہیں ہیں۔ جتنی بھی کتابیں میسر ہیں ان پر صدیوں کی دھول چڑھی ہوئی ہے۔ تکنالوجی کی تو بات ہی نہیں اردو میں لکھی گئی سائنسی اور جدید علوم کی کتابیں تو بالکل ہی نظر نہیں آتیں۔

اس مختصر سے جائزے کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ عملی طور پر ہمیں جو اقدام اٹھانے چاہئیں ان کی نشاندہی ہو:

۱۔ ریاست میں خالص اردو کی نشوونما کے لیے اردو اکادمی کا قیام ہونا چاہیے جس کی شاخیں ہر ضلع میں ہونی چاہئیں۔ اس کے لیے حکومت کی جانب سے پہل ہو تو بہتر رہے گا کیونکہ پرائیویٹ طور پر اٹھائے گئے اقدام ناکام ثابت ہو چکے ہیں۔

۲۔ اُردو میں کتابیں شائع کرنے کے لیے ادیبوں اور ناشروں کو مالی امداد مہیا ہونی چاہیے تاکہ وہ نہ صرف طبع زاد کتابیں شائع کریں بلکہ ترجمہ کر کے بھی دنیا کے علم وادب، سائنس، تکنالوجی اور جدید فکر وفن سے ریاستی عوام کو روشناس کرائیں۔

۳۔ فورٹ ولیم کالج کی طرز پر ریاست میں انگریزی ودیگر زبانوں سے ترجمہ کرنے کے لیے ایک دارالترجمہ کا قیام عمل میں لانا چاہیے جس میں خصوصی طور پر سائنس اور تکنالوجی کی کتابوں پر زور دینا ضروری ہے۔

۴۔ اردو کتابوں کی مارکیٹنگ کا انتظام ہو۔ اردو رائٹرس کو اعزازات اور خلعتیں دینے کے بجائے اگر ان کی کتابوں کی اشاعت اور تقسیم کاری یقینی بنائی جائے تو بہتر رہے گا۔ یہ انتظام صرف ریاست کے

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

اندر محدود نہیں ہونا چاہیے بلکہ ریاست سے باہر بھی دوسرے اداروں سے مارکیٹنگ سمجھوتے کر کے عمل میں لانا چاہیے تاکہ ریاستی قلمکاروں کی کاوشوں سے پوری اردو دنیا کو جانکاری حاصل ہو۔

۵۔ ریاست سے شائع ہونے والے میگزینوں خاص کر ادبی اور سائنسی میگزینوں کے لیے سبسڈی اور سستے کاغذ کی فراہمی کا انتظام ہونا چاہیے۔

۶۔ اُردو اکادمی سے ایسا ماہنامہ شائع ہونا چاہیے جو ریاست میں اردو کی سرگرمیوں اور اردو ادب کا آئینہ ہو اور بلاناغہ ہر مہینے نکلتا رہے۔ اس ضمن میں ضرورت اس بات کی ہے کہ میگزین عام میگزینوں کی طرح کفایت شعاری سے کم بجٹ پر نکالا جائے تاکہ اس کی پائیداری یقینی ہو جائے۔

۷۔ گورنمنٹ سکولوں میں اردو میڈیم میں تعلیم حاصل کرنے کے خاطر خواہ انتظامات کیے جائیں اور وہاں پر اردو جاننے والے اساتذہ کی تقرری عمل میں لائی جائے۔ جدھر مناسب ہو خالص اردو میڈیم سکول قائم کیے جائیں جہاں طالب علموں کو فیس، کتابیں اور یونیفارم خریدنے کی خاطر مالی امداد دی جائے تاکہ نہ صرف یہ کہ غریب طلبا سکولوں میں داخلہ لیں، بلکہ اس کے بعد Stagnation اور Wastage بھی روکی جائے۔ اس طرح لڑکے سکول چھوڑ کر کام دھندہ کرنے کی طرف مائل نہیں ہوں گے۔ ان سکولوں میں دوپہر کے کھانے (Mid day Meal) کا انتظام ہو تو بہتر رہے گا۔

۸۔ بنیادی تعلیمی اداروں میں اردو لازمی قرار دینا چاہیے اور اس مضمون میں کامیاب ہونا ضروری ہو۔

۹۔ اردو میڈیم پرائیویٹ سکول کھولنے کے لیے مراعات دی جائیں تاکہ انٹرپرینور (Entrepreneur) ایسے سکول کھولنے کی طرف راغب ہوں۔

۱۰۔ ہر سکول، کالج، اور یونیورسٹی میں اردو کے ذریعے دیگر علوم حاصل کرنے کی سہولت فراہم ہونی چاہیے خاص طور پر پروفیشنل کورسز میں اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے لیے اقدام کرنے چاہئیں۔

۱۱۔ مراسلاتی کورسز (Correspondence courses) پر خاص دھیان دیا جائے تاکہ اردو کے ذریعہ طالب علم گھر بیٹھے آرٹس، سائنس اور کامرس تینوں سٹریمز کے کورسز کی تعلیم حاصل کر سکیں اس کے علاوہ فاصلاتی تعلیم (Distance Education) کے ذریعے جہاں تک ممکن ہو پیشہ ورانہ تعلیم کا بھی معقول انتظام ہونا چاہیے کیونکہ جو طلبا معاشی یا سماجی حالات کے باعث سکول چھوڑنے پر مجبور ہوں وہ گھر بیٹھے ہی مزید تعلیم حاصل کر سکیں۔

۱۲۔ اُردو میں سکول، کالج اور یونیورسٹی سطح پر سائنس، تکنالوجی اور دیگر مضامین میں سمینار اور ورکشاپ

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

منعقد ہوں جہاں طالب علم اپنی صلاحیت اور ہُنر کا مظاہرہ کر سکیں۔

۱۳۔ اردو میڈیم کے ذریعہ تعلیم پانے والوں کو امتیازی نمبرات (Distinction) لانے پر اعزازات اور انعامات دیے جائیں۔ اسی طرح اردو مضامین میں پہلی تین پوزیشنز لانے والوں کو یونیورسٹی، کالج اور سکول لیول پر انعامات دیے جائیں۔

۱۴۔ اردو نہ جاننے والے اساتذہ کو سروس کے دوران اردو سیکھنے کے انتظامات ہونے چاہیے اور ترغیب کے طور پر انہیں ایسے کورسز کامیاب کرنے پر انکریمنٹ (Increment) ملنی چاہیے۔

۱۵۔ نوکری حاصل کرنے والے امیدواروں کا ذریعہ تعلیم اگر اردو رہا ہو تو زبان کی بنیاد پر اس کے مدِ مقابل کو ترجیح نہیں ملنی چاہیے۔

۱۶۔ دفتروں میں اردو میں کام کرنے کو ترجیح دی جائے اور اس کو عملانے کے لیے اسمبلی ممبروں کی ایک کمیٹی تشکیل ہو جو ہر دفتر میں جا کر ان اقدامات کو عمل میں لائے جانے کی سالانہ جانچ پڑتال کرے اور اس کی رپورٹ ریاستی سرکار کو پیش کرے۔

۱۷۔ عدالتوں اور ریونیو دفتروں میں اردو میں پورا کام کیا جانا چاہیے اور نستعلیق رسم الخط کا استعمال ہو جو ہر ایک کی سمجھ میں آسکے تاکہ آگے جا کر وہ بھی ان محکموں میں نوکری پانے کے اہل بن جائیں۔

۱۸۔ آئندہ دفتروں میں ٹائپسٹوں اور سٹینوگرافرس کی تقرری کے لیے اُردو ٹائپ اور سافٹ ویئر کی جانکاری لازمی قرار دی جائے۔

۱۹۔ جے اینڈ کے پبلک سروس کے امتحانات میں اُردو زبان کے استعمال پر زور دیا جانا چاہیے۔ کے اے ایس، کے پی ایس وغیرہ امتحانات کے لیے اردو کا اختیاری مضمون پاس کرنا ضروری ہونا چاہیے۔

۲۰۔ ریاست میں سبھی دفاتر، سکولوں اور کالجوں وغیرہ کے سائن بورڈ، نوٹس بورڈ، ربر مہریں وغیرہ انگریزی کے علاوہ اردو میں بھی ہونی چاہئیں۔ اسی طرح شاہراہوں، عمارتوں اور پبلک جگہوں پر نوٹس بورڈ وغیرہ سبھی اردو میں لکھے جانے ضروری قرار دیے جائیں اور اس کام کی عمل آوری کے لیے متعلقہ محکمہ جوابدہ ہونا چاہیے۔

۲۱۔ ریاست میں جتنے بھی کمپیوٹر فروخت ہوں، خصوصاً جن کے خریدار مرکزی یا ریاستی سرکاری دفاتر ہوں ان میں پہلے سے بھرا ہوا اردو سافٹ ویئر (Preloaded Urdu Software) ہونا چاہیے۔

۲۲۔ ریاستی ای۔ گورننس کے تحت انٹرنیٹ پر جو زور دیا جا رہا ہے اس میں اردو کا خاصا عمل دخل ہونا

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

چاہیے۔

۲۳۔ ٹیلی ویژن پر اردو چینلز کو دکھانا لازمی قرار دیا جائے۔ ڈی ڈی (اردو)، ای ٹی وی (اردو) وغیرہ کو ایسے بینڈ پر رکھا جائے تاکہ ہر ٹی وی سیٹ پر دیکھے جاسکیں۔

۲۴۔ ریاستی سرکار کے جملہ دفاتر میں اردو کی ترویج کے لیے فائلوں میں اردو میں نوٹس لکھنا، کاغذات کو نپٹانا اور احکامات جاری کرنے کو ترجیح دی جانی چاہیے جس کے لیے انعامی سکیمیں شروع کی جاسکتی ہیں۔

۲۵۔ سرکاری دفاتر میں غیر اردو داں طبقے کو اردو سیکھنے اور اردو میں دفتری کام کرنے کے لیے ترغیبات (Incentives) مہیا ہونی چاہئیں۔

۲۶۔ ریاست کی جانب سے جتنے بھی اشتعارات ایشوع ہوں، وہ سب اردو میں ہوں اور ایسا اگر ممکن نہیں ہو تو اُردو انگریزی دونوں زبانوں میں ہوں۔

تجاویز تو اور بھی بہت ساری ہیں مگر میں سمجھتا ہوں کہ پہلے مندرجہ بالا جہات کی جانب چند قدم آگے بڑھائے جائیں پھر راستے اپنے آپ کھل جائیں گے۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

بشری درد و کرب کا عکاس

ــــــ پُشکر ناتھ

پریم ناتھ پردیسی کے بعد اگر کسی کشمیری افسانہ نگار کو ملک کے طول و عرض میں مقبولیت حاصل ہوئی، وہ ہیں پشکر ناتھ۔ ان کے افسانے ماہنامہ بیسویں صدی کے علاوہ ہندو پاک کے کئی اہم رسالوں کی زینت بنتے رہے۔ پُشکر ناتھ تکو ۳۱ مئی ۱۹۳۴ء کو سرینگر میں ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے انہیں زندگی کے سرد و گرم کا سامنا کرنا پڑا۔ سرکاری ملازمت کے باوجود پُشکر ناتھ نے سفید پوش شہری کی زندگی بسر کرنے پر اکتفا کیا جس کی بازگشت ان کی کہانی 'میری گلی کا کتا' میں سنائی دیتی ہے۔ جنوری ۱۹۵۳ء میں ان کا پہلا افسانہ ماہنامہ بیسویں صدی میں شائع ہوا۔ پشکر ناتھ نے نہ صرف افسانے بلکہ ڈرامے بھی تحریر کیے اور وقتاً فوقتاً ریڈیو نشریات میں بھی حصہ لیتے رہے۔ ان کے تقریباً ساٹھ ستر ڈرامے آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہوئے جنہیں کافی مقبولیت حاصل ہوئی یہاں تک کہ ان کے ریڈیائی ڈرامے 'ساون جلے، بھادوں جلے' کو کل ہند مقابلے میں پہلا انعام مل گیا۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'اندھیرے اجالے' ۱۹۶۱ء میں اور دوسرا مجموعہ 'ڈل کے باسی' ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا جن کو ریاستی کلچرل اکادمی نے انعامات سے نوازا۔ تیسرا اور چوتھا مجموعہ 'عشق کا چاند اندھیرا' اور 'کانچ کی دنیا' بالترتیب ۱۹۸۱ء اور ۱۹۸۴ء میں منظر عام پر آئے۔ تیسرا مجموعہ دوبارہ 'سات رنگ کا سپنا' عنوان کے تحت ۱۹۹۳ء میں شائع ہوا۔ ان کے کئی افسانوں

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

نے کافی مقبولیت حاصل کی جیسے موت کے سوداگر، پردہ نشین، ڈل کے باسی، آس نراس، گلوان، گالی، نیلے امبر تلے، ابابیل (۱۹۶۵ء کی جنگ کے پسِ منظر میں لکھی گئی کہانی)، شہرِ بے چراغ اور درد کا مارا۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں تکنیک اور اسلوب کے کئی کامیاب تجربے بھی کیے۔ رام دتہ چاڑک کو موصوف پر ریسرچ مقالہ بعنوان 'پشکر ناتھ۔ حیات اور کارنامے' قلم بند کرنے کے لیے جموں یونیورسٹی نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی۔

پشکر ناتھ شیشے کی طرح شفاف، اور برگِ گل کی طرح نازک شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی صاف گوئی اور زود حسی ان کے افسانوں میں جا بجا نظر آتی ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے اکثر اپنے سماج کو آئینہ دکھانے کی کامیاب کوشش کی۔ جہیز، گھریلو تشدد، مہنگائی، دولت سے پیدا شدہ طبقاتی تفاوت، سیاسی استحصال، غنڈہ گردی، لوٹ کھسوٹ، اقدار کا بحران، حق تلفی، کنبہ پروری اور ماحول کی کثافت ان کے چہیتے موضوع ہیں۔ انہیں غریب پسماندہ انسانوں سے انتہائی ہمدردی ہے اور اکثر اسی طبقے کے درد و کرب کو اپنے افسانوں میں اجاگر کرتے ہیں۔ یہاں پر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس غریب پروری کے باوجود وہ ترقی پسندی کے نرغے میں نہیں پھنسے اور تمام عمر نعرہ بازی سے مکمل احتراز کرتے رہے۔ بہر حال حساسیت اور جذباتیت کی شدت نے انہیں قنوطیت سے ہم کنار کیا۔ چنانچہ ان کے اکثر افسانوں میں طوفانوں، مہیب اندھیروں، گھنگھور گھٹاؤں، کالی لمبی بھیانک راتوں، چیلوں، گِدھوں اور موت کے خوفناک سایوں کا ذکر ملتا ہے۔ کشمیر اور کشمیریوں سے پشکر ناتھ کو خاص لگاؤ ہے۔ ان کے افسانوں میں ان کا ذکر جا بجا ملتا ہے۔ 'درد کا مارا' اور 'پُل نمبر صفر کے گدھ' اسی پسِ منظر میں لکھے گئے فکر انگیز افسانے ہیں۔ اپنی حقیقی اور ادبی شخصیت کا تقابل کرتے ہوئے افسانہ نگار فرماتے ہیں:

> ''کبھی میں ان دو شخصیتوں کو ساتھ ساتھ کھڑا کر کے دیکھتا ہوں تو ایک کو کمزور سا، دبا دبا سا، ان گنت اندیشوں اور ذمہ داریوں میں گھرا ہوا پاتا ہوں اور دوسرے کو پارے کی طرح بے قرار سا، کچھ کھوجتا ہوا سا اور زندگی کی حرارت سے معمور پاتا ہوں اور دیکھتے دیکھتے مجھے اس تیسری شخصیت کا خیال آتا ہے جس کا تعارف میں کسی سے نہیں کرا سکتا۔ وہ شخصیت ہے اس پشکر ناتھ کی جو ان دونوں کے درمیان ایک پل کی طرح کھڑا ہے اور دونوں میں توازن قائم رکھتا ہے۔''

ظاہر ہے کہ پشکر ناتھ دورِ جدید میں فعال رہے اس لیے ان کے اسلوب پر جدیدیت کی چھاپ ہونا

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

لازمی ہے۔البتہ پریم چند کی حقیقت پسندی اور کرشن چندر کی رومانوی واقعیت پسندی سے یکسر گریز کرنا ان کے لیے ناممکن تھا۔ان کے افسانوں میں بھی سود خور قبائل، غریب سکول ماسٹر، دیانت دار چوکیدار، مویشی چرانے والے گُجر، برتن صاف کرنے والی، سبزی بیچنے والی اور استری کرنے والی استحصال زدہ عورتیں ملتی ہیں۔پُشکر ناتھ معاشرے کی دکھتی رگ پر اپنا ہاتھ رکھنا کبھی نہیں بھولتے۔وہ اعلا طبقے کی بدعنوانیوں پر بارہا تیکھا طنز کرتے ہیں۔ان کے یہاں بھی دلگداز منظر نگاری ملتی ہے۔

بہر طور وہ ایسے یُگ میں لکھتے رہے جس سے قبل مغربی لٹریچر میں کئی تجربات کیے گئے اور ان کا اثر چھن چھن کر ہندستانی ادب پر پڑ گیا۔پُشکر ناتھ طے شدہ پلاٹ لے کر افسانے کا آغاز نہیں کرتے۔ان کے افسانے زماں و مکاں کی غیر ضروری حد بندیوں سے آزاد ہیں۔کردار گوشت پوست کے پُتلے ہیں جو مثبت اور منفی دونوں خصوصیات کے مالک ہیں۔وہ اکثر صیغہء واحد متکلم کا استعمال کرتے ہیں اور اپنے افسانوں کو علامتوں اور استعاروں سے مزیّن کرتے ہیں لیکن اس حد تک نہیں کہ افسانہ مبہم بن جائے یا پھر اس میں ترسیل کا المیہ پیدا ہو۔دیکھا جائے تو ان کا اسلوب روسی رائیٹر چیخوف کے بہت قریب ہے۔اپنے زمانے کی روش کو دیکھ کر پُشکر ناتھ نے اظہاریت کو خاص طور سے اپنایا جو آگے چل کر سریلزم کی شکل اختیار کر گیا۔ان کی کہانی 'شہر بے چراغ' سریلزم کی عمدہ مثال ہے۔اپنے فن کے بارے میں پشکر ناتھ یوں رقم طراز ہیں:

> ''فن اپنا صلہ آپ ہے۔یہ انسان کے دل میں محبت کے دیئے روشن کر دیتا ہے۔اور دماغ میں خود آگہی کی قندیلیں.....میرے لیے افسانہ نگاری ایک ریاضت ہے اور اس ریاضت کا ایک ہی مقصد ہے.....ایک بہتر انسان، ایک بہتر زندگی اور ایک بہتر دنیا۔اس بہتر زندگی کا تصور اس قدر خوبصورت ہے کہ افسانہ نگار یا شاعر یا مصور انسان کو کبھی رنگ اور نسل، زبان اور مذہب، اپنے اور پرائے کے الگ الگ خانوں میں بٹا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔اس کو انسان صرف انسان نظر آتا ہے۔خوبصورت، محبت کرنے والا، سورج مکھی کی طرح ہنس مکھ اور چاند کی طرح اجلا.....میں بحیثیت انسان اور بحیثیت افسانہ نگار اسی انسان کا متلاشی ہوں۔اور اسی کے لیے افسانے لکھتا ہوں۔''

'عشق کا چاند اندھیرا' میں تیرہ افسانے شامل ہیں۔پہلا افسانہ 'عشق کا چاند اندھیرا' ایک ایسے سود خور قبیلے کی لڑکی گومتی کی داستان ہے جو دولت کی چمک دمک کو نامنظور کر کے اپنے پیار کی خاطر خودکشی کرتی ہے۔'رقص، پاؤں، زنجیر' میں حساس قلمکار ایک مخلص توتے کی موت میں اپنی موت کا عکس ڈھونڈتا ہے۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

'وحشت ہی سہی' میں مس شیرین اپنے انضباط پسند ایمپلائیر مسٹر وکیل کے قریب آنے کے لیے طرح طرح کے بہانے بناتی ہے اور آخر کار اس کو اپنے شیشے میں اتارنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ 'ایک بوند زہر' ماحول میں بڑھ رہی آلودگی پر لکھا گیا ہے۔ 'طوفان اور چائے کی پیالی' میں طبقاتی سوچ اور مجبوریوں کو محور بنایا گیا ہے جبکہ کوئی بھی شخص اپنے ضمیر کی آواز سننے کو تیار نہیں ہے۔ 'میری گلی کا کتا' پسِ آزادی ملک میں رہنے والے ایک باضمیر انسان کا کرب درشاتا ہے اور بہت ممکن ہے کہ اس کہانی میں افسانہ نگار کی نجی زندگی بھی سما گئی ہو۔ 'بدصورت گلدان' ریسرچ سکالر سونا کی کہانی ہے جو تحقیق کی آڑ میں کئی لوگوں سے محبت کا سوانگ رچ کر ان کا دل توڑتی ہے لیکن تھیسز کے نامنظور ہونے کی شکل میں قدرت اسے بدلہ لیتی ہے۔ 'سات رنگ کا سپنا' میں جہاں امیری اور غریبی کا موازنہ کیا گیا ہے وہیں یہ بات بھی واضح کی گئی ہے کہ ہم نے آنے والی نسل سے ان کے سپنے چھین لیے ہیں۔ 'رات اکیلی ہے' اسپتال میں زیرِ علاج دو مریضوں کی کہانی ہے جنہیں ایک دوسرے کے ساتھ اتنی ہمدردی ہو جاتی ہے کہ رکھشا آپریشن کے لیے جاتے وقت ڈاکٹر سے تاکید کرتی ہے کہ وہ اس بات کی خبر دوسرے مریض کو نہ دے کیونکہ اسے خدشہ ہے کہ کہیں اس طرح دوسرے مریض کی حالت مزید نہ بگڑ جائے۔ 'جوڑا ابا بیلوں کا' کہانی ہے ایک لڑکی کی جس کو جہیز کی معقول رقم نہ ہونے کے باعث اپنی شادی بار بار ملتوی کرنا پڑتی ہے۔ 'دوسری منزل' عشق کی فراموشی اور پرائشچت کی کہانی ہے۔ 'رکھیل' میں راوی اپنے مکان مالکن کی بیٹی پر فریفتہ ہو جاتا ہے مگر وہ اسے رکھیل کا درجہ دے کر اپنے کتے سے کم درجہ سمجھتی ہے۔ 'بہکی ہوئی خوشبو' بھی ایک عشقیہ کہانی ہے جس میں آمنے سامنے محبت کا اظہار نہیں ہو پاتا مگر بالواسطہ طور اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے۔

'کانچ کی دنیا' میں سترہ افسانے شامل ہیں۔ پہلے افسانے 'رازِ دل' میں ایک سنیاسی بیوہ چندر مکھی آخر کار دل کے ہاتھوں مات کھاتی ہے لیکن اپنی مریادا قائم رکھنے کے لیے موت کے آغوش میں شرن لیتی ہے۔ 'غبارے کی واپسی' میں ایک بچہ اپنی مفلسی کی وجہ سے اسی کسمپرسی کا شکار ہو جاتا ہے جس میں سالہا سال پہلے ایک اور بچہ مبتلا ہوا تھا۔ 'اکیلی راہ کا مسافر' میں ایک فلرٹ لڑکی آخر کار ایک انجان آدمی سے اس لیے شادی کرتی ہے کیوں کہ بقول اس کے وہ صرف ایسے آدمی کے ساتھ خوش رہ سکتی ہے جس کو اس کے بارے میں کوئی علم نہ ہو۔ 'شہر بے چراغ' میں افسانہ نگار کا تحت الشعور اپنے ردِعمل کا اظہار کرتا ہے۔ راوی کو یہ احساس کچوکتا ہے کہ اس کا ماحول تاریکیوں میں ملفوف ہو رہا ہے اور انسانیت تباہی کی جانب گامزن ہے۔ مزید انسان خود غرضی کا پتلا بنتا جا رہا ہے اور اپنی غرض کے لیے اپنے خون کو بھی فراموش کر دیتا ہے۔ وہ پھر کسی نوحؑ

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

کی کشتی کا متمنی ہے۔ 'ٹراؤٹ مچھلی' میں مسٹر ہیگ ایک معصوم لڑکی کی عزت لوٹتا ہے جبکہ نئی تہذیب کی پروردہ اس کی ماں جان بوجھ کر دوسری طرف دیکھتی ہے۔ 'اُبال' میں طبقاتی تفاوت پر زور دیا گیا ہے جب کہ 'تیرا آنچل میرا دامن' میں ڈاکٹر گنگولی اس لیے شانو کو نہیں پا سکتا ہے کیونکہ شانو کا باپ گاؤں کی عزت بچانے کے لیے فتو پہلوان کو جیت کی صورت میں شانو کا ہاتھ دینے کا وعدہ کرتا ہے۔ قسمت کی ستم ظریفی یہ کہ شانو نہ فتو کو ملتی ہے اور نہ ہی ڈاکٹر کو۔ افسانہ 'نوری بھی، ناری بھی' ایک ایسے فن کار کے تاثرات ہیں جو دنیا کی ہر شئے کو نقلی پاتا ہے۔ 'برکھا برسے ساری رات' میں ریکھا عشق کی رقابت کے سبب اپنی بہن رکھشا کو کھائی میں گرا کر مار دیتی ہے۔ افسانہ 'مداوا' میں اِستری کرنے والی چمپا کلی کی بیٹی ڈرائی کلینر کے لونڈے کے ساتھ بھاگ جاتی ہے جس پر وہ بظاہر روتی ہے مگر بباطن اطمینان کی سانس لیتی ہے کہ چلو سر سے بوجھ تو اتر گیا۔ 'شہ رگ سے دور' میں یہ باور کیا گیا ہے کہ جاگیر دار اپنی رنگ رلیوں کی خاطر اپنی رعایا کا کیسے استحصال کرتے ہیں۔ 'دل کی بستی' ان پڑھ، جاہل اور بیک ورڈ جانکی دیوی کی کہانی ہے، جو یہ جان کر بھی کہ اس کا شوہر دوسری شادی کرنے والا ہے، اس کے خلاف درخواست پر دستخط کرنے سے انکار کرتی ہے۔ پتی ورتا کی ایسی کئی مثالیں ہمارے سماج میں ملتی ہیں۔ 'لوٹ آئے میرے سر بُلند' میں سریلزم کی تکنیک اپنائی گئی ہے کہ ایک لڑکی خواب میں چند نام نہاد دانشوروں سے سنتی ہے کہ ایک شہنشاہ اپنی بیٹی کی شادی ایسے آدمی سے کرنے والا ہے جس کی صورت وہ صبح سویرے دیکھے گا۔ یہ بات اس کے لاشعور میں گھر کر چکی ہے کہ ہر باپ اپنی بیٹی کو بوجھ سمجھتا ہے۔ افسانہ 'درد کا مارا' حقیقت کے بہت قریب ہے جس میں کشمیری دکاندار صمد جو ایک سیاح لڑکی کی چھٹپٹاہٹ کو محسوس کر کے قالین کی قیمت اتنی کم کر دیتا ہے کہ اس سودا میں نفع کی کوئی امید نہیں رہتی۔ بدلے میں وہ ناشکری لڑکی اسے دھوکے باز سمجھ کر مزید قیمت گھٹانے کے لیے کہتی ہے۔ دراصل اس افسانے میں اس بات پر زور دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ کشمیری تاجروں نے برسوں کے غلط رویے سے اپنی ساکھ کھوئی ہے اور اب ان کی نیک نیتی پر بھی سوال اٹھائے جاتے ہیں۔ 'پُل نمبر صفر کے گدھ' میں ہمارے کلچر میں تیزی سے آرہی تبدیلی پر سوال اٹھائے گئے ہیں کہ ہر انسان گدھ بننے کی کوشش کر رہا ہے۔ 'بے خواب دریچے' میں راوی کو ایک چڑیا کی موت کا شدید احساس ہوتا ہے لیکن جانکی کی محبت کا احساس نہیں ہوتا۔ 'کانچ کی دنیا' میں مادھوی کو جونہی دولت کی دنیا کی بے ثباتی کا ادراک ہو جاتا ہے، وہ واپس اپنے کمپاؤنڈر محبوب کے پاس چلی جاتی ہے۔

جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے پُشکر ناتھ جا بجا اپنے معاشرے میں بڑھ رہے ناسوروں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ایسا کرتے وقت وہ نکتہ رس اور دقیق طنز کا بھی استعمال کرتے ہیں۔ چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں:

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

''دھندا تو بہر حال اب بھی وہی ہے صرف شکل بدل گئی ہے۔ آزادی کے بعد جس طرح ساری چیزوں اور دھندوں کی شکلیں بدل گئی ہیں۔ پہلے ڈاکو چنبل کی گھاٹیوں میں رہا کرتے تھے، اب ڈاکو نئے چہرے اور نئی پوشاکیں پہن کر تاج انٹر کانٹی نٹل یا اوبرائے شیراٹن کے شیش محلوں میں رہتے ہیں اور وہی دھندہ کرتے ہیں۔ پہلے ٹھگ بنارس کی گلیوں میں گھومتے پھرتے تھے اور راہ گیروں کا گلا دبا کر مال اُڑا کر لے جاتے تھے۔ اب ٹھگ بڑی بڑی جاذب نظر دکانوں میں فوم ربر کے گدیلوں پر بیٹھتے ہیں اور ہر آنے جانے والے راہ گیر کا گلا دبا کر اسی طرح مال اُڑا کر لے جاتے ہیں۔ پہلے حاکم محکوم کے کندھے سے چادر یا کھیس اتار کر نئی پیشی کی تاریخ بتا دیتے تھے۔ اب حاکم سفید کھدر کی پوشاکیں پہن کر دیسی انجینئر کی بنائی ہوئی چودہ منزلہ بلڈنگ کی بلندی سے ان گنت لوگوں کے کپڑے اتار کر نئے وعدے دیتے ہیں، پیٹ کی روٹی چھین کر نئے نعرے دیتے ہیں، گود کا بچہ چھین کر یا بچہ کی تعلیم چھین کر یا پیشانی پر دمکتی ہوئی عزت کی بندیا چھین کر، یا آنکھوں میں بسی مروت کی مشعل چھین کر، یا دل میں بسے ہوئے درد کا مزاج چھین کر، یا دماغ میں چھپی ہوئی ایمان کی قندیل چھین کر دو سانسوں کا عطیہ بخش دیتے ہیں۔''

(عشق کا چاند اندھیرا، ص ۱۵)

- ''تم نے سوچ سمجھ کر ترازو ہاتھ میں لے کر مجھ سے محبت کی ہے اور میں طرح طرح کے زہر کا مارا ہوا تمہاری اس چاہت کا زہر بھی پی جاؤں گا۔ قطرہ قطرہ بوند بوند جس طرح یوریا کھاد کا زہر نگلتا ہوں، ڈیزل کا زہر سونگھتا ہوں، ڈی ڈی ٹی کا زہر گھول کر پی جاتا ہوں۔

(ایک بوند زہر، ص ۵۹)

- ''اب زہر آنے میں دیر نہیں لگے گی۔ اللہ داد خاں مختلف پیکٹوں میں آئے گی۔ خوبصورت ڈبیوں میں آئے گی۔ رنگین لفافوں میں آئے گی۔'' (ایک بوند زہر، ص ۶۰)

- ''بیمار چہرے، پیلے چہرے، بدصورت چہرے، خوبصورت چہرے۔ ایک چہرہ اپنے گھر سے چند لمحوں کے لیے بھاگ آیا ہے کیوں کہ گھر میں دودھ والا بل چھوڑ گیا ہے۔ ایک چہرہ دفتر سے آکر ابھی گھر نہیں گیا ہے کیوں کہ اس کا منہ ہندوستانی افسر کی گالیاں کھا کر ابھی تک بدمزہ ہے۔ ایک چہرہ گھر سے بچے کے لیے نیکر خریدنے نکلا ہے اور یہاں آکر

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

بیٹھ گیا ہے کیوں کہ چائے کا کپ پندرہ پیسے میں ملتا ہے اور نیکر پانچ روپے میں۔ایک چہرہ اپنی بیوی کو پیٹ کے سیدھا یہاں آیا ہے اور بیٹھا اپنے ضمیر کو کوس رہا ہے۔''

(طوفان اور چائے کی پیالی ،ص۷۱)

''آج کل تو کم پڑھے لکھے لوگ دو دو ہاتھ سے دولت کماتے ہیں۔ بلکہ بہت ہی کم پڑھے لکھے لوگ تو منسٹر بن جاتے ہیں۔ میں نے دو دو ایم اے کیے ہیں، آنکھوں کی روشنی اور بھیجے کی گرمی کھودی، اور تب کہیں جا کر اسکول ماسٹر بن سکا۔اب تو سال دو سال سے ہیڈ ماسٹر بن گیا ہوں۔ وہ بھی بی ایڈ کرنے کے بعد، نہیں تو پنشن تک ماسٹر ہی رہتا۔''

(میری گلی کا کتا، ص۷۹۔۸۰)

''مہینے میں دس دن نلکے میں پانی نہیں آتا، لیکن فیس پورے مہینے کی لگتی ہے۔بجلی مہینے میں دس دن بند رہتی ہے مگر فیس پورے تیس دن کی لگتی ہے۔ سیمنٹ کی بوری کا وزن سات کلوگرام کم ہوتا ہے مگر دام پچاس کلوگرام کے لیے جاتے ہیں۔آٹے کی بوری میں چار کلوگرام ریت ملتی ہے مگر دام.....ٹرین سات گھنٹے لیٹ اسٹیشن پہنچتی ہے لیکن ٹکٹ کے دام جوں کے توں ہیں۔''

(شہر بے چراغ ،ص۴۰)

''کیسی تہذیب ہے یہ جس کا تصور بدیس سے آیا۔جس کی جڑیں ہوا میں جھول رہی ہیں۔ یہ کیسی تہذیب ہے، جو ایک ہاتھ میں شراب کا جام اور دوسرے ہاتھ میں جھنجھنا لے کر پیدا ہوئی ہے۔''

(ٹراؤٹ مچھلی ،ص۵۷)

''ناقص آٹا۔ناقص دالیں۔ناقص ڈبل روٹی۔ناقص وناسپتی۔اور پھر جب میں بیمار ہو گیا تو انہیں کمپنیوں میں تیار کی گئی دوائیاں میرا سہارا بن گئیں۔نقلی گلوکوز۔نقلی وٹامن بی، نقلی پنسلین، نقلی کلوروفنی کال۔پھر انہوں نے میرے خواب چھین لیے اور ایک نقلی تصور دے دیا۔نقلی تصویریں، نقلی اعداد و شمار، نقلی کھلونے، نقلی سکّے۔پھر انہوں نے میرا وجود چھین لیا۔اور میرے جسم میں نقلی دل فٹ کر دیا۔نقلی دماغ، نقلی شعور، نقلی گردے۔چنانچہ ایک دن مجھے اچانک یہ احساس ہوا کہ میری تمام تر اصلیت فنا ہو گئی ہے۔اور میں فقط ایک نقلی انسان رہ گیا ہوں۔''

(نوری بھی ، ناری بھی ، ص۸۲)

''میرے لیے یہ اطلاعات کوئی اچنبھے کی بات نہ تھیں، کیوں کی آج کل ہر شخص دو دو بلکہ

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

تین تین زندگیاں بیک وقت گزارنے پر مجبور ہے۔اسی لیے ایک پنواڑی بیک وقت پنواڑی بھی ہوتا ہے، اسمگلر بھی ہوتا ہے اور اپنے محلے کا پریزیڈنٹ بھی ہوتا ہے۔ یا ایک افسر بیک وقت افسر بھی ہوتا ہے اور کسی فرم یا کمپنی کا مالک بھی..... یا ایک سادھو بیک وقت مذہبی پیشوا بھی ہوتا ہے، بردہ فروش بھی ہوتا ہے اور جوئے خانے کا مالک بھی ہوتا ہے۔'' (کانچ کی دنیا، ص ۱۵۶)

افسانہ نگار نے کئی جگہ استعاروں اور علامتوں کا بڑی خوبی سے استعمال کیا ہے۔افسانہ 'میری گلی کا کتا' میں کتا اور اس کا بھونکنا، جو اشبھ مانا جاتا ہے، دونوں زندگی کی کشمکش اور اس سے مکتی پانے کی علامتیں ہیں۔ 'سات رنگ کا سپنا' کا بچہ انسانی ضمیر اور آنے والی نسل کا کنایہ ہے جو مہوت کھڑا صورتحال کا جائزہ لے رہا ہے۔افسانہ 'جوڑا ابابیلوں کا' میں ابابیلوں کو بطور محبت کا علامیہ استعمال کیا گیا ہے۔ 'غبارے کی واپسی' کا غبارا، 'شہرِ بے چراغ' کی کلائی کی گھڑی اور بن موتی کے سیپ، 'ٹراؤٹ مچھلی' کا ریچھ اور ٹراؤٹ مچھلی، سبھی علامتوں کے طور پر استعمال کیے جا چکے ہیں۔ 'رقص، پاؤں، زنجیر' میں بالک رام تو تا عام ہندوستانی کی علامت بن کر ہمارے سامنے آتا ہے جو اپنی ساری زندگی 'جے ہند' بولتا ہے مگر اس کی موت معاشرے کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ یہ افسانہ گو تیس برس پہلے لکھا جا چکا ہے پھر بھی آج کے حالات کو منعکس کرتا ہے۔ملاحظہ ہو ایک اقتباس:

''دروازہ کھلنے کی دیر تھی کہ تمام آوارہ آوازیں، تمام ادھ جلی روحیں، تمام ننگ دھڑنگ ہڈی پنجر اندر داخل ہو گئے۔اور پھر باہر کا طوفان اندر آ گیا اور اندر کا طوفان باہر آیا۔اور میں درمیاں میں ایک ادھ بجھی مشعل کی طرح کبھی جلتا رہا، کبھی بجھتا رہا۔''

کشمیر کے حوالے سے کئی افسانوں کی منظر نگاری ہمارے سامنے آتی ہے۔یہی منظر نگاری کرشن چندر کے افسانوں کی جان تھی اور قاری ان کے بیان سے سحر زدہ ہوتے تھے۔پشکر ناتھ بھی اپنے ماحول کا دقیقہ شناسی سے جائزہ لیتے ہیں اور قاری کے ذہن پر تصویریں کھینچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔چند مثالیں پیش خدمت ہیں:

''اسے ابابیلیں بہت اچھی لگتی ہیں۔اور بھی کچھ چیزیں اسے اچھی لگتی ہیں، جیسے برف کے مجسمے بنانا یا یخ بستہ برف کی گاجریں (icicles) کھانا۔برف سے ڈھکی ہوئی چھتوں سے جب پانی کی بوندیں رسنے لگتی ہیں تو یہ رستی ہوئی بوندیں تیز برفانی ہوا سے منجمد ہو جاتی ہیں۔صبح اٹھ کر دیکھیے تو چھت کے کنارے کنارے ان گنت گاجریں لٹکتی ہوئی نظر آتی

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ہیں۔ کرچ کرچ کر کے کھا جاتی ہے یہ گاجریں اور پھر پینسلین کے ٹیکے لگواتی ہے۔ کئی کئی دنوں تک بول بھی نہیں سکتی۔'' (جوڑا ابابیلوں کا، ص ۱۲۵۔۱۲۴)

''حالاں کہ ککرناگ سے ڈک سم جاتے جاتے گاڑی کی رفتار کم کرنی چاہیے، نہیں تو ان سر بلند دیار اور چیل کے درختوں کا لاابالی پن، جگہ جگہ اُگے ہوئے جنگلی پھولوں کی رنگا رنگی، قدم قدم پر بہتی ہوئی چھوٹی چھوٹی ندیوں کی مست خرامی دیکھنے میں نہیں آئے گی۔''

(ٹراؤٹ مچھلی، ص ۴۵)

''بنڈ پر صمد جو کی دکان اس زمانے سے تھی، جب موجودہ ایمپوریم کی شاندار عمارت میں انگریز ریذیڈنٹ رہا کرتا تھا اور شام کو انگریز مرد اور عورتیں بنڈ کی سیر کیا کرتے تھے اور سرینگر کلب میں رات گئے تک فوکس ٹراٹ اور والٹز کی دھنیں سنائی دیتی تھیں۔ اس زمانے میں بھی صمد اینڈ سنز، فرئیرس اینڈ ٹیکسی ڈرمسٹ کی دکان مشہور تھی اور انگریز عورتیں اس دکان میں سمور کے ملبوسات کے آرڈر بک پر بہت چاؤ کے ساتھ دستخط کیا کرتی تھیں۔ انگریز مرد تو صمد جو سے stuffed جانور اور پرندے بہت شوق سے خریدتے تھے۔ چیتے، بارہ سنگھے، مارخور اور طرح طرح کے پرندے ہو کر سر کی مُرغابیاں، ولر کے راج ہنس، ڈل جھیل کی رام چڑیا، مانسبل کی بطخیں۔ مردہ جانوروں کی کھالوں میں نیا جسم فِٹ کرنے کا فن صمد جو نے اپنے باپ رمضان جو سے سیکھا تھا۔'' (درد کا مارا، ص ۱۳۲۔۱۳۳)

''شہر بے چراغ'' میں افسانہ نویس نے کشمیر کے صوفی شیخ نورالدینؒ کے مشہور شعر کو نثری جامہ پہنایا ہے:

''کہا تھا میں نے، تب گندم اور چاول موتیوں کے بھاؤ بکیں گے۔ کہا تھا میں نے، تب مائیں اپنی بیٹیوں کے ہاتھ تھام کر بازار کا رُخ کریں گی۔ کہا تھا میں نے، تب سورج بہت پرے دھکیلا جائے گا اور ایک لمبی کالی بھیانک رات زمین کو نگل لے گی۔''

جہاں تک کردار نگاری کا تعلق ہے، پشکر ناتھ نے کئی جاندار کردار اردو ادب کو دیے ہیں۔ ان کرداروں کے بارے میں پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ہمارے اردگرد ہی کہیں پر رہتے ہیں اور ہم نے انہیں ضرور دیکھا ہے۔ 'بدصورت گلدان' کی ریسرچ اسکالر سونا بھاٹیہ، 'رات اکیلی ہے' کی مریض رکھشا، 'دل کی بستی' کی جانکی دیوی اور 'درد کا مارا' کا صمد جو چند اہم کرداروں کے نام ہیں۔ ان کے اکثر کردار اپنے

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ضمیر کی آواز سن کر یا ماحول سے متاثر ہو کر اپنے آپ کو بدل دیتے ہیں۔ پُشکر ناتھ افسانہ 'کانچ کی دنیا' کے کردار مادھوی کی پیکر نگاری یوں کرتے ہیں:

''اطلاع کے مطابق مادھوی ایک اسکول ماسٹرنی کی بیٹی تھی، نرسنگ ہوم میں بطور نرس کے کام کرتی تھی۔ اور پانچ بجے کے بعد اپنی اس زندگی کا لبادہ اُتار کے ایک دوسری زندگی کا ڈریس پہنتی تھی۔ یعنی مادھوی ایک ہی وقت میں دو زندگیاں گزارتی تھی۔ ایک غریب نرس کی، جس میں محبت کا پیکر بن کر مریضوں کے تپتے ماتھے پر اپنا شفقت کا ہاتھ رکھتی تھی، ان کے زخموں کی ٹیس کو، درد کی کربنا کی کو اپنی میٹھی، پیاری اور کومل مسکراہٹ میں نہلا دھلا کر ان کے لیے ایک پھاہا تیار کرتی تھی اور پانچ سو روپے ماہانہ تنخواہ پاتی تھی۔ اور ایک شوخ و شنگ تتلی کی زندگی، جس میں وہ بڑھیا اور جدید فیشن کے کپڑے پہن کر ہر شام ٹیکسی میں بیٹھ کر سن رائیز کلب میں آتی تھی اور فلیش کھیلتی تھی، ٹوسٹ کرتی تھی، بیئر پیتی تھی اور دو تین گھنٹے اپنا منورنجن کرنے کے بعد چلی جاتی تھی۔ اس گندے سے، ٹوٹے پھوٹے سے مکان میں، جہاں اس کی استانی ماں دن بھر کی تھکان سے چُور اس کا انتظار کرتی رہتی تھی۔''

(کانچ کی دنیا، ص ۱۵۶۔۱۵۵)

پشکر ناتھ کی زبان سادہ، سلیس اور عام فہم ہے۔ ان کے یہاں اردو اور ہندی کا سریلا سنگم ملتا ہے جبکہ مفرس اور معرب الفاظ سے انہوں نے پرہیز کیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کوئی جھرنا دل گداز راگ چھیڑتی ہوئی چلی جا رہی ہے۔ انہوں نے کہیں کہیں دوسری زبانوں کے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں جیسے ٹوہر (پنجابی، ص ۲۶)، مستک (ہندی، ص ۲۹)، ڈوکا (گوجری، ص ۵۷)۔ اس کے علاوہ افسانہ نگار نے icicles کے لیے خود ہی متبادل لفظ 'گاجر' اختراع کیا ہے چنانچہ وہ شفاف گاجروں سے مشتبہ ہیں۔ جدیدیت سے متاثر ہونے کے باوجود انہوں نے بیانیہ کو ترجیح دی ہے۔ اور اپنی بات قاری تک پہنچانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

پُشکر ناتھ چار دہائیوں تک قارئین کے دل و دماغ پر راج کرتے رہے اور پڑھنے والے بے صبری سے ان کے افسانوں کا انتظار کرتے رہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جس قدر و منزلت کے وہ حقدار تھے وہ ان کو نہ زندگی میں میسر ہوئی اور نہ مرنے کے بعد۔

❖ ❖ ❖

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

اساطیر کی جمالیات اور شکیل الرحمٰن

فنون لطیفہ اور اساطیر کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ ادب، خاص طور سے شاعری، میں تلمیحات، اساطیری علامیہ اور استعارات کا کثرت سے استعمال ہوتا رہا ہے۔ شکیل الرحمٰن نے، جن کا مخصوص موضوع جمالیات رہا ہے، مغربی و مشرقی ادب میں اساطیر کی جمالیات کی باریکی اور دقیقہ شناسی سے تحقیق کر کے اُردو ادب کو اس خوبصورت تحفے سے مالا مال کیا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ اُردو ادب میں آئے دن شعری مجموعے، افسانوی مجموعے اور غالب و اقبال پر تنقیدی کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں جبکہ جمالیات اور اس جیسے موضوعات پر کوئی خامہ فرسائی نہیں کرتا۔ اسطور سازی انسانی جبلت کی پیداوار ہے جس کو بے ثباتی کے خوف، احساس گناہ اور مذہبی سرزنش نے پروان چڑھایا ہے۔ چونکہ انسانی اعتقاد ارواح پرستی (Animism) اور مظاہر پرستی (Animatism) سے ہوتا ہوا کثرت پرستی (Polytheism) اور وحدانیت (Monotheism) کی طرف بڑھتا گیا، اس لیے اسطوری تجربے بھی وقت کے ساتھ بدلتے رہے۔ اصلی صورت، آرکی ٹائپ (Archetype)، سائیکی (Psyche) اشکال (Images)، ذاتی اور اجتماعی شعور میں بھی تبدیلیاں آتی رہیں۔ دھیرے دھیرے توتمیت Totemism، فینتاسی (Fantasy)، مخصوص دیوی دیوتاؤں کی پرستش اور عفریتوں کا تصور بھی رونما ہوا۔ دیوی دیوتاؤں کی ایک الگ دنیا بس گئی جس میں وہی جذبات جیسے عشق، غصہ، اور بدلے کی بھاونا کارفرما تھے جو انسان میں نظر آتے ہیں۔ ان جذبات کے تحت

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

قتل وغارت اور سلطنتوں کا تاخت وتاراج وقوع پذیر ہوا۔ بقول مصنف ''اساطیر فنون لطیفہ کی سب سے قدیم پر اسرار متحرک روایت ہے۔ انسان کے نسلی لاشعور (Collective unconsciousness) میں شامل پگھلی ہوئی سرسراتی ہوئی روایت، رقص، مجسمہ سازی، مصوری اور لٹریچر کی اس قدیم پُر اسرار روایت نے عمدہ اور عمدہ ترین تخلیقات عطا کی ہے۔ لیجینڈ، لوک کہانی اور خالص متھ تینوں اساطیر کی تشکیل میں شامل ہیں۔ تمثیل (Allegory) نے اساطیر کے ارتقاء میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اشیاء وعناصر کو شخصیتیں عطا کی ہیں، ان میں تحریک پیدا کی ہے۔ واقعات وکردار کو اجتماعی فینتاسی (Collective Phantasy) کی صورت عطا کرنے میں تمثیل ہمیشہ پیش پیش رہی ہے۔''

پروفیسر شکیل الرحمٰن نے یونانی اور رومن اساطیر پر کھُل کر بحث کی ہے کیونکہ ان کے بارے میں بہت سارا لٹریچر ہم تک پہنچ گیا ہے۔ مثلاً الیڈ اور اوڈیسی، یونانی المیے اور طربیے وغیرہ۔ موصوف نے ان کا تجزیہ کیا ہے اور کئی نتائج برآمد کیے ہیں۔ جیسے 'پرسی فون' بلاشبہ لاشعور کی علامت ہے، 'میڈاس' دنیاوی آرام وسکون کا اشارہ ہے۔ ان اساطیری کرداروں میں مختلف رَس ملتے ہیں جیسے ادبھت رس، رُدررس، ویررس، کُرن رس وغیرہ۔ بقول مصنف: ''تمام اساطیری پیکر اور کردار انسان کے شعور اور لاشعور اور اس کے وژن کی توسیع ہیں۔ متھ (Myth) انسان کی نفسیات کے حیرت انگیز کرشمے ہیں۔'' مصری اساطیر میں بھی معبودوں کی الگ دنیا نظر آتی ہے جیسے ری، امون، ٹہا (Ptah)، ختم، اُٹم، ہتھور، ہورس، اوسیریس وغیرہ۔ ان کو ہیروگلفی (Hieroglyphy) کے ذریعے بھی درشایا گیا ہے۔ ان کے یہاں سنجیدگی بھی ہے اور جمالیاتی رجحان کے ساتھ اخلاقی رجحان بھی۔ یہاں بادشاہ خدا کا چنندہ ہے اور معاشرے میں راہبوں کی بڑی اہمیت ہے۔ مندر اور منتر مقبول عام ہو چکے تھے۔ ان معبودوں کے ساتھ بہت ساری کہانیاں منسوب کی جا چکی ہیں۔ بقول شکیل الرحمٰن ''اساطیر کی فینتاسی میں تین جہتیں اہمیت رکھتی ہیں۔ پہلی جہت میں فوق الفطری عناصر سے روحانی سطح پر رابطہ، اسے مسٹی کل (Mystical) جہت کہہ سکتے ہیں، دوسری جہت میں فطرت اور انسان کے تعلق سے جادوئی ہے، نیچر اور انسان کا سحر انگیز رشتہ اور تیسری جہت انسانی کی بدنصیبی اور کمزوری کو نمایاں کرتی ہے۔'' مصر میں پتھر کے ٹکڑوں اور مٹی کی تختیوں پر لکھنے کا عمل شروع ہوا تھا جو بعد میں پیپی رَس (Papyrus) کی شکل اختیار کر گیا۔ انہیں پر 'مردوں کی کتاب' (The Book of Dead) تحریر کی گئی تھی۔ ۴۸ ق م میں مصر کے اسکندریہ میں سکندر کی فوجوں نے سب سے بڑی لائبریری نذرِ آتش کر دی تھی۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

عہد نامہ عتیق اور عہد نامہ جدید فکر ونظر کا ایک بڑا سرچشمہ رہا ہے۔ جس میں زبانوں کے لٹریچر میں بھی اساطیری تخلیق کاری کے بیشتر نمونے ملتے ہیں۔ ہومر، اوِوڈ، ملٹن، براونگ، ہاتھورن، ہیرک، لانگ فیلو، میریڈتھ، ولیم مورس، پوپ، سوئن برن، ٹینی سن، بائرن، شیکسپئر، مشیلے اور کیٹس اس میدان میں چند اہم نام ہیں۔ کیٹس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس کی روح یونانی اساطیر میں ڈوبی ہوئی تھی۔ دانتے کی ڈیوائن کامیڈی۔ انفرنو بھی اساطیری فنکاری کا نادر نمونہ ہے۔

چینی اساطیر تاؤازم، کنفیوشنزم اور بدھ ازم سے متاثر ہوا ہے۔ انڈے سے دنیا کا پیدا ہونا ہند اور دوسرے کئی ممالک کی کہانیوں سے میل کھاتا ہے۔ بقول شکیل الرحمٰن ''چینی اساطیر اور خصوصاً بدھ اساطیر میں علامتوں اور کہانیوں کے ذریعہ لاشعور کی توانائی اور اس کے تحرک کا جو احساس ملتا ہے وہ ایشیائی ملکوں میں اپنی مثال آپ ہے۔ بُدھ مت کی کہانی کہ ایک ضرورت مند بندر کو اس کا دوست گھڑیال دریا پار کرا کے دوسرے کنارے تک بخوبی پہنچا دیتا ہے، بُدھ مت کے اصولوں کا پرتو ہے کہ ہر مخلوق میں کہیں نہ کہیں اچھائی چھپی ہوئی ہے۔ یہ ہندومت کا اثر تھا کہ بودھوں نے بھی پہلے یاکشی اور یاکشنی کے بت بنانے شروع کیے اور پھر بودھی استوا اور آخر کار بھگوان بدھ کے بت بنائے۔

ہندوستانی اساطیر سمندر منتھن کی متھ پر سب سے زیادہ زور دیتی رہی۔ کئی دوسرے کلچروں میں بھی سمندر سے زندگی کی نمو ہونے کی کہانیاں ملتی ہیں۔ اسی طرح نوح کی کشتی کی مثال ہندوستانی اساطیر میں بھی ملتی ہے کہ ایک مچھلی انسان کو ایک بڑے طوفان کی آمد کی اطلاع دیتی ہے اور بچاؤ کے لیے کشتی تیار ہوتی ہے۔ ہندوستانی اساطیر میں برہما ویشنو اور مہیشور (شِو) کا بڑا یوگدان رہا ہے۔ دنیا کے پیدا ہونے کی کئی کہانیاں ان سے وابستہ ہیں۔ حالانکہ اصلی خالق برہما کو ہی تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان اساطیری کہانیوں کا خزانہ مختلف پران ہیں جیسے شو پران، لنگ پُران وغیرہ۔ یہاں دیوی دیوتاؤں کے جسم کے مختلف اعضاء کی بھی علامتی اہمیت کی اشارے ملتے ہیں۔ مثلاً شِو کے دس یا بارہ ہاتھ یا پھر سانپ اور ناگ ذاتِ لامحدود کا علامیہ ہیں۔ کھوپڑی تمام مادی خواہشات سے اوپر اٹھنے کا اشارہ ہے۔ اسی طرح شِو لنگ اور نٹ راج ہندوستانی اسطور کی عظیم علامتیں ہیں۔ نٹ راج سے ۱۰۸ کیفیتوں میں جو رس ملتے ہیں ان میں سے چند ایک یوں ہیں۔ شرنگار رس، رُدر رس، شانت رس، ادبھت رس وغیرہ۔ اس کے علاوہ یہاں اردھ ناریشور کا بھی تصور ملتا ہے جو نصف مرد اور نصف عورت ہے۔ خالق کی آنکھ (Eye of God) اور عظیم ماں (Great Mother) بھی ہندو اساطیر میں اہمیت رکھتے ہیں۔ 'کالی' ماں کا سول امیج یا حسی پیکر (Soul Image) ہے۔ درگا کا

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

تصور بھی ہندو اسطور میں عظیم ہے۔ اسی طرح کرشن بھی اہم لیجینڈ کی حیثیت رکھتے ہیں جنہوں نے شرمد بھگوت گیتا کے ذریعہ ہندوؤں کو جاگرت کیا۔ مصنف نے ایکلاویہ کی کہانی کو بھی بیان کیا ہے مگر شاید وہ اس حقیقت کی تہہ تک نہیں پہنچ پائے کہ ایکلویہ سے اُس کا انگوٹھا مانگنا ایک برہمن استاد کی چال تھی تاکہ ایک درجہ فہرست ذات/قبائلی کسی کھشتری کو چنوتی نہ دے سکے۔

عربی و وسط ایشیائی اساطیر تخلیق آدم سے قبل شروع ہوتی ہے جس میں جنت و جہنم، غول، جنات، کوہ قاف، عفریت، شق (نصف مرد اور نصف عورت) سطیح اور عفیر وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔ ان قصوں میں یہودی، عیسائی اور اسلامی کہانیوں کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ اسلام نے نہ صرف اس لیجینڈ کو آگے بڑھایا بلکہ فتوحات کے ساتھ مفتوع ممالک کا حصہ بھی بنایا۔ اسلامی اساطیر میں حضرت فاطمہؓ کی آنکھ اور ہاتھ کے بارے میں کہانیاں ملتی ہیں۔ اس کے برعکس ایرانی اساطیر کی اپنی تواریخ ہے جو بعد میں اسلامی اساطیر میں جذب ہوگئی۔ زرتشت (Zorastrian) اسطور میں شیطان کا تصور ملتا ہے جو آریائی قصے کہانیوں کے قریب ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی دیوی دیوتاؤں اور فرشتوں کا ذکر ملتا ہے جیسے متھرس، ویری تھراغنا (Veresthraghna)، سات فرشتے (Amesha spentes)، ٹرے ٹونا (Traetona) ازہی دہا کا (Azhidahaka)، کرے ساسپا (Kare saspa) وغیرہ۔ ژنداوستا (زرتشت کی پہلی مقدس کتاب) کے بعد ایرانی اساطیر کا بہت بڑا ذخیرہ شاہنامہ فردوس میں درج کیا گیا ہے۔

لٹریچر میں اساطیر کا عمل دخل کافی حد تک رہا ہے۔ پو، ہارڈی، ورجینا وولف، ولیم بلیک، ملٹن، شیکسپیر، دانتے، وائی پی بیٹس، ہرمین میلول، جیمز جوائس، ڈی ایچ لارنس وغیرہ کی تخلیقات میں اس کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔ مشرقی لوک کتھاؤں میں علاء دین کا چراغ، علی بابا چالیس چور، حضرت سلیمان اور جنات، پری بانو اور جادوگر، شرون کمار، ماہی گیر اور جن، سندباد جہازی، آب حیات اور خواجہ خضر، کیکاؤس، پورن بھگت، لاودل، ہیر رانجھا، سونی مہیوال، لیلیٰ مجنون، شیریں فرہاد اور مرزا صاحبان کے قصے کہانیاں ملتی ہیں۔ سنتھال اور دوسرے کئی قبائلی ذاتوں کی لوک کتھاؤں میں دنیا کے وجود پر کئی دلچسپ قصے ملتے ہیں۔ ان کتھاؤں میں علامتوں اور استعاروں کا خوب استعمال کیا گیا ہے۔

مشرقی اساطیر کے پس منظر میں شکیل الرحمٰن نے کبیر، نظیر اکبرآبادی، میر تقی میرؔ، مرزا غالبؔ، علامہ اقبالؔ، فراق گورکھپوری، اختر الایمان، میراجیؔ، راشدؔ، شفیق فاطمہ، ستیہ پال آنند اور عنبر بہرائچی وغیرہ کے کلام کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے اور ان علامتوں اور استعاروں کی نشاندہی کی ہے جن کا ان ادیبوں نے

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

بطور متھ استعمال کیا ہے۔ آخر میں مصنف نے ہندوستانی اساطیر اور اساطیری عناصر کے اردو زبان وادب پر اثرات کی نشاندہی بھی کی ہے۔

ڈاکٹر شکیل الرحمٰن نے اساطیر کے تناظر میں مختلف ممالک کی متھ اور لیجینڈ کا ارتقاء اور وہاں کے لٹریچر پر اس کا اثر جس خوبی سے پیش کیا ہے اس کی مثال اردو ادب میں بہت کم ملتی ہے۔ زیر نظر تصنیف نہ صرف لٹریچر کے طالب علم کو بلکہ عام قاری کو محظوظ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

❖ ❖ ❖

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

روپ جگاتا اِک بنجارا۔ سوہن راہی

''شعر کہنا میرا شغل ہی نہیں بلکہ میری زندگی کی عبادت ہے۔ شعروادب میری زندگی ہے۔ میرے گیت میرا اور ڑھنا بچھونا ہے۔''

سوہن راہی کے مندرجہ بالا الفاظ ان کی زندگی کے نصب العین کی عکاسی کرتے ہیں۔ اپنی دھرتی سے دور، سات سمندر پار جا بسے راہی اپنے وطن کی یاد میں نس دن خون کے آنسو بہا کر کوئل کوک، پپیہے کی بانی اور پیپل کی چھاؤں کے لیے ترستے ہیں۔

کوئل کوک پپیہا بانی ناپیپل کی چھاؤں
سات سمندر پار بسایا ہم نے ایسا گاؤں
ہمرا ایسا گاؤں
ایسا ہمرا گاؤں
رنگ برنگ لوگ یہاں پر، بولیں اپنی بولی
تن سونا ماٹی ہی کر کے بھریں پیٹ کی جھولی
خون پسینہ ایک کریں تو پل دو پل بسراؤں
ہمرا ایسا گاؤں
ایسا ہمرا گاؤں

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

جالندھر پنجاب کے گاؤں لساڑہ میں جنمے سوہن لال سینی نے زندگی کا ابتدائی حصہ پھگواڑہ کپورتھلہ میں گذارا اور وہیں پر تعلیم بھی حاصل کی۔ جنم پتری اور سکول کے اندراج کے مطابق ان کا جنم یا تو ۲۱ جون ۱۹۳۵ء ہے یا پھر ۱۷ دسمبر ۱۹۳۶ء۔ پرانے زمانے میں ہندوؤں میں عام رواج تھا کہ بچے کو جلدی سکول بھیجنے کے لیے اس کی عمر زیادہ لکھوائی جاتی تھی یا پھر اگر بچہ کسی غفلت کے سبب اپنی جماعت کی اوسط عمر سے تجاوز کرتا تو اس کی عمر کم لکھوائی جاتی تھی۔ اس لیے جنم پتری میں درج جنم دن کو ہی درست مانا جانا چاہیے۔ سوہن لال نے ڈرافٹس مین شپ کا ڈپلومہ حاصل کر کے آرکی ٹیکچر کو اپنا پیشہ بنایا اور ۱۹۷۱ء سے ۱۹۸۹ء تک پی بی سی میں سینئر آرکی ٹیکچرل اسسٹنٹ کے عہدے پر مامور رہے۔ علاوہ ازیں انہوں نے پنجابی اور اردو زبانوں میں بھی مہارت کی سندیں حاصل کر لیں۔

سوہن لال سینی نے اپنی ادبی زندگی کی شروعات ۱۹۵۰ء میں ایک گیت 'کیوں من میں آگ لگاتی ہو' سے کی۔ پریم وار برٹنی اور مولانا ماہر القادری سے فیض حاصل کرتے رہے اور ساتھ ہی سوہن راہی قلمی نام اختیار کر لیا۔ ۱۹۶۳ء میں ہجرت کر کے برطانیہ چلے گئے اور پھر وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ انہیں اردو، ہندی، پنجابی اور انگریزی زبانوں پر دسترس حاصل ہے اور اب تک آٹھ شعری مجموعے شائع کر چکے ہیں۔

اردو: 'زخموں کے آنگن'، 'گھونگھٹ کے پٹ'، 'دھوپ کی تختی'، 'زخم، گھونگھٹ، دھوپ'، 'کھڑکی بھر آسماں' 'کاغذ کا آئینہ' 'گیت ہمارے خواب'۔

ھندی: سُر ریکھا

مندرجہ بالا مجموعوں کے علاوہ اردو میں مزید دو مجموعے 'حرف حرف تیرا' اور 'تم کیسر ہم کیاری' ہندی میں 'آرتی بندھن' اور 'ساحل سیپ سمندر' پنجابی میں 'ککلی' اور انگریزی میں 'سکرول آف لائٹ' طباعت کے مرحلے سے گزر رہے ہیں۔ سوہن راہی کئی ادبی تنظیموں سے جڑے رہے، ٹی وی اور ریڈیو سے بھی وابستہ رہے اور کری ایشن میوزک لنک کمپنی کے بھی روح رواں رہے جہاں سے انہوں نے اپنا کیسٹ 'بن گناہ کے' ریلیز کیا۔ اسی غزل پر انہیں چینل فور ٹی وی لندن نے انعام سے بھی نوازا تھا۔ کئی ادبی تنظیموں نے اعزاز و اکرام سے بھی نوازا ہے۔

موجودہ منظر نامے کی وضاحت کرتے ہوئے سوہن راہی فرماتے ہیں:

''آج کے انسان کا مقدر بھوک، پیاس، ننگا پن اور اس سے بڑھ کر اس کی جہالت، اندھ وشواس، ایک زندگی سے نباہ، موت کے بعد زندگی کا سہانا تصور، مذہب اور امن عالم

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

کے نام پر معصوم اور مظلوم سادہ لوح انسانوں کا سیاسی قتل عام۔ اسی طرح روزمرہ کے قتل عام کو حق بجانب ٹھہرانے کے لیے قومی اور بین الاقوامی سطح پر قرار دادیں، ریزولیوشن ملکی اور غیر ملکی اداروں اور لیڈروں کا منہ بند کرنے کے لیے مالی اور دیگر امداد کے نوالے.....''

(مخزن 6۔ یوکے)

ظاہر ہے کہ سوہن راہی حساس دل کے مالک ہیں، غربت اور افلاس کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں اور دنیا میں امن و آشتی کے خواہاں ہیں۔ اس کی جھلک ان کی طویل نظم 'قتل گاہِ زندگی، اے قتل گاہِ زندگی' میں ملتی ہے جو انہوں نے ۲۰۰۲ء میں شروع کی تھی اور ۲۰۰۵ء میں مکمل کی۔ اس نظم کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں:۔

کس سے پوچھیں کیسے پائیں ہم سراغ آگہی
خون بہا کر ہو رہی ہے کس خدا کی بندگی
ظلمتوں کے غار میں تہذیب کی بے حرمتی
قتل گاہِ زندگی، اے قتل گاہِ زندگی

.....

آؤ مل کر پھر جلائیں آدمیت کے چراغ
آؤ مل کر پھر سے سوچیں
بھوکی پیاسی اور بے حس زندگی
وحشتوں کے ہاتھوں میں بے بس کھلونا کیوں بنی
پھول کی صورت میں جنمی تھی جو ماں کی گود میں
وہ نکیلے تیز کانٹوں کا بچھونا کیوں بنی

اپنے ماحول کا باریک بینی سے مشاہدہ کرنے اور ان احساسات کو اپنی غزلوں میں سمونے کے باعث سوہن راہی کی شاعری عصری تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔ ان کی شاعری میں ہجرت کی صعوبتیں، اپنی بچھڑی ہوئی دھرتی کا ناسٹلجیا اور موجودہ دور کی بے سمتی اور بے راہ روی بڑی شدت سے محسوس کی جاتی ہے۔ انہوں نے لفظوں کو نئے معنی پہنائے ہیں اور معاصر تناظر کے عین مطابق علامتیں، استعارے اور ترکیبیں اختراع کی ہیں۔ کہیں کہیں انہوں نے طنز سے بھی کام لیا ہے۔ سوہن راہی کی غزلوں کے چند نمائندہ اشعار درج ذیل ہیں:

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

عصری تناظر:

ہر ایک اشک میں لاکھوں کہانیاں راہیؔ
زمانے کتنے یہاں زیر آب ملتے ہیں

تشدد:

ہم آگ کی تہذیب سے مانوس ہیں ایسے
کیا جانیئے راہی کہ وہ گھر کس کا جلا ہے

ہر ایک جانب ہے میرے آگ ہی آگ
میں شعلوں سے گزر کر جی رہا ہوں

اب ہمارے باغ میں اترے گی ایسی بھی ہوا
پھول کو جو سر اٹھانے کی ذرا مہلت نہ دے

اندھیرے:

اندھیرے بٹ رہے تھے شہر کے ویران خیموں میں
اماوس کی میں اوڑھے رات اُٹھ کر گھر چلا آیا

ڈوبے ہوئے تھے راہیؔ اندھیرے میں بام و در
لوگوں نے روشنی کے لیے گھر جلا دیے

خوف:

میں طوفانوں کو اپنی ناؤ اکثر سونپ دیتا ہوں
سمندر کے کناروں سے مجھے اب خوف آتا ہے

میری زمیں، میرا فلک، میرے ستارے
راہیؔ مجھے لگتا ہے مگر ان سے ہی ڈر کیوں

ہجرت:

سمندر پار کر کے اب پرندے گھر نہیں آتے
اگر واپس بھی آتے ہیں تو لے کر پر نہیں آتے

بھیمیت:

میری تعریف اتنی ہے کہ میں آدم کا بیٹا ہوں
حدِ حیواں سے بھی لیکن میں کچھ آگے نکل آیا

انساں کو انساں رہنے دو
انساں کی کوئی ذات نہیں ہے

مغربی تہذیب:

مغربی تہذیب تری پرورش کو کیا کروں
آج کا بچہ تو ماں کے دودھ کی قیمت نہ دے

ماحول کی کثافت:

اس دھویں کے پھیلتے پر کاٹ دو
آسماں کو اور مت میلا کرو

سچائی:

میں شرم سار ہوں سچ بات میں نے کہہ ڈالی
نہ آسکا مجھے دل میں غبار رکھ لینا

دروں بینی:

کوئی لمحہ نہیں ہے میرا لمحہ
یہ کس کی زندگی میں جی رہا ہوں

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ے میں ہوں حرفِ غلط لوحِ زمیں پر　　کبھی گھبرا کے راہیؔ سوچتا ہوں

جمالیات:

ے میں کیوں نہ شوق سے سطریں پڑھوں تیری جاناں　　تیرا بدن تو مجھے شاعری سا لگتا ہے

ے لفظ میں گوندھ کے بدن اس کا　　خوبصورت کتاب لکھ دینا

رجائیت:

ے اب بھی دو چار ملیں گے تمہیں جگنو اس میں　　میری بستی میں ہر اک سمت اندھیرا تو نہیں

اوپر دیے گئے اشعار کے علاوہ دو ایک نظموں کے اقتباسات بھی پیش کرتا ہوں جو شاعر کے سماجی شعور اور انسانی ہمدردی کے آئینہ دار ہیں۔

ے روح پر انسانیت کی داغ بن کر ہے عیاں
سہہ رہا ہوں میں کئی صدیوں سے کیوں سود و زیاں

ے کال کوٹھری کی بانہوں میں
جل کر میں جیتی ہوں
مجھ کو اندھیارے پیتے ہیں
میں اندھیارے پیتی ہوں
سورج چُنری اوڑھ کے نِس دِن
میں تو مکتی پاتی ہوں
میں اجیاری باتی ہوں

(نظم اگن مکٹ کو پھن کے میں تو.....)

(اس نظم میں ایک باتی کو عورت کا علامیہ بنا کر دلگداز انداز میں پیش کیا گیا ہے۔)

پروفیسر قیصر نجفی کا ماننا ہے کہ ''تارکین وطن میں جن شعرا کی غزل گوئی میں اہمیت مسلم ہے ان میں سوہن راہیؔ بھی شامل ہیں۔ وہ فنی لحاظ سے غالبؔ اور فکری لحاظ سے فیضؔ کے زیادہ قریب ہیں۔'' خود اپنے فن کے بارے میں سوہن راہیؔ یوں رقم طراز ہیں۔ ''میرا تجربہ تو یہی ہے کہ میری بیشتر تخلیقات بحر میں ہی ہوتی ہے لیکن پھر بھی میں اوزان، ارکان اور الفاظ کے تلفظ پر نظر رکھتا ہوں۔ اس کے بعد میں اپنی تخلیقات

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

سے متعلق اپنے چند گنے چنے ادبی دوستوں اور شعرا سے صلاح مشورہ کرنے میں کوئی برائی نہیں سمجھتا کیوں کہ اس سے آپ کے کام اور کلام میں نکھار ہی پیدا ہوتا ہے۔''

یہ سچ ہے کہ سوہن راہی نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔ انہوں نے غزلیں بھی لکھیں اور نظمیں بھی، اس کے باوجود ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ ان کی طبیعت کا میلان زیادہ تر گیت کاری کی جانب تھا۔ بقول مغنی تبسم ''سوہن راہی نے ہر طرح کے گیت لکھے ہیں۔ ان کے عشقیہ اور مذہبی گیتوں، بھجنوں اور دوہوں میں تجربے اور احساس کی تازگی ملتی ہے۔ انہوں نے گیت کی روایتی لفظیات کو برتنے کے ساتھ اس کی فرہنگ شعر میں چند خوش گوار اضافے بھی کیے ہیں۔ ان کے وہ گیت خاص طور پر قابل توجہ ہیں جن میں عصری زندگی کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔''

بقول پروفیسر قیصر نجفی ''گیت سوہن راہی کے روح کی نگارش ہیں۔ گیتوں میں دل و دماغ کے بجائے ان کی روح سوچتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ شاید اسی باعث ان کے گیتوں میں رومانی سے زیادہ روحانی تجربات اپنی چھب دکھاتے ہیں۔''

سوہن راہی کے گیتوں میں ایک جانب انفرادی جذبات کی عکاسی ملتی ہے اور دوسری جانب آس پاس کے ماحول کی منظر کشی۔ ان کے یہاں مجاز کے پردے میں خالق دو جہاں کی مسلسل تلاش نظر آتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے گیت روحانیت اور بھگتی رس میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ان گیتوں میں حسن و جمال کی پیکر تراشی بھی ہے اور ہجر و وصال کی دلفریبیاں بھی۔ لے اور نغمگی کی زیریں لہر بھی ہے اور سماجی شعور کی نکتہ رسی بھی۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ سوہن راہی نے ہندی کے مدھر اور ملائم الفاظ کو اپنی شاعری میں نگینوں کی طرح جڑا ہے۔ سوہن راہی کی گیت کاری کے متعلق محمد ضیاء الدین احمد شکیب فرماتے ہیں۔ ''سوہن کے یہاں گیتوں کی زبان اُردو اور ہندی کے معیاری الفاظ کے علاوہ پنجابی، برج اور اودھی بول چال کے مقامی اسالیب کی ایک دلچسپ آمیزش ہے جو گیت کو بھولے بھالے ان پڑھ عوام کی آواز بناتی ہے۔ ایسی آواز کے پیچھے سوہن کے تجربے کا شعور کارفرما ہے..... پنگل کے ماترے گنتا ان کی عادت نہیں ہے، پھر جب وہ گیت پر آتے ہیں تو کسی حد تک بحروں کی پابندی کرتے ہیں۔ پھر ان کی طبیعت کی لہر اپنے سر تال خود مقرر کر لیتی ہے۔''

پیکر تراشی، ہجر و وصال، تنہائی کا کرب وغیرہ راہی کے گیتوں کا غالب موضوع رہا ہے۔ سوہن راہی نے 'اجلی رت کا ایک سویرا میں' محبوب کے خدوخال کو یوں بیان کیا ہے۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

کومل کومل بول تمہارے، کلیوں جیسے مہکے ہیں
مست گلابی پھول کٹورے گالوں جیسے دہکے ہیں
امبر کا یہ نیلا آنگن، آنچل جیسا نکھرا ہے
زہریلی کالی لٹ ناگن، رات کو ڈسنے آتی ہے
دور کھڑی پر چھائیں تیری، ہنستی ہے مسکاتی ہے
دھرتی پر تیرا مکھڑا ہی، چندا بن کر ابھرا ہے

'پیاسا پیاسا مورا منوا'، 'دو نیناں رنگ بھرے' اور 'سمے کے چندر مکھی پر تو ہی' گیتوں میں بھی شاعر نے اپنی جمالیاتی قدر شناسی کا مظاہرہ کیا ہے جس کا منتہا آخر الذکر گیت میں یوں نظر آتا ہے۔

تن کے اک اک روم میں راہی، تو ایسے مسکاتا ہے
جیسے لہر لہر ندیا میں چندرما لہراتا ہے
ہنسنے کو ہنستی ہوں لیکن من کی آنکھ تو روتی ہے
سمے کے چندر مکھی پر تو ہی پیت نگر کا موتی ہے

'دُکھ کا چولا'، 'ہاں لکھ دو' اور 'آنسو آنسو ایک کہانی' میں برہ اور تنہائی کا کرب راہیؔ کی نیند اُڑا دیتا ہے جبکہ 'من لگن میں چاند ہے اترا ہوا' اور روپ جگاتا اک بنجارا، میں یادوں کا ریلا گیت کار کے تن من کو مختل کرتا ہے۔ اس کیفیت کو راہیؔ اپنے گیت 'تو پنجرے کا پنچھی ہے' میں ڈھالتا ہے نظم 'ہاں لکھ دو' کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

یہ بھی لکھنا ہم بھی آدھی رات کو اٹھ کر روتے ہیں
دل کے گہرے گھاؤ ہم اپنے اشکوں سے ہی دھوتے ہیں
اور ہم کو نا پوچھنے والے پاس ہمارے ہوتے ہیں
سانجھ سکارے کھیتوں میں ہم دُکھ کاٹیں دُکھ بوتے ہیں
ہاں لکھ دو زخمی سینوں کی رُت بھی بڑی سہانی ہے

سوہن راہیؔ ایک جانب برہ کی اگن میں جل کر زندگی سے بے زار دکھائی دیتے ہیں (میں نے تیرے کارن جوگ لیا) جبکہ دوسری جانب وہ عشق کے میدان میں نیا اتہاس رچانے کے خواہاں بھی ہیں۔

میں گیت ہوں ترا تو گیت ہے میرا
تو مجھ کو گالے، میں تجھ کو گالوں

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

آؤ اپنے امر پریم کو ہم اتہاس بنائیں
دُکھ میں ڈوبے انسون سے مدھ ماس کھلائیں
دھرتی اور نیلا امبر مستی میں کیسے جھومے
ماٹی کی مٹھی میں ہم وہ باس بسائیں
میں ہوں تیرا جیون ساتھی اور تو میت ہے میرا

(میں گیت ہوں تیرا)

زندگی کے سفر کا مدعا تلاشنے کے لیے سوہن راہیؔ ہمیشہ بے قرار نظر آتے ہیں۔ یہی وہ منزل ہے جہاں ہجر زدہ حساس شاعر مادیت کی بھول بھلیوں سے نکل کر روحانیت کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ 'جیون چلتا جائے'، 'چلنا ہے تو چل'، 'من پیاسا پیاسا ہے'، 'ایک پون جھکورا ایسا ہے' اور 'کیا کانٹا کیا پھول یہاں پر'، گیتوں میں اسی تلاش کی مختلف جہتیں نظر آتی ہیں۔

کیا کانٹا کیا پھول یہاں پر
سب کو ماٹی ہونا ہے
پل دو پل کا ہے سکھ بندھن
دن بھر کا رونا ہے

(کیا کانٹا کیا پھول یہاں پر)

اسی برہ کی اگن میں جل کر جب شاعر کو ہر طرف ناامیدی گھیر لیتی ہے تو وہ یوں لب کشا ہوتا ہے۔

مجھے گیت بنا کر گاؤ گے
میرے جانے پر پچھتاؤ گے
تم اپنی سوچ کی دلہن کو
آنسو گہنے پہناؤ گے

(مجھے گیت بنا کر گاؤگے)

سوہن راہیؔ زندگی کا جوہر ڈھونڈتے ڈھونڈتے بہت دور نکل جاتے ہیں۔ وہ مالک حقیقی تک پہنچنے کے لیے بھکتی مارگ کو اپناتے ہیں اور ایشور کو ہی اپنا محبوب بنا کر اُسے مخاطب ہوتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں دنیاوی عشق چولا بدل کر عشق الٰہی میں بدل جاتا ہے اور پھر عاشق اپنی سدھ بُدھ کھو بیٹھتا ہے۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

راہی کے فکر میں ہندو فلسفے کی چھاپ صاف طور پر نظر آتی ہے۔ اس ضمن میں ان کے چند گیت 'موت ہی آخر میت ہماری'، 'رین اندھیری کایا ہے'، 'ہم مٹی سے کھیل رہے ہیں'، 'پنچھی پھرے اکیلا'، 'تو ہی کرتی کرے'، 'اک بندھن ہے جیون بندھن'، 'تم سورج ہم چھایا' اور 'سب کا اک داتار' ملاحظہ ہوں۔ ان گیتوں میں سے چند اقتباسات:

ہم سب چلتی پھرتی لہریں، اک ساگر کی کایا
بادل بجلی، ہریالی کوئی، سات رنگ کی چھایا
وہ سنگار کا موتی ٹھہرے
جس کو شرن وہ لے لے
مٹی ہم سے کھیلے (ہم مٹی سے کھیل رہے ہیں)

اس کے نام کا امرت پی لے، ستیہ روپ کا چولا سی لے
اس پاپی سنسار میں اب تو کچھ تو سچا جیوں جی لے
آج اور کل پر ٹلتے ٹلتے
بیت نہ جائے بیلا
جھوٹا جگ کا میلا (پنچھی پھرے اکیلا)

شاعر کے غم واندوہ کی سب سے بڑی وجہ اپنی دھرتی سے بچھڑنے کا غم، ہجرت کی صعوبتیں اور تنہائی کا احساس ہے جو ان کے گیتوں 'دور بہت ہی دور'، 'ڈھلتے ڈھلتے ڈھل جائے گی' اور 'کوئل کوک پپیہا بانی نا پیپل کی چھاؤں' میں ڈھل کر ہمارے سامنے آتا ہے۔

جس کی دھول میں بچپن کھویا، جس سے ملی جوانی
جس دھرتی پہ جنم لیا وہ دھرتی ہے مہارانی
اس گھر کی ہر پگڈنڈی
بانہیں پھیلاتی ہے
کوئی آواز سی آتی ہے
دور بہت ہی دور (دور بہت ہی دور)

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

باوجودیکہ سوہن راہیؔ اپنی دھرتی سے برسوں پہلے بچھڑ چکے ہیں مگر نہ ہی وہ اپنے مادر وطن کو بھول پائے ہیں اور نہ ہی یہاں کے لوگوں کو۔ 'آنگن آنگن روپ دھوپ کی' اور 'اپنے وطن کی یاد میں ہم نے' میں حب الوطنی قطرہ قطرہ آنسو بن کر قرطاس پر پھیل چکی ہے۔ انہوں نے اندرا گاندھی، راجندر سنگھ بیدیؔ اور فیض احمد فیضؔ کو بھی اپنے گیتوں کے ذریعے ہی شردھانجلی پیش کی ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ شاعر نے اپنے معاشرے سے کبھی منہ نہیں موڑا۔ وہ جہاں اپنی دھرتی کو یاد کرتے ہیں وہیں اپنے لوگوں، اپنے سماج اور اپنی کائنات پر بھی نظر رکھتے ہیں اور اس سماج کے برے بھلے کو اپنے گیتوں میں اجاگر کرتے ہیں۔ کہیں وہ ناامید سے ہوتے ہیں اور کہیں اُجالے ان کو اپنی گرفت میں لیتے ہیں۔

اب کے ساون ایسے برسا دھرتی پر
لہو رنگ کا ساگر چھلکا دھرتی پر
میری سندر دھرتی پر
پاون پاون دھرتی پر.....

(اب کے ساون.....)

میری زندگی کے خواب تو بھی جل
نفرتوں کی آگ ہے قدم قدم
چاہتوں بھرے گلاب تو بھی جل.....

(زمین کے سورجوں کو گھن لگ گیا)

منزلیں ڈھونڈتی رہ گئیں کارواں
رہنما ہم کو راہیؔ لٹیرے ملے
کچھ اُجالے ملے، کچھ اندھیرے ملے.....

(آنسوؤں کی ڈگر پر)

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

مانوتا کے ، نوجیون کے
آشاؤں کے ، اجلے پن کے
اندھیاروں میں دیپ جلاؤ
جگ مگ جگ مگ دیپ.....

(دیپ جلاؤ)

آخر میں سوہن راہیؔ کے بارے میں کفیل آزر کے یہ الفاظ پیش کرتا ہوں جو نہ صرف ان کی شخصیت بلکہ انکے فکروفن کا بھی بڑی خوبی کے ساتھ احاطہ کرتے ہیں۔

''اس کے سینے میں ایسا اداس دل کیوں ہے جو ابھی تک رشتوں سے، زمین سے، تہذیب، اخلاق، ادب، معاشرے اور سیاست سے جڑا ہوا ہے۔ بلاشبہ انہوں نے گیت لکھے ہیں وہ کسی اعزاز پانے کے لیے نہیں لکھے۔ مجھے ان کے ہر گیت میں سچائی اور دل سے نکلی ہوئی آواز سنائی دی جنہوں نے زوردار طمانچہ مار کر پھر سے کہا دیکھ کفیل آزر زندہ شاعری اسی کو کہتے ہیں۔''

❖ ❖ ❖

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

زنفر کھوکھر کی افسانوی دنیا

'خوابوں کے اس پار' سے لے کر 'کانچ کی سلاخ' تک زنفر کھوکھر نے اپنے ادبی سفر کے دوران کئی سنگ میل طے کیے ہیں۔ زبان اور اسلوب پر ان کی گرفت ابتدا ہی سے نظر آتی تھی البتہ فکر و خیال میں پختگی اور بالیدگی وقت کے ساتھ ساتھ آتی گئی۔ ان کے افسانوں میں رومانیت اور مقصدیت دونوں موجود ہیں اور مجھے یہ کہنے میں بالکل تامل نہیں کہ افسانہ ان کی سرشت کا حصہ بن کر رہ گیا ہے۔

زنفر ریاست جموں و کشمیر کے ایک دور دراز پسماندہ علاقے ساج راجوری میں اُردو ادب کی شمع جلائے بیٹھی ہیں اور محکمہ تعلیم سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ علاقہ جہاں اپنی فطری خوبصورتی کے لیے مشہور ہے وہیں سرحد کے قریب ہونے کے سبب ہمیشہ لرزاں اور پرفغاں رہتا ہے۔ تقسیم ملک کے بعد اس علاقے نے کسی بھی دن امن و چین سے سانس نہیں لیا۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان لڑائیوں کے دوران یہ دھرتی ٹینکوں اور گولہ بارود سے دہل اٹھتی ہے۔ ہنستے کھیلتے گھر آنکھ جھپکتے ہی کھنڈروں میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور لوگ راتوں رات اپنے گھر بار چھوڑ کر نقل مکانی کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ دھرتی کے اس کرب کو زنفر کھوکھر نے نہایت ہی دقیقہ شناسی سے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ اس کے علاوہ 'عورت' بھی موصوفہ کے افسانوں کا غالب موضوع رہا ہے۔ وہ عورت پر ہو رہے ظلم و ستم، ناخواندگی، جہیز اور عدم تحفظ پر اکثر فوکس کرتی ہیں۔ اس کے باوجود وہ نہ تو تانیثی تحریک سے وابستگی کا اظہار کرتی ہیں اور نہ ہی تانیثی

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

آزاد روی کے خواب دیکھتی ہیں۔ زنفر کھوکھر کے افسانوں کا تیسرا اہم موضوع نظام تعلیم ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں اساتذہ اور تعلیم سے وابستہ منتظمین کو آڑے ہاتھوں لیتی ہیں۔

'خوابوں کے اس پار' زنفر کھوکھر کا پہلا مجموعہ ہے جس میں تیس افسانے شامل ہیں۔ حصہ اول کے چودہ افسانوں کا رنگ مزاحیہ ہے جبکہ حصہ دوم کے سولہ افسانوں کے موضوعات سنجیدہ ہیں۔ ان افسانوں کا جائزہ لیتے وقت مجھے اس بات کا ہر دم احساس رہا کہ زنفر مشرقی عورت ہونے کے ساتھ ساتھ ایسے علاقے سے تعلق رکھتی ہیں جہاں آزادی کے ساٹھ سالوں کے بعد بھی موڈرن زندگی کی رمق دکھائی نہیں دیتی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس علاقے میں زندگی کی بنیادی ضروریات جیسے بجلی اور پانی، ہسپتال اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے کالج اور یونیورسٹیاں بھی نہیں ملتیں۔ افسانہ نگار نے اس محدود ماحول میں رہ کر بھی خوبصورت افسانے رقم کیے ہیں جن میں ان کے مشاہدے سے زیادہ ان کے مطالعے کا عمل دخل ہے۔

'خوابوں کے اس پار' پر اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے ڈاکٹر ظہور الدین لکھتے ہیں:

> ''یہ صحیح کہ ابھی زنفر کھوکھر کی تحریر میں وہ مقناطیسیت تو پیدا نہیں ہوئی جس کے بغیر فن کار کو حیات دوام حاصل نہیں ہوتی لیکن خوش آئند بات یہ ہے کہ اس مقناطیسیت تک پہنچنے کے لیے جس بنیادی جوہر کی ہر فن کار کو ضرورت ہوتی ہے یعنی تخیل کی بے پایانی اور فکر کی جولانی، یہ دونوں عناصر زنفر کے قلم کو قدرت نے کما حقہ عطا کیے ہیں۔''

مزاحیہ افسانوں میں زنفر کھوکھر نے عام زندگی میں پیش آنے والے چھوٹے موٹے واقعات کے مزاحیہ پہلو ابھارے ہیں اور ساتھ ہی اپنے علاقے کی پسماندگی، لاچارگی اور ضروریات زندگی کی عدم موجودگی کو ہدف ملامت اور اپنی طنز کا نشانہ بنالیا ہے۔ افسانہ 'مدہوش' میں وہ پبلک ٹرانسپورٹ کے پابندی سے نہ چلنے کے سبب ہمیشہ آفس دیر سے پہنچ جاتی ہے اور ایک روز بھیانک سا خواب دیکھتی ہے کہ جلدی پہنچنے کے چکر میں اُسے کوئی اغوا کر کے لے جاتا ہے۔ 'گھر پیارا گھر' میں ناکتخداؤں کو کرائے پر گھر نہ ملنے کے باعث وہ خود کو شادی شدہ ظاہر کرتی ہے مگر یہ جھوٹ بھی کام نہیں آتا کیونکہ نئے مکان کی مالکن شادی شدہ لوگوں کو اپنا گھر کرائے پر دینا پسند نہیں کرتی۔ 'انتخاب' میں عورتوں کا تعاقب کرنے اور ان سے بدسلوکی کرنے، 'ہم ہندوستانی ہیں' میں حب الوطنی، 'یوں بھی ہوتا ہے' میں سکول دیر سے پہنچنے، 'نصیحت' میں سررشتہ تعلیم کے انتظامیہ کے دوغلے رویے، 'جوابی کارروائی' میں تعلیم یافتہ بیوی کے آگے ان پڑھ تاجر کا احساس کمتری میں مبتلا ہو کر دوسری شادی کرنے، 'ہمارے ماسٹر جی' میں استاد طبقے کو اپنی ذمہ داریاں سمجھنے، 'عزت

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

کا سوال' میں عورتوں پر ہو رہے مظالم کا جائزہ لیتے ہوئے ایک اخباری رپورٹر کا مردوں پر ہو رہے ظلم کا چشم دید گواہ بننے، 'چکری' میں ایک دیانتدار استاد کا خود کو سماج میں الگ تھلگ پانے، 'اہلیہ محترمہ' میں آدمی کا شادی کر کے بیڑیوں میں بندھ جانے، 'پہلی ہی نظر میں' میں باغی لڑکی کو اپنے عاشق کے ڈھونگ کا پتہ چلنے، گزشتہ راصلوٰۃ، میں حاضری رجسٹر کے غائب ہو جانے اور پھر اپنے ہی کاغذوں میں مل جانے کے درمیانی وقفے میں ہیڈ ماسٹر کی حواس باختگی، اور 'پرنسپل صاحب' میں انتظامیہ کی جانب سے مردوں کو عورتوں پر ترجیح دینے کو موضوع بنایا گیا ہے۔

'خوابوں کے اس پار' فکر انگیز افسانہ ہے جس میں ایک باپ شہوت کے زیر اثر ہونے والی بہو کو نہایت چالبازی کے ساتھ اپنی بیوی بنانے میں کامیاب ہوتا ہے۔ خونی رشتوں کی شکست وریخت پر لکھا گیا یہ بہت ہی خوبصورت افسانہ ہے جس کو پڑھ کر مجھے سٹار ورلڈ کے ایک سیریل 'بولڈ اینڈ دی بیوٹی فل' کی یاد آئی۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ شہوت پرستی اور اشتعال انگیزی صرف مغربی تہذیب کی میراث نہیں ہے بلکہ مشرق میں بھی پردے کے پیچھے پروان چڑھتی رہی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مغربی تہذیب کی بدعنوانیاں غیر مشروط میڈیا اور ادب کے ذریعے کھل کر ہمارے سامنے آتی ہیں جبکہ مشرقی تہذیب میں پل رہی گندگی دبیز تہوں کے نیچے دب کر رہ جاتی ہے وہ چاہے امرد پرستی ہو یا تزویج محرمات (incest) ایذا رسانی (sadism) ہو یا درز بینی (voyeurism)۔ اس افسانے میں احساس گناہ اور عدم تحفظ خود باپ کو آتش زیر پا رکھتا ہے مگر اس کافر ماں بردار بیٹا رشتوں کی لاج رکھنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا جس کے باعث شکیل کی وفات کے بعد اس کی نئی ماں یوں گویا ہوتی ہے:

> ''شکیل تم نے مجھے ماں کا رتبہ دے کر میرے سارے خوف اور اندیشے دور کر دیے تھے۔ تم نے میرے بچوں کو اپنے سگے بھائی کہہ کر مجھے مستقبل کی انجانی فکروں سے آزاد کر دیا تھا۔ شکیل ہمیں تمہاری ضرورت تھی۔''

دیگر افسانوں کے موضوعات بھی عصری مسائل پر مبنی ہیں۔ افسانہ 'ایک چھوٹی سی لڑکی' میں معشوقہ سے مراجعت، 'بے بسی' میں نیچی ذات کی لڑکی سے شادی نہ کرنے کے سبب عمر بھر اسے یاد کرنا، دردنہاں، میں ایسی لڑکی سے انتہائی محبت کرنا جو شادی شدہ ہے، 'تشویش' میں ایک دلیر لڑکی راحیلہ کا طلاق شدہ ثاقب کو 'سیکنڈ ہینڈ مرد' کہہ کر ٹھکرا دینا، 'گھر' میں نقل مکانی اور بے زمینی کا کرب، 'بڑی بہو' میں عورت کو بانجھ ہونے کے سبب گھر سے نکال باہر کرنا، 'رعایت' میں نسوانی آزادی اور ریزرویشن بل کی ضرورت، 'نسخہ'

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

میں متنازعہ موضوع کی آڑ لے کر قلمکاروں کا سستی شہرت حاصل کرنا، 'وہ' میں بچہ نہ ہونے کے باعث طلاق ہونا، 'دربہ' (ڈربہ) میں گھر سے نکالے جانے پر نادرہ کا اپنے پرانے بوسیدہ کمرے میں پناہ لینا، 'حسن سلوک' میں بہو کا اپنی ساس سے تنخواہ کی مانگ کرنا اور بدلے میں ساس کا اپنی ساری رقم اس کے حوالے کر دینا 'ایس، ٹی' میں ریزوریشن کا مسئلہ، 'ایک انسان' میں انسان کے چہرے سے نقاب ہٹا کر اس کا اصلی روپ سامنے لانا، 'پچھتاوا' میں ایک معصوم لڑکی کو چھلاوے سے اپنے گونگے بہرے بھائی سے شادی کروانا، اور 'اے جان ناتواں' میں مردوں کی دنیا میں عورتوں کی بے بسی ولاچاری۔ غرض یہ کہ زنفر کھوکھر نے اپنے گردوپیش کو کھنگال کر ہی افسانے رقم کیے ہیں۔

زنفر کھوکھر کا دوسرا مجموعہ بعنوان 'کانچ کی سلاخ' چار سال کے وقفے کے بعد منظر عام پر آیا ہے۔ اس مجموعے کے مطالعہ سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ زنفر نے ادبی میدان میں ایک لمبی چھلانگ لگا کر منزل کو پانے کی کوشش کی ہے۔ زبان، اسلوب اور ٹریٹمنٹ۔ سبھی پہلوؤں میں فنی پختگی کا احساس ہوتا ہے۔ مشاہدے میں گہرائی، مطالعے میں وسعت اور موضوعات میں سنجیدگی صاف نظر آتی ہے۔ حالانکہ اس مجموعے میں سترہ سنجیدہ افسانوں کے علاوہ نو مزاحیہ افسانے شامل ہیں مگر ان افسانوں میں بھی عصری مسائل کو ہی موضوع بنایا گیا ہے۔ یہاں میں زنفر کھوکھر کو کچھ مشورہ دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ مزاحیہ واردات، واقعات یا لطیفے افسانے نہیں بن سکتے۔ افسانے میں سنجیدہ فکر وخیال کا ہونا لازمی ہے۔ بذلہ سنجی افسانے کی منزل نہیں بن سکتی صرف منزل تک پہنچنے کے لیے مدد کر سکتی ہے۔ کرشن چندر نے نہ تو اپنے افسانوں کو لطیفہ بنانے کی کوشش کی اور نہ ہی مزاحیہ خاکہ۔ اس کے برعکس انہوں نے طنز کے تیروں سے معاشرے پر بھرپور وار کیے اور یہی ان کی مقبولیت کا راز بھی ہے۔ افسانہ نگار کو چاہیے کہ وہ مزاحیہ خاکوں اور مضامین کو الگ سے شائع کروائیں۔

'کانچ کی سلاخ' کے دیباچے میں امین بنجارا یوں رقمطراز ہیں:

> ''زنفر کھوکھر نے اپنے گردوپیش میں رونما ہونے والے واقعات وحادثات کا اثر قبول کر کے اور اچھے برے لمحوں کے کھیل تماشوں کا گہرائی سے مشاہدہ کر کے انسانی فطرت کے رموز واسرار کی گرہوں کو کھولنے کی جو سعی کی ہے وہ قابل تعریف ہے۔ اصل میں لمحوں کے کھیل تماشے ہی ان موضوعات کو جنم دیتے ہیں جن پر فن کار اپنے فن کی بنیاد رکھتا ہے..... زنفر کھوکھر اس بات کی قائل نہیں ہیں کہ انسان رنج وغم کے حصار میں

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

مقید ہو کر رہ جائے یا پھر کسی بھی مسئلے کو اپنی جان کا روگ بنائے ۔ وہ پل پل ٹوٹنے اور بکھرنے کے بجائے خوشحال، پرسکون اور آزاد فضاؤں میں سانس لینے کو ترجیح دینے کا پیغام دیتی ہیں، بھلے ہی اس عمل کے دوران میں جگ ہنسائی اور طعن و تشنیع سے دوچار ہونا پڑے۔ یہ زنفر کے فن کا رجائی پہلو ہے۔ قنوطیت اور یاسیت سے انہوں نے اپنا دامن بچائے رکھا ہے۔''

مذکورہ کتاب کا پہلا افسانہ 'سیکنڈ ہینڈ' پہلے مجموعے میں بھی شامل ہے۔ افسانہ خواب کی زاہدہ بیگم بچوں کی بے انتہا لالچ اور خود غرضی دیکھ کر اپنی دولت غریبوں میں بانٹتی ہے۔ 'کانچ کی سلاخ' نفسیاتی افسانہ ہے اور لگتا ہے اس کا ہیرو نواز علی کہیں نہ کہیں افسانہ نگار سے ملا ہے۔ اس افسانے میں فوجی ڈسپلن کا گرویدہ نواز علی اپنے گھر میں بھی ڈسپلن کا خواہاں ہے مگر اپنی بیوی صدیقہ جان کو قابو کرنے میں ناکام ہوتا ہے۔ وہ جتنی بھی پابندیاں لگانے کی کوشش کرتا ہے، صدیقہ اتنی ہی بپھر جاتی ہے۔ اس گھریلو تنازعے سے فائدہ اٹھا کر ان کا بیٹا بے راہ روی کا شکار ہو جاتا ہے اور ملی ٹنٹ بن کر حب الوطن اور نیک سیرت نواز علی کے منہ پر کالک پوت کر اسے راہ عدم اختیار کرنے کے لیے مجبور کر دیتا ہے۔ افسانہ 'حادثہ' میں ماں کی ممتا کے باعث اس کا بیٹا بگڑ جاتا ہے اور دونوں کے درمیان خلا نمودار ہوتا ہے۔ 'یہ دنیا اگر مل بھی جائے تو کیا ہے' میں ڈرپوک بیٹا ماں باپ کے کہنے پر محبوبہ سے کنارہ کر کے دوسری لڑکی سے شادی تو کر لیتا ہے مگر لاشعور میں اس کو بسائے رکھتا ہے۔ 'خاموشی' کہانی ہے ایک بانجھ عورت کی جو اٹھتے بیٹھتے اپنی جیٹھانیوں کے طعنے سنتی رہتی ہے اور ایذا پسند (masochist) عورت کی طرح اپنے آپ کو یوں تسلی دیتی ہے۔ ''وہ کیا جانیں کہ قدرت نے ستم سہنے میں بھی ایک مزا چھپا رکھا ہے۔'' اسی طرح 'یادیں' نفسیاتی الجھن میں پھنسی مامی عذرا کی کہانی ہے جو شوہر کی بے توجہی کے سبب چھ بچے جن کر بھی ہر ایرے غیرے کو اپنے دکھڑے سناتی رہتی ہے اور آخر کار اپنے بچوں کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتی ہے۔

زنفر نے دیہاتی لوگوں کی معصومیت اور سادگی کو افسانہ 'پانچ سو روپے' میں بڑی خوبی سے اجاگر کیا ہے۔ اس افسانے میں ڈاکٹر ایک دیہی عورت کی سادگی اور ناخواندگی کا فائدہ اٹھا کر اسے ایک سو روپے کے بجائے پانچ سو روپے اینٹھ لیتی ہے۔ اور ساتھ ہی ناک چڑھا کر گویا ہوتی ہے۔ ''تم دیہاتی عورتیں ایسی ہی ہوتی ہو۔ کام نکلوانے کے بعد ذلالت پر اتر آتی ہو۔ میں تم دیہاتیوں کو بہتر طور پر جانتی ہوں۔'' 'مجبوری' سماجی بدعتوں پر لکھا ہوا خوبصورت افسانہ ہے۔ راوی پڑوسی کی بیٹی کی شادی پر فضول خرچیوں کے

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

اور تاجروں کی کوئی سازش تو نہیں ہے؟ 'ریزرویشن' میں نسوانی آبادی کے لیے ریزرویشن کی ضرورت، 'خواب نہیں دیکھا کرو' میں خواب دیکھنے کی حماقت اور 'گالی' میں کلام کی حسن کاری کو موضوع بنایا گیا ہے۔

زنفر کھوکھر اپنے افسانوں کی شروعات بڑے ہی دلکش انداز میں کرتی ہیں۔ پہلے ہی جملے سے قاری افسانہ پڑھنے کے لیے بے تاب ہوتا ہے۔ اس ضمن میں دو افسانوں سے اقتباسات یہاں پر درج کر رہا ہوں:

''سیما ایک بوجھ تھی مجھ پر، ایک ناپسندیدہ بوجھ، جسے اٹھائے رکھنا میری مجبوری تھی۔ میری گھریلو اور خاندانی مجبوری اور پھر سماجی مجبوری۔ چونکہ میں منحرف نہیں تھا۔ روایات شکن نہیں تھا۔ سماجی قواعد وضوابط اور رسم ورواج کا قدردان تھا۔''

(یہ دنیا اگر مل بھی جائے تو کیا ہے .....)

''میرے یہ پوچھنے پر کہ آپ کے 'وہ' کیا ہیں .....؟'' نازیہ صاحبہ نے سر اٹھا کر ''کچھ نہیں'' اس انداز سے کہا جیسے کہہ رہی ہوں کہ 'وہ' سب کچھ ہیں۔ سی ایم ہیں بلکہ پی ایم صاحب ہیں.....

(کچھ نہیں)

کردار انگاری میں بھی زنفر کھوکھر ید طولیٰ رکھتی ہیں۔ انہوں نے اپنے آس پاس کے ماحول ہی سے کردار ڈھونڈ نکالے ہیں۔ کئی افسانے تو ایسے ہیں کہ ان کی اپنی زندگی سے وابستہ دکھائی دیتے ہیں۔ اس بارے میں امین بنجاز افرماتے ہیں۔

''کردار نگاری کے حوالے سے زنفر کھوکھر کے افسانے بڑے جاندار ہیں کیونکہ ان کے کردار اپنی ذات کے ٹوٹنے اور اپنی ذات کے کرب کی نمائندگی کرتے ہوئے قاری کو کبھی کبھار اپنے سینے پر ہاتھ رکھنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ قاری کو کئی بار ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زنفر کھوکھر نے اس کے دل وذہن میں جھانک کر ہی یہ کردار صفحۂ قرطاس پر اتارا ہے۔ صائمہ، نواز علی، صدیقہ جان، نازیہ، زاہدہ بیگم، ثاقب، بڑی بیگم، شاہنواز، لیاقت علی، بی اماں، راشد اور چھوٹی بیگم کے کردار ہمارے دیکھے ہوئے کردار ہیں جو خارجی اور داخلی سطح پر اپنا کرب ابھارتے چلے آتے ہیں۔''

کئی افسانوں میں زبان کی غلطیاں در آئی ہیں البتہ یہ آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ مثلاً صفحہ ۶۰ پر ہتیا چار (اتیاچار)، صفحہ ۱۲۱ پچھلی 'کھڑکی' (پچھلا دروازہ)، صفحہ ۱۴۱ پر 'اچکتی' (اچٹتی)، صفحہ ۱۵۵ پر مزاح

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

(مذاق) اور صفحہ ۱۵۷ پر درب (ڈربے) ہونا چاہیے، (مجموعہ خوابوں کے اس پار)۔ 'کانچ کی سلاخ' میں صرف دو تین غلطیاں نظر آتی ہیں جیسے نظر ہو چکے (نذر ہو چکے) صفحہ ۹۰ وغیرہ۔ ان اغلاط سے قطع نظر زنفر کھوکھر کی تحریریں قاری کو باندھنے میں کامیاب ہوتی ہیں اور عبارت کی دلکشی شروع سے اختتام تک برقرار رہتی ہے۔

سرحد کے قریب رہنے کی وجہ سے زنفر کی تحریروں میں بے گھری اور بے زمینی کا کرب جا بجا ملتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے چند اقتباسات:

● اس کی پھیکی سی ہنسی بے وجہ کب تھی۔ ابھی ابھی تو اسے پتہ چلا تھا کہ وہ تنہا نہیں ہے۔ اس کی طرح کوئی اور بھی ہے کہ مکان بنانے میں جس کے زیورات تک بک گئے ہیں۔ نہ جانے اور بھی کتنے ہوں گے..... بلکہ سب ہی ہیں۔ مکان یوں نہیں بن جاتے ہیں۔ مکان بنانے میں عمر لگتی ہے۔ اور عمر بھر کی پونجی لگتی ہے۔ تب کہیں جا کر ہنستے بستے گھر وجود میں آتے ہیں۔ ''آہ! ہم لٹ گئے۔ ہم تباہ و برباد ہو گئے۔ ہمارے ہنستے بستے گھر آناً فاناً ویران ہو گئے.....'' اب آوازیں ہی آوازیں تھیں اور موضوع ایک تھا۔

(گھر صفحہ ۱۳۵)

● ''بیٹی! دونوں جنگوں میں ہمارے بھرے پُرے گھر جلا دیے گئے اور تمہیں بتاؤں کہ جلائے کس نے.....! آہ! اپنے ہی ملک کی فوجوں نے محض اس شک پر کہ ان گھروں میں دشمن کی فوجوں نے پناہ لے رکھی ہے۔ ہمارے پاس کشادہ مکان تھا۔ زندگی آرام سے گذر رہی تھی کہ ۱۹۴۷ء کا غدر پھوٹ پڑا۔ اور ہمیں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگنا پڑا۔ ہم سات سال تک مہاجر بنے رہے۔ وطن کی کشش ہمیں واپس کھینچ لائی۔ مگر ہم نے آ کر کیا دیکھا! ہمارے گھر کھنڈروں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ ہم نے پھر دن دیکھا نہ رات۔ اور پھر سے مکان بنایا۔ ابھی سکھ کا سانس بھی نہ لیا تھا کہ سال ۱۹۶۵ء آ گیا۔ اور ہم پھر سے اجڑ گئے۔''

(گھر صفحہ ۱۳۵)

● ''بہو ہم لوگ ہندو پاک کی جنگوں کے مارے ہوئے ہیں۔ ہمارے مکان دو بار جلائے گئے۔ ۱۹۴۷ء میں بھی اور ۱۹۶۵ء میں بھی۔ ہندستانی فوجیوں نے اس لیے جلائے کہ ان گھروں میں پاکستانی فوجیوں نے ڈیرہ ڈال رکھا تھا اور پاکستانی فوجیوں نے

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

اس لیے جلائے کہ یہ ہندوستانیوں کے گھر تھے۔" (دربۃ۔ص۹۔۱۵۸)

محولہ بالا اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرحد کے قریب رہنے والے لوگوں کو ہمیشہ عدم تحفظ، اپنی دھرتی اور اپنی مٹی کا کھو جانا اور زندگی کا عبوری پن ستاتا رہتا ہے جس کے باعث ان کا نفسیاتی ردعمل بھی دوسرے لوگوں سے مختلف ہوتا ہے۔ زنفر نے اپنے کرداروں کے ذریعے اس نفسیاتی کرب کو بڑی ہنرمندی سے پیش کیا ہے۔

آخر میں زنفر کھوکھر کے افسانوں کے بارے میں جگن ناتھ آزاد کی رائے پیش کرنا بہت ضروری سمجھتا ہوں:

"زنفر کھوکھر صوبہ جموں کی ایسی خاتون افسانہ نگار ہیں جنہیں کہانیوں کی بُنت کا فن آتا ہے۔ زنفر کھوکھر کے افسانوں میں محسوسات اور احساسات کے کئی پرتو دکھائی دیتے ہیں جو اس امر کو واضح کرتے ہیں کہ وہ زندگی کے ہر ایک پہلو پر گہری نگاہ رکھے ہوئے ہیں اور زندگی سے وابستہ گوناگوں مسائل پر غور و فکر کرتا ہوا ذہن ان کے پاس موجود ہے۔"

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

آغا گل کا افسانوی مجموعہ 'گوانکو' ۔ ایک تجزیہ

اے بلوچستان ! اے میرے وطن میری زمین
اے میری چاہت کی دنیا میرے خوابوں کی امین
ہے یہ صحرائے محبت الفتوں کی سرزمین
اپنی وسعت اور بلندی میں فلک کی ہم نشین

(آغا گل)

آغا گل آج کل کوئٹہ بلوچستان میں ڈاک محکمے کے اعلیٰ افسر ہیں اور اس ناتے میرے ہم پیشہ بھی ہیں۔ مجھے ان کا تعارف فرخ صابری کے ایک مضمون کی بدولت ملا۔ خوش قسمتی یہ کہ حال ہی میں انہوں نے اپنا تازہ افسانوی مجموعہ 'گوانکو' بھی عنایت فرمایا جس کے مطالعے سے مجھے یہ احساس ہوا کہ سرحد کے اس پار جو حال ہے وہی حال سرحد کے اس پار بھی ہے۔

زیر نظر مجموعے کے انتساب سے صاف ظاہر ہے کہ آغا گل افسانہ نگاری کے بے تاج بادشاہ کرشن چندر کے ثناخواں ہیں اور ان کی طرح ہی رومانیت اور مزاح نگاری کے پرستار بھی۔ مزاحیہ افسانے لکھنے کی تحریک انہیں ایک نیم مزاحیہ افسانہ لکھ کر ملی جس کو پڑھ کر ان کے دوستوں نے، جن میں فہیم اعظمی (ایڈیٹر سریر) اور احمد ہمیش (ایڈیٹر تشکیل) بھی شامل تھے، انہیں مزاحیہ افسانے لکھنے کا مشورہ دیا۔ بقول آغا گل ''سچ کہنے سے مزاحیہ لکھنا بہتر ہے۔ افسانہ نگار میں نہ تو سچ لکھنے کی ہمت ہے نہ ہی جھوٹ لکھنے کا یارا''۔ میرے خیال

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

میں اکبرالہ آبادی کی طرح مزاحیہ نگاری آغا گل کی پیشہ ورانہ مجبوری ہے کیونکہ نہ تو وہ اچھی گورنمنٹ نوکری کھونا چاہیں گے اور نہ ہی اپنے ضمیر کی آواز کو عفریت 'گوانکو' کے حوالے کرنا چاہیں گے۔ اسی لیے انہوں نے بیچ کا راستہ چن لیا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ سچائی سے گریز کرتے ہیں البتہ وہ طنز کا ملمع چڑھا کر سچائی کو کنایوں اور علامتوں کے ذریعے ہم تک پہنچا دیتے ہیں۔ تاہم ان کی نثر میں بیانیہ برقرار ہے اور کہیں بھی ترسیل کا المیہ سامنے نہیں آتا۔

افسانہ نگار نے جابجا عفریت کو بطور علامیہ پیش کیا۔ گوانکو ـــــ جو آدمی کو گونگا بنا دیتا ہے، پیرو ـــ جو آکٹوپس کی مانند جکڑ لیتا ہے، بلہ ـــــ جو موت کے گھاٹ اتار دیتی ہے، جاتو ـــــ جو کلیجہ چبا جاتی ہے، چک بر ـــــ جو اڑا کر لے جاتا ہے، داچناں ور ـــــ جو بچوں کو اٹھا کر لے جاتا ہے، اُچ نہار ـــــ جو آدم خور ہے، یک ٹانگی ـــــ جس کی صرف ایک ٹانگ اور ایک آنکھ ہے، اور، دت ـــــ جو اپنی شکلیں بدلتا رہتا ہے۔ یہ سب پریت آتمائیں ہمارے داستانوی ورثے کا حصہ بن چکی ہیں لیکن ان کے علامتی اور اشاراتی پہلوؤں پر غور کریں تو یہ آج بھی بدخصلت انسانوں کے روپ میں ہمارے تہذیب یافتہ معاشرے میں پنپ رہی ہیں اور انسانیت کا قلع قمع کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔ آغا گل ان غیر فطری قوتوں سے ہر جگہ نبرد آزما ہیں ۔ شاید یہی وجہ ہے کہ قرۃ العین حیدر کو ان کے افسانوں میں انسانیت (Humanitarianism) کی زیریں لہر نظر آئی۔

افسانوی مجموعہ 'گوانکو' کے علاوہ موصوف کی دس تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ گورپیچ، اکاش ساگر، تارِمہ (افسانوی مجموعے)، دشت میں سفر، دشتِ وفا، بیلہ (ناول)، عکس قمر (شعری مجموعہ) شدرومرجان، تاریخ کی گواہی اور پارس لفظیں۔ ان کے افسانوں میں بلوچستان کی بو باس ملتی ہے۔ وہ اپنی دھرتی کے ذرّے ذرّے سے محبت کرتے ہیں۔ بقول طفیل اختر، ایڈیٹر ماہنامہ مسکراہٹ لاہور، ''آغا گل کا دل بلوچستان ہے۔'' اسی ضمن میں شاہد علی خاں، ایڈیٹر ماہنامہ الحمراء لاہور بھی یوں رقمطراز ہیں:۔

> ''آغا گل بلوچستان کا اوّلین ناول نگار ہے۔ اس نے افسانہ بھی اپنے ہی انداز کا لکھا۔ ریجنل ازم (Regionalism) اور لوکیل (Locale) اس کی پہچان ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ انسانوں کی پسند و ناپسند بدلتی رہتی ہے۔ کسی مارکیٹ ڈیمانڈ پر لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسی سبب اس نے ٹیلی ویژن کے لیے کبھی نہیں لکھا کیونکہ وہ پابندیوں کے خلاف ہیں۔''

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

بلوچستان کے بارے میں خود مصنف فرماتے ہیں:۔

''بلوچستان میں انسان تھوڑے سے ہیں، پتھروں کی آبادی بہت بڑی ہے۔اس شہر خداساز میں جنون کی دعا سے بت اتنے زیادہ ہیں کہ پتھر نہیں ملتے۔ میں اسی اقلیت کو ایک مسکراہٹ دینا چاہتا ہوں جسے عرف عام میں انسان کہا جاتا ہیں۔''

یہاں پر میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ آغا گل اپنے علاقائی کلچر اور تہذیب کے نمائندہ سفیر ہیں مگر اس کو علاقائیت (Regionalism) سے تعبیر دینا صحیح نہیں رہے گا کیونکہ اس لفظ میں بذاۃ منفی پہلو جلوہ گر ہے جبکہ آغا گل نہ تو علاقائی عصبیت کے شیدائی ہیں اور نہ ہی علاحدگی پسند ہیں۔ان کا رویہ مثبت ہے اور ان کی کوشش یہی رہتی ہے کہ بلوچستان جیسے دور دراز علاقے کی پسماندگی پر آقاؤں اور قارئین کی توجہ مبذول کرائیں۔

زیر نظر مجموعے میں تیرہ افسانے شامل ہیں جن میں سے اکثر و بیشتر ڈاک محکمے اور ڈاک ملازمین سے تعلق رکھتے ہیں جیسے ڈریکولا، انقلاب، ڈاک پہ ڈاکہ، ڈاک اور حجامت، بوانٹو اور گوانکو۔افسانہ نگار نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ڈاک محکمے میں گزارا ہے اس لیے یہ محکمہ ان کی سانسوں میں رچا بسا ہے۔ان افسانوں کو پڑھ کر مجھے اپنے یہاں کے ڈاک محکمے کی یاد آتی رہی۔نام اور مقامات بدل دیے جائیں تو ایسے لگے گا جیسے ہندوستانی ڈاک خانوں کی بات ہو رہی ہے۔آخر کیوں نہ ہو، دونوں ایک ہی نوآبادیاتی نظام کی دین ہیں، دونوں کے طور طریق یکساں ہیں اور دونوں میں رائج قوانین بھی یکساں ہیں۔آزادی کے بعد کئی تبدیلیاں لانے کی کوشش کی گئیں مگر یہ محض لیپا پوتی (Cosmetic Changes) تک محدود رہیں، بنیادی ڈھانچہ آج بھی جوں کا توں کھڑا ہے۔اس حوالے سے چند اقتباسات حاضر خدمت ہیں:۔

- دراصل بندوق خالی تھی۔یہ ڈاکخانے کی پرانی بندوق ہے کبھی کبھار خود ہی چل پڑتی تھی۔اس لیے ڈیوٹی پر خالی بندوق دی جاتی ہے۔ (ڈریکولا ص ۳۹)
- کتنے انقلاب آئے، مرہٹے، مغل، فرانسیسی، انگریز، کتنے حاکم بدلے مگر ڈاکخانہ کا بلند معیار قائم رہا۔صدیوں کے عمل میں حسن کارکردگی برقرار رکھنا ہر ایرے غیرے کے بس کی بات کہاں۔ (انقلاب ص ۵۱)
- ڈاکخانہ بھی اپنی جسامت سے کہیں بڑی یونینز کا بوجھ اٹھائے پھرتا ہے۔ (انقلاب ص ۶۳)

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

- ''ہم خدمت دیانت امانت والے لوگ ہیں۔ادھار پر چلتے ہیں۔سوائے بیوی بچوں کے ہمارا اپنا کچھ بھی نہیں ہوتا'' ڈپٹی پر مکمل ڈاک خانیت طاری ہو چکی تھی۔

(ڈریکولا ص ۳۶)

- کیا بتائیں جناب! عوام بھی ہمیں ہی ستاتے ہیں۔دن بھر گمشدہ منی آرڈر، پارسل، انشیور ڈ لیٹر تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ناک میں دم کر رکھا ہے کم بختوں نے۔سمجھ نہیں آتا یہ سب کچھ جاتا کہاں ہے۔ہم تو ٹھیک ٹھاک بھجوا دیتے ہیں۔بکنگ بھی ٹھیک ہوتی ہے۔ (ڈریکولا ص ۳۵)

- آپ کا چپڑاسی کہہ رہا تھا کہ آپ میٹنگ کر رہے ہیں۔اندر آنے نہیں دے رہا تھا۔ آپ کیا اس چائے کے کپ سے میٹنگ کر رہے تھے۔ (انقلاب ۵۳)

محولا بالا اقتباسات سے صاف ظاہر ہے کہ افسانہ نگار نے ڈاک خانوں کے ماحول اور کارکردگی کو جابہ جا منظر نگاری کے لیے یا پھر بطور تشبیہ استعمال کیا ہے۔موصوف کی تشبیہات نادر اور معنی خیز ہوتی ہیں اور اپنے اندر دریا سمیٹے رہتی ہیں۔چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں:۔

- ایک روز منظور کی میل لائین بند ہو گئی۔اور ڈیڈ لیٹر آفس کی نذر ہو گیا۔اس صدمے سے بیوی بھی دم توڑ گئی۔دولت اب بیرنگ لفافے کی طرح ادھر ادھر گھومتا پھرتا۔اسے یوں محسوس ہوتا کہ وہ ایک مس سینٹ Missent میل بیگ ہے جس کا لیبل کہیں گر چکا ہے۔ زندگی کے میل وان میں گمنام چلا جا رہا ہے۔جانے منزل کہاں ہے۔ (بوانٹو ص ۱۳۰)

- اتنے برسوں میں بھی وہ کسی فارن بیگ کی طرح چمک دمک رہی تھی۔

(بوانٹو ص ۱۳۲)

- اس کی تمام ہمدردیاں صائمہ کے شوہر افضل سے وابستہ ہو چکی تھیں۔راتوں رات ایس او اکاونٹ کی کاپیاں بدلی گئیں۔ہیڈ آفس سمری کے صفحات نکال کر دوبارہ لکھے گئے اور جب رات کے دو بجے تو افضل معصوم و بے گناہ ثابت ہو چکا تھا۔پوسٹ ماسٹر سب اکاونٹ جو دولت کا وفادار تھا ہی اب اور بھی مقبول ٹھہرا۔ (بوانٹو ص ۱۳۲)

- ان محبتوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ لاکھوں روپے خزانے سے چٹوں پہ نکلے جا رہے تھے۔ دیگر ڈاکخانے سب اکاونٹ کو کیش نہیں بھجوا رہے تھے۔پی ٹی میں گھپلے ہو رہے تھے۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

بیت المال کی رقم انگوٹھے لگا لگا کر خود ہی کھا رہے تھے۔ ایک محکمانہ ٹیم آئی تو اس نے رپورٹ دی کہ ممبا ڈاکخانے کا علی بابا ہے جس کے چالیس چور ڈاکخانہ چلا رہے ہیں۔

- گھر اجاڑ پڑا تھا جیسے تمام پوسٹ مین ڈیلیوری بیٹوں پر نکل چکے ہوں اور ہال ویران پڑا ہو۔ (بوانٹو ۱۳۶)
- بیوی کا پیٹ ڈیلیوری آفس بن چکا تھا، ہر برس ذمہ داری کا نیا پارسل بیگ ڈلیور ہو جایا کرتا۔ (گوانکو ۱۴۰)
- سرکاری ملازمین کی حاضری دن میں صرف ایک بار لگتی ہے حالانکہ پانچ نمازوں کی طرح ان پر پانچ وقت حاضری لگانے کی پابندی بھی ضروری ہے۔ (گوانکو ۱۴۰)

افسانہ 'ڈریکولا' میں ایک دور دراز ہیڈ پوسٹ آفس کے ملازمین ہر نئے آنے والے پوسٹ ماسٹر کو 'ڈریکولا' کا حوالہ دے کر اور اس کے بارے میں من گھڑت قصے سنا کر اتنا خوف زدہ کر دیتے تھے کہ وہ جلدی ہی اپنی ٹرانسفر کرا لیتا اور مقامی ملازمین عیش کی زندگی گزار لیتے البتہ راوی اس چال کو سمجھ جاتا ہے اور ان کا بھانڈا پھوڑنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

'انقلاب' میں افسانہ نگار نے ڈاکخانے کے منتظمین اور ملازمین کی ذہنیت پر بھرپور وار کیا ہے کہ کنڈیشننگ (Conditioning) کے باعث ان پر بدبودار اور غلیظ ماحول کا کوئی منفی اثر نہیں ہوتا۔ بہر حال ڈاکخانے کی ایک صارفی خاتون پوسٹ ماسٹر سے درخواست کرتی ہے کہ وہ ڈاکخانے کی بدبو اور سڑاند کا تدارک کرے۔ صفائی کی عمل آوری کے چکر میں پوسٹ ماسٹر اپنے سٹاف اور یونین لیڈروں کے عتاب کا شکار ہو جاتا ہے اور نتیجے میں یوں تائب ہو جاتا ہے:

''آپ آئندہ کسی لیڈی کمپلینٹس (Complainants) سے نہیں ملیں گے۔''

''آج کے ہنگامے میں زندہ بچا تو نہیں ملوں گا۔''

میل رُوٹس (Mail Routes) پر کنٹریکٹروں کی اجارہ داری ختم کرنا دل گردے کا کام ہوتا ہے خاص کر دور دراز اور قبائلی علاقوں میں جہاں کنٹریکٹر میل لانے اور لے جانے کو اپنی برتری کی علامت گردانتے ہیں۔ افسانہ 'ڈاک پہ ڈاکہ' میں پی ایم جی (پوسٹ ماسٹر جنرل) کی شہ پا کر جب راوی میل کنٹریکٹر بدلنے کی کوشش کرتا ہے تو دو کنٹریکٹر، جو آپس میں چاچا بھتیجا ہوتے ہیں، ایک دوسرے سے گتھ جاتے ہیں، گولیاں چلتی ہیں، پولیس میں معاملہ درج ہوتا ہے اور ڈاک کا نظام کئی روز درہم برہم رہتا ہے۔ آخر کار ثالث فریقین کو باہمی

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

مفاہمت پر راضی کرواتا ہے اور ان کے درمیان مساوی بانٹ کی جاتی ہے۔ اس طرح بلوچستان میں پھر سے ڈاک تقسیم ہونے لگتی ہے۔

'ڈاک اور حجامت' کہانی ہے ایک پوسٹ ماسٹر کی تقلیب ماہیت کی۔ چنانچہ اسے بندوق کی زور پر ڈاک خانہ چلانے کے بجائے حجام کا کام کرنا پڑتا ہے اور بعد میں وہ اس پیشے کو نفع بخش پا کر اپنے افسر کو بھی مشورہ دیتا ہے کہ وہ پہاڑوں اور بیابانوں میں مارے مارے پھرنے کے بدلے کوئٹہ میں بڑا سیلون کھول دے۔

'بوانٹو' ایک حرامی بچے دولت کی داستان ہے جو ڈاک محکمے میں ایک ادنیٰ ملازم سے پوسٹ ماسٹر بن جاتا ہے۔ نااہل ہونے کے باعث وہ اپنے ماتحتوں پر انحصار کرتا ہے، ان کی چکنی چپڑی باتوں میں آ کر کئی بار رقوم کی خرد برد میں ملوث پایا جاتا ہے اور انجام کار اُسے یہ احساس ہوتا ہے کہ لوگ اس کی نہیں بلکہ اس کی کرسی کی تعظیم کرتے تھے چنانچہ اپنے بعد آنے والے پوسٹ ماسٹر کو تنبیہ کرتا ہے:۔

> ''آپ کو نہیں! اس کرسی کو سلام پیش کرنے چلا آیا۔ دو ٹانگوں والے انسان سے یہ چار ٹانگوں والی کرسی کس قدر طاقتور ہے۔ بیٹھئے! کرسی سے اٹھانہ کیجئے ورنہ آپ کا بوانٹو * گر جائے گا۔''

افسانہ 'گوانکو' میں ماں سے بھوت پریت کی کہانیاں سن کر بچپن سے ڈرا سہما ہوا سلیمان جب ڈاکخانے میں افسر بن جاتا ہے تو وہاں بھی اسے یہ عفریت پریشاں کرتے رہتے ہیں۔ اسے اپنے حاکم، ماتحت اور پبلک سبھی لوگ عفریت نظر آ رہے تھے۔ ایک ملازم کو جو آفس میں حاضری لگا کر دن بھر غائب رہتا ہے اور بسوں میں منجن بیچتا ہے، رنگے ہاتھوں پکڑوانے کے لیے وہ طرح طرح کے ہتھکنڈے آزماتا ہے مگر 'چراغ تلے اندھیرا' کو پکڑ نہیں پاتا۔ آخر کار وہ اور ایک مقامی تھانیدار دونوں چراغ کو پکڑ ہی لیتے ہیں مگر چراغ دونوں سے یوں مخاطب ہوتا ہے۔

> ''اگر آپ سرپرستی فرمائیں تو منجن کا کارخانہ لگا لیں، سریاب کی بسوں تک محدود رہنے کی بجائے پورے ملک میں مارکٹنگ کریں۔ ہمارے لوگ صرف آنکھیں ہی نہیں بلکہ دانت بھی استعمال کرتے ہیں۔ ہمارا منجن لکڑ ہضم پتھر ہضم کی ضمانت دیتا ہے۔ گستاخی معاف پہلے تھانوں پر ہن برسا کرتا۔ اب تو NAB یک ٹانگی کی طرح اچک لیتا ہے تھانیداروں کو۔''

---

* بوانٹو۔ براہوی لوک کہانیوں کا غیر مرئی کردار۔ اس کی ناک نہیں ہوتی۔ سوئے انسان کی چھاتی پر بیٹھ کر اسے بے بس کر دیتا ہے۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

گوانکو میں جن بھوتوں کا ذکر ہوا ہے وہ نہ صرف بھوت ہیں بلکہ سماجی اور سیاسی معنویت بھی رکھتے ہیں۔اس ضمن میں یہ مکالمہ ملاحظہ ہو:

''سب سے بڑا' گوانکو' روپیہ ہے۔ جسے پکارتا ہے وہ گونگا ہو جاتا ہے۔اس کی زبان بند ہو جاتی ہے۔''

ان پریتوں پر ابتدائی پیراگرافوں میں روشنی ڈالی گئی ہے۔اس کے علاوہ برصغیر میں مذہب کے نام پر جو سیاسی اور سماجی استحصال ہو رہا ہے اس کی طرف بھی افسانہ نگار نے اشارہ کیا ہے۔اس حوالے سے سلیمان اپنے ملازم چراغ سے یہ کہتا ہے کہ ''استنجا کر رہے تھے یا گھوڑے دھو رہے تھے''۔ چراغ یوں جواب دیتا ہے۔''آپ میرے عقیدے میں حائل ہو رہے ہیں۔'' ساتھ ہی وہ افسر کی توجہ اس طرف بھی مبذول کرتا ہے کہ اس جرم کی سزا سات برس قید با مشقت ہے۔

کردار سازی بھی آغا گل کا مخصوص ہنر ہے۔وہ اپنے کرداروں کو صحیح معنوں میں پیش کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ان کرداروں میں مثبت اور منفی دونوں پہلو جلوہ گر ہوتے ہیں۔مثال کے لیے افسانہ انقلاب میں پوسٹ ماسٹر کا تصوراتی کردار یوں پیش کیا گیا ہے:

''میرا خیال تھا کہ مخچو سا، منحنی سا دبلا پتلا بدحواس سا بوڑھا آدمی، موٹی سی عینک پہنے براجمان ہوگا۔بدن پر مسکی ہوئی شیروانی ہوگی۔داڑھی کہیں سے سرخ، کہیں سے سفید کہیں سے کالی.....! آپ ڈاک خانے میں کیسے آئے۔''

ڈاک خانے کی زندگی سے ہٹ کر بھی اس مجموعے میں کئی عمدہ افسانے ہیں۔پہلا افسانہ 'فدوا' ایک جاہل گنوار آدمی کی کہانی ہے جو معاشقوں اور جوئے کی وجہ سے بدنام ہوتا ہے پھر بھی بلوچستان جیسے فراموش علاقے میں ترقی کے زینے طے کرتا چلا جاتا ہے۔فدوا کا کردار سرشار کے خوبی کی یاد دلاتا ہے۔وہ اتنا ہنساتا ہے کہ بلڈ پریشر ٹھیک ہو جاتا ہے، اکثر جوا کھیلتا ہے، بکریاں چراتا ہے اور فرضی مسجدوں کے لیے چندہ وصول کرتا ہے۔ ہر آنے جانے والی عورت پر ڈورے ڈالتا ہے گو عورتیں اسے خالی بندوق کی طرح بے ضرر سمجھتی ہیں۔اس افسانے میں بلوچستان کی حالتِ زار پر بھی کئی تبصرے کیے گئے ہیں۔افسانہ نگار نے فوجی حکومتوں کی طرز حکومت، ویجی لنس کارروائیوں اور شجاعت پر کئی جگہ طنز کے نشتر چلائے ہیں۔

- خوش قسمتی سے مرکزی حکومت کو اچانک الہام ہوا کہ بلوچستان میں جہالت بہت ہے۔سکول نہیں ہیں نہ ہی تعلیم ہے۔چونکہ یہ انکشاف پچیس تیس برس بعد اچانک ہوا تھا

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

لہٰذا احکامات جاری ہوئے کہ دھڑا دھڑ ٹیچر بھرتی کر لیے جائیں۔ چونکہ ٹیچر مل نہیں رہے تھے، شرائط ملازمت میں نرمی کر دی گئی۔

- ملک کا نظام چلانا بہت مشکل ہے۔ فوج جب تھک جاتی ہے نظام چلاتے ہوئے تو چند دنوں کے لیے حقی چھٹی (Furlough) پر چلی جاتی ہے۔ مگر نہایت مستعد ہے، فوراً لبیک کہہ کر دوبارہ ملک کا نظم ونسق سنبھال لیتی ہے۔
- فدوا جانتا تھا کہ فوج ہر چلتی پھرتی چیز کو سلوٹ کرتی ہے اور ہر ٹھہری ہوئی ساکت چیز پر چونا پھیرتی ہے۔ چیزوں پر چونا پھیرنا فوج کی روایت ہے۔ چونکہ فوج چونا لگاتی ہے۔ فدوا نے بھی طلباء سے چندہ جمع کر کے دیواروں پر چونا پھروا دیا۔ کچھ رقم اپنے استعمال بھی لایا کہ چائے پانی کا خرچہ بھی درکار ہے۔
- ۱۹۷۱ء میں فوج نے جو دادِ شجاعت دی تھی۔ اس کی تفصیلات بیان کر رہا ہے۔ تختۂ سیاہ پر چاک سے بڑے بڑے لفظوں میں تحریر تھا۔ 'پاک فوج کو سلام'
- فدوا کی آواز بھر آ گئی۔ ''یہ بچے ہمارا مستقبل ہیں۔ یہ بن جائیں۔ انہوں نے ہی تو کشمیر آزاد کرانا ہے۔''

مگر یہ تو بہت چھوٹے ہیں، کب جوان ہوں گے کب آزاد کریں گے۔

- آپ سوچیں۔ جب جنرل سے صدر بنا جا سکتا ہے تو حوالدار سے جنرل کیوں نہیں بنا جا سکتا ہے۔ آپ ذرا دماغ لڑائیں۔ کچھ سوچیں۔

'رموز زبان' کا راوی اپنے ایک جانکار سلیمان کے، جو پرنسپل مسز خان کی جائیداد کو ہتھیانے کے لیے اس کی لڑکی کو پھنسا لیتا ہے اور اس کے سکول میں بھی کام کرتا ہے، توسل سے سکول میں اردو پڑھانے کا کام سنبھالتا ہے۔ اردو کا علم نہ ہونے کے باعث وہ دفتری اوقات کے بعد ایک اردو معلم رنجور سے اردو سیکھنے کی کوشش کرتا ہے مگر مسز خانم اس کی زبان دانی سے خوش نہیں ہوتی۔ حد تو تب ہوتی ہے جب عورتوں کے سال۔ ۲۰۰۲ء کے لیے تقریری مقابلے کا بندوبست اس کو سونپا جاتا ہے اور وہ شاعرانہ انداز میں 'دیکھ عورت کا مقام خاص دیکھ' جیسا بینر بنوا کر مسز خان کو شرمسار کر دیتا ہے۔ اس افسانے میں آج کل کے اردو داں اور اردو نواز طبقے پر بھرپور طنز کیا گیا ہے۔ ایک اقتباس:۔

- ''کیا کروں'' استاد بے بسی سے بولے۔ ''کوئی براہوی میں اردو بولتا ہے، کوئی

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

بلوچی میں اردو بولتا ہے، بڑی کوفت ہوتی ہے۔''

'کوئٹہ میں ہاتھی' پڑھ کر مجھے ایک کشمیری قصے کی یاد آئی جو سر والٹر لارنس نے ویلی آف کشمیر میں بیان کیا ہے۔ کشمیری لوگ افواہیں پھیلانے اور ان سے متاثر ہونے میں ماہر ہیں۔ کوئی شخص اگر صرف یہ کہتے ہوئے بھاگتا رہے ''گیہ ہو، گیہ ہو.....'' (ہو گیا.....ہو گیا) تو لوگ جوق در جوق اس کے پیچھے بنا کچھ کہے سنے بھاگنے لگتے ہیں۔ آخر کار بہت راستہ طے کر کے اگر کوئی اسے روکنے میں کامیاب ہو جائے اور پوچھ بیٹھے کہ ''بھائی، یہ تو بتاؤ کہ ہوا کیا؟'' تو جواب ملے گا کہ زینہ کدل (پل) سے کسی نے جہلم دریا میں تھوک گرادی اور وہ بہہ گئی۔ اسی طرح کوئٹہ جیسے دور افتادہ علاقے میں جب کبھی سرکس (Circus) والے یا ہاتھی آجاتے ہیں تو لوگوں کی دلچسپی کا مرکز بن جاتے ہیں اور وہ جوق در جوق انہیں دیکھنے چلے آتے ہیں۔ ایسی جگہ میں جہاں معصوم اور جلدی یقین کرنے والے لوگ رہتے ہیں جب یہ خبر پھیل جاتی ہے کہ ہاتھی نے کسی گونگے کا بچہ کھالیا اور گونگا بے چارہ اشاروں سے واویلا مچا رہا ہے، ماحول میں چہار سو دہشت پھیل جاتی ہے۔ کوئی یہ ماننے کو تیار نہیں ہوتا کہ ہاتھی سبزی خور جانور ہے گوشت خور نہیں، مار سکتا ہے مگر کھا نہیں سکتا۔ پولیس بھی حرکت میں آجاتی ہے اور نہ صرف ہاتھی بلکہ سرکس کے مالک کو بھی موردِ الزام ٹھہراتی ہے۔ شکر ہے کہ آخر کار شیر کے پنجرے کے باہر بچہ تماشا دیکھتے ہوئے مل جاتا ہے اور معاملہ رفع دفع ہو جاتا ہے۔ لوگوں کی غیر منطقی ذہنیت کو بڑے خوبصورت طریقے سے درشایا گیا ہے۔ اس افسانے میں بھی چند ایک جگہوں پر طنزیہ پیرائے میں موجودہ نظام پر اظہار خیال کیا گیا ہے:۔

- کوئٹہ کی بہار بھی سردیوں کی چاندنی اور غریب کی جوانی کی طرح چپکے سے گزر جاتی ہے۔ مارچ میں آتی ہے اور اپریل کے دوسرے ہفتے کسی سیاسی حکومت کی طرح چپکے سے منہ لپیٹ کر چلی جاتی ہے۔
- ہاتھی، شیر یا صدر پاکستان کبھی کبھار آیا کرتے تو لوگ بڑی دلچسپی سے انہیں دیکھتے، تالیاں پیٹتے۔

'غیرتی' کہانی ہے ایک ایسے نوجوان کی جو عشقیہ شادی (Love Marriage) کرتا ہے لیکن بعد میں اسی بیوی پر شبہ کرنے لگتا ہے اور اسے قتل کر دیتا ہے۔ اس کے بعد خود جیل میں بے عزتی اور اہانت سے سمجھوتا کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس افسانے سے طنزیہ اقتباس ملاحظہ کریں:

- تھا تو وہ کمپاونڈر ہی۔ مگر کسی ڈاکٹر کو ٹکنے نہ دیتا۔ برس ہا برس وہی جیل کا ڈاکٹر رہا۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ایسا مشہور ہوا ڈاکٹر کے نام سے کہ خود کو ڈاکٹر ہی سمجھنے لگا تھا۔

اسی طرح 'مجاہد اعظم' ایک لڑکے نیکو کی کہانی ہے جو اتفاق سے مسجد سے جوتیاں چرانے میں کامیاب ہوتا ہے مگر شوکت، جس کو یہ ہنر وراثت میں ملا تھا اور پہلے ہی سے اس میدان میں سرگرم عمل ہے، اسے اپنا حریف سمجھ کر چالاکی سے لوگوں کے سامنے کھڑا کر دیتا ہے اور اس کے پائینچوں سے جوتیاں برآمد کرتا ہے۔ نتیجتاً وہ اپنی پارسائی کا ثبوت دے کر 'مجاہد اعظم' کہلاتا ہے اور اس کے سر پر لوگ وہ نوٹ نچھاور کرتے ہیں جن پر پاکستان کا تصور کرنے والے قائد اعظم کی تصویر بنی ہوتی ہے۔ کہانی یکسر طنز ہے موجودہ دور پر جہاں کمینے لوگ اپنی عیاری کے سبب بڑے بڑے عہدے اور لقب پانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ چند اقتباسات:

- نیکو کو بوٹوں کی پڑی تھی۔ ''جنت کے محل سے پہلے تم یہاں کوئی جھگی کھولی کیوں نہیں بنا لیتے۔''
- نیکو بھائی! یہ ٹوپیاں یہ تسبیاں چین والے بناتے ہیں۔ ہم عرب جا کر کہتے ہیں عرب کی ٹوپی، عرب کی تسبیح اور خوب مہنگے داموں خرید کے تبرکاً ساتھ لے آتے ہیں۔ عرب تو ماچس تک نہیں بنا سکتے۔ یہ ٹوپی وہ کیسے بنا سکتے ہیں۔''

'محلہ بلیماراں' ایک ہلکی پھلکی مگر معنی خیز کہانی ہے۔ جلال، جو سائنسداں قسم کا آدمی ہوتا ہے، کے گھر میں یا تو اس کی ماں پلتی ہے یا پھر اس کی بلی جسے وہ ہر دم اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ البتہ ماں اس بلی کو کمینی، لالچی، کم ظرف، بدخصلت اور منحوس سمجھ کر اس کو ایسی جگہ بھجوانے کی سبیلیں کرتی ہے جہاں سے وہ واپس اس کے مکان میں نہ آ سکے۔ وہ جلال کے ایک دوست سے التجا کرتی ہے کہ اس بلی کو بلیماراں محلے میں لے جا کر اس کا کام تمام کر دے۔ چنانچہ وہ دوست پولیس سے بچ بچا کر بلی کو گورنر ہاؤس سے پرے ایک جگہ پر چھوڑ آتا ہے اور وہ پھر کبھی واپس نہیں آتی۔ افسانے میں سے چند طنزیہ اقتباسات:

- عورتوں کو تو سبھی مارتے ہیں، بلیوں پر کوئی ہاتھ نہیں اٹھاتا۔ کاش میں بھی بلی ہوتی۔
- جب غیر مقامی گورنر اس ہاؤس سے نہیں نکلتے تو مقامی بلی بھلا کیوں باہر آ جائے۔ میکدہ ہے یہاں سکون سے بیٹھ۔

افسانہ 'فولادی بھگوان' طنز ہے ان لوگوں پر جو بے تحاشہ اسلحہ بارود پر قومی سرمایہ خرچ کرتے ہیں جبکہ اپنے قوم کے باشندوں کو بنیادی ضروریات بھی فراہم نہیں کر پاتے۔ اس ضمن میں جب ایک ایم بی اے

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

(فنانس) بے روزگار بنوا ایک ہندو دکاندار سے پوچھتا ہے تو جواب ملتا ہے۔ ''پانی والے بھگوان تو چلے گئے۔ تم فولادی بھگوان کے ساتھ ساتھ رہتے ہو۔ فولادی بھگوان کا دل نہیں ہوتا۔ جیسے بندوق کی گولی اور چھری کی آنکھ نہیں ہوتی۔''

یہ وہی پکوڑے بیچنے والا دکاندار ہوتا ہے جس کو ہندوستان میں بابری مسجد گرائے جانے کی پاداش میں مسلمان بلوائیوں کے ہاتھوں اپنے بیٹے سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ افسانہ نگار نے دکاندار کی نفسیاتی کشمکش کو اس طرح بیان کیا ہے:

''رامو کرم سنیاس کر کے پکوڑے بیچنے لگا۔ پکوڑے تیل میں ڈالتے ہوئے شاید وہ سوچتا کہ اس کے بیٹے کے قاتل تیل میں تلے جا رہے ہیں۔''

آغا گل کا یہ افسانہ مجھے تسلیمہ نسرین کی ناول 'لجا' کی یاد دلاتا رہا جس میں بابری مسجد کے سانحے کے بعد بنگلہ دیس میں واقع بے شمار مندروں کی بے حرمتی اور نہتے ہندوؤں پر ہوئے اتیاچار کو بے باکانہ طور پر منعکس کیا گیا ہے۔ ایک سچا فنکار جہاں بابری مسجد کے سانحہ کی پرزور مذمت کرتا ہے وہیں ایسے حادثوں پر بھی احتجاج کرنے کا حق رکھتا ہے۔ ایسے معاشرے کا خاکہ، جہاں حاکم اور مذہبی رہنماؤں کی ملی بھگت ہوتی ہے اور دونوں ایک دوسرے کو برسر اقتدار رکھنے کی کوشش کرتے ہیں، افسانہ نگار نے مندرجہ ذیل الفاظ میں کھینچا ہے:

- مولوی کا غصہ کم ہوا۔ وہ یوں گویا ہوا۔ ''مسلمانوں، تم دنیا کے شہزادے ہو۔ اپنا مقام پہچانو، کافر جہاز بناتے ہیں، کاریں بناتے ہیں، تم ان میں گھومتے پھرتے ہو، وہ تو تمہارے لوہار ہیں۔ وہ بندوقیں اور توپیں بنا کر دیتے ہیں۔ کبھی سنا ہے کہ انہوں نے اپنے ملکوں میں وہ ہتھیار چلائے ہوں۔ تمہارے مزدور وہ کافر ہیں جو اسلحہ تمہیں دیتے ہیں، جن سے تم جہاد کرتے ہو۔''

اس افسانے کا اختتام بھی بہت ہی فکر انگیز ہے:

- ٹینک والے نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ ٹینک انسانوں کو مار سکتا ہے، گاؤں برباد کر سکتا ہے، سکولوں کے پرخچے اڑا سکتا ہے مگر پانی نہیں نکال سکتا۔''

مجموعی طور پر آغا گل کے افسانوں کی چیدہ چیدہ خصوصیات کا خلاصہ یوں کیا جا سکتا ہے:

- ان کے افسانوں میں طنز کی زیریں لہر سمندر کے باطن میں اٹھ رہی سرد و گرم لہروں

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

کی طرح رواں دواں ہے۔

- وہ مقصدی ادب کے قائل ہیں اور اپنے معاشرے پر کڑی نظر رکھتے ہیں خصوصاً سماجی اور سیاسی پہلوؤں پر۔ انہوں نے نہ صرف سول حکومتوں بلکہ فوجی حکومتوں کی کارکردگی کو بھی اپنی بے لاگ طنز کا نشانہ بنایا ہے۔
- انہوں نے اساطیری کرداروں کو اپنے افسانوں میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے اور ان کو نئے اور جامع معنی سے نوازا ہے۔
- ان کی زبان سادہ، سلیس اور شفاف ہے جس میں مقامی الفاظ کو یوں برتا گیا ہے جیسے وہ اسی زبان کا حصہ ہوں۔

مجھے یقین کامل ہے کہ آغا گل نہ صرف فکشن کے میدان میں بلکہ طنز و مزاح کے میدان میں بھی اپنی انفرادی مہر ثبت کرنے میں کامیاب ہوں گے۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

آفاق احمد کی تخلیقی دُنیا

پروفیسر آفاق احمد سے میری پہلی ملاقات چند برس پہلے بھوپال میں ہوئی تھی۔ وہ اپنی اہلیہ کے ہمراہ گیسٹ ہاوس میں آئے تھے۔ اردو ادب اور بھوپال کے بارے میں بہت دیر تک تبادلہ خیال ہوتا رہا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی پانچ کتابیں، 'پرشور خاموشی'۔ (افسانوی مجموعہ) 'امانتِ قلب ونظر' (مضامین کا مجموعہ)، پریم چند شناسی، مجلس اقبال اور داستانِ سفر جن میں مختلف ادیبوں کے مضامین یکجا کیے گئے ہیں، پیش کیں۔ اس کی شرافت، حلیمی اور خلوص نے میرے دل ودماغ پر مستقل نقش چھوڑ دیا۔ ان کے بارے میں عزیز قریشی 'امانت قلب ونظر' کے دیباچے میں یوں رقم طراز ہیں: ''پروفیسر آفاق احمد انتہائی ذہین، خوش شکل اور ہنرمند شخصیات میں سے ہیں جن کی ہنرمندی اور خوبصورتی کے قصے لڑکپن ہی سے زبان زد خاص وعام ہیں اور اسکول کے زمانے ہی سے ان کا شمار مستند ادیبوں کی فہرست میں ہونے لگا۔'' اظہار خیال کے لیے انہوں نے نثر نگاری کو وسیلہ بنایا جبکہ انداز تحریر کے لیے کلاسیکی روایت کو اپنایا۔ آفاق احمد ترقی پسند فکر ونظریے سے بھی جڑے رہے۔ انہوں نے کئی طالب علموں کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری لینے کے لیے رہنمائی بھی کی۔ موصوف کی پہلی کہانی 'ہائے وہ لڑکپن: بے فکرالہڑ' کے نام سے شائع ہوئی تھی جبکہ آخری کہانی 'کتنی ساری سوچوں کے بعد' کے نام سے چھپی جس کے بعد انہوں نے افسانے رقم کرنا چھوڑ دیا۔ اوپر درج کی گئی کتابیں مدھیہ پردیش اردو اکادمی بھوپال نے شائع کی ہیں۔

افسانوں کا مجموعہ 'پرشور خاموشی' ۱۹۹۱ء میں پہلی بار منظر عام پر آیا جس میں پروفیسر آفاق احمد کی کئی

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

دہائیوں کے دوران لکھی ہوئی کہانیوں میں سے آٹھ کہانیوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ مجموعے کا پہلا افسانہ 'پرشور خاموشی' ہے جس میں پہاڑوں کی سیاحت پر نکلی ایک ادھیڑ عمر کی عورت اپنے پتی کو ہوٹل میں ہی چھوڑ کر نوجوان گائیڈ کے ساتھ ٹریکنگ Trekking پر نکل جاتی ہے اور اپنی زندگی کی ویرانیوں میں رنگ بھرنے کے لیے اس کو ترغیب دیتی رہتی ہے۔ افسانے کی خوبی یہ ہے کہ اس میں علامتی انداز میں جنسی ناآسودگی کو درشایا گیا ہے مگر کہیں پر بھی کھل کر جذبات یا شہوت انگیز الفاظ کا استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ دوسرا افسانہ 'سوسن کا پھول' ہے جس میں سوسن کو بطور علامیہ پیش کیا گیا ہے کیونکہ گلشن میں سوسن باقی سبھی پھولوں کے لیے دلبستگی کا مرکز تصور کیا جاتا ہے۔ اس افسانے میں ایک لڑکا اپنی گرل فرینڈ کو، جسے اب وہ صرف 'دوست' کہہ کر مخاطب ہوتا ہے، آخر کار خط لکھ کر اسے دامن چھڑانے کی کوشش کرتا ہے حالانکہ اسی لڑکی نے اس میں اعلیٰ ہمتی اور اعلیٰ نصبی کی نشانیاں ڈھونڈی ہوتی ہیں۔ افسانہ نگار خط لکھنے والے کی مجبوریوں سے آگاہ نہیں کرتا ہے جس میں روزگار کی پریشانیاں، سماجی رسم و رواج یا پھر دولت کی لالچ ہو سکتی ہے مگر اس کی محبوبہ یہ سمجھتی ہے کہ شاید اسے کسی اور سے محبت ہو چکی ہے اس لیے وہ ان کے بیچ میں نہیں آنا چاہتی ہے۔ افسانہ 'پلکوں کا بوجھ' طویل رومانی افسانہ ہے جس میں نجم نہ صرف جسمانی طور پر بلکہ دماغی طور پر بھی تندرست و توانا ہوتا ہے۔ وہ پڑھنے لکھنے اور تقریر کرنے میں ویسے ہی مہارت رکھتا ہے جیسے کہ کھیل کود میں۔ حالانکہ نیلو ابتدا میں اس کو نظر انداز کرتی ہے مگر ہاکی کے میدان اور پھر ڈبیٹ میں اس کے کرتب دیکھ کر اس پر فریفتہ ہوتی ہے۔ البتہ وہ مارے شرم و جھجھک کے محبت کا اظہار نہیں کر پاتی۔ اس مشکل کو دور کرنے میں نجم کی منہ بولی بہن منی، جس کے ساتھ ماضی میں ایسا ہی واقعہ گزرا ہوتا ہے، نیلو کو نجم کے سامنے پیار کا اظہار کرنے کے لیے اُکساتی ہے۔ نتیجے میں دونوں پیار کے بندھن میں بندھ جاتے ہیں۔ 'تصویر درد کیا جانے' ایک معصوم لڑکی ارچنا کی کہانی ہے جو اپنے پتا جی کے کیے ہوئے وعدے کو اپنے پیار پر ترجیح دیتی ہے، شکی مزاج بمل سے شادی کرتی ہے لیکن ہر روز اسے پٹتی ہے۔ آخر کار ایک پھیری والے کی باتوں میں آ کر فرار کا راستہ ڈھونڈ نکالتی ہے اور ٹاٹ والے بابا کے ہاں شرن لیتی ہے جہاں سے پولیس اس کو پکڑ کر لے جاتی ہے۔ وہ دونوں جگہ عصمت دری کا شکار ہوتی رہتی ہے جب تک کہ وہ موت سے ہم آغوش نہیں ہوتی۔ یہ کہانی خطوط پر مبنی ہے جو مختلف اشخاص ایک دوسرے کو لکھتے ہیں اور سبھی مرکزی خیال کو آگے بڑھانے میں مدد کرتے ہیں۔ یہ طرز بیاں کسی زمانے میں افسانوی اسلوب کا فیشن بن چکا تھا۔ 'بیوپاری چلے گئے' تقسیم ہند سے وابستہ ہے۔ افسانے میں گردش اپنی خوبصورت محبوبہ شاہینہ سے بہت پیار کرتا ہے مگر تقسیم کے سبب

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

شاہینہ کو، جس کے باپ پر مخبری کا الزام تھوپا جاتا ہے، دوسرے ہی دن پاکستان روانہ ہونا پڑتا ہے۔ بے بس ومجبور گردش بس دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔ 'موتیا کی کلیاں' کہانی ہے مجرد زندگی بسر کرنے والے دیارام کی جو اپنے پڑوسی کے کنبے سے اتنا گھل مل گیا ہوتا ہے کہ ان کے بیٹے سلیما کو اپنا بیٹا سمجھتا ہے۔ تقسیم ملک کے سبب دونوں بچھڑ جاتے ہیں۔ ہندوستان آکر راوی کی شکل میں دیارام کو اپنا سلیما نظر آتا ہے۔ وہ اسے سلیما کی طرح ہی پیار کرتا ہے اور عید کے دن اس کی کلائی پر موتیا کی کلیوں کا گجرا باندھ کر بہت خوش ہوتا ہے۔ انسانی محبت کی دردناک کہانی! افسانہ 'باندر چوا' ہماری جمہوریت اور نام نہاد ترقی پر طنز ہے۔ دراصل باندر چوا قبائلی بستی ہے جنہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ آزادی کب حاصل ہوئی اور آزادی کا مطلب کیا ہے۔ البتہ کچھ سال بعد ان میں سے ٹرک بھر کر لوگ ووٹ ڈالنے کے لیے چلے جاتے ہیں اور انہیں جہاں حکم دیا جاتا ہے وہاں پر وہ مہر لگاتے ہیں۔ چھ سال کے بعد بھی وہ یہ نہیں جانتے کہ ملک کی حکومت انگریز چلاتے ہیں یا نواب یا پھر وہ خود۔ ان کے لیے کبھی کچھ بھی نہیں بدلتا، نہ حکومت، نہ گاؤں اور نہ ہی ان کی تقدیر! آخری افسانہ 'چاندنی کے دیس میں' انگریزی سے ترجمہ کیا گیا ہے جس کی راوی ایک لڑکی ہے جو اپنے بابا کے مرنے کے بعد اکیلی مشینوں پر کام کرتی ہے۔ اپنی جھونپڑی کا پچھلا حصہ ایک تندرست وتوانا اجنبی کو ٹھہرنے کے لیے دیتی ہے لیکن وہ شہر جا کر کسی دوسری عورت کو چن لیتا ہے۔ اس لیے وہ نیا کرائے دار ڈھونڈتی ہے۔ قسمت اس کی یاوری نہیں کرتی پہلے اس کا خاوند جم اور پھر بیٹا ڈیوی مر جاتا ہے اور وہ عمر بھر ہمت کر کے خود ہی اپنی زندگی سنبھالتی ہے۔

پروفیسر آفاق احمد کے افسانوں پر پریم چند اور کرشن چندر کا خاصا اثر دکھائی دیتا ہے۔ کرشن چندر کی طرح وہ رومانی پلاٹ اور منظر نگاری میں مہارت رکھتے ہیں۔ حالانکہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہونے کے باعث ان کے کردار غریب اور متوسط طبقے ہی سے تعلق رکھتے ہیں مگر ہیئت کو دیکھ کر یوں لگتا ہے کہ جدیدیت کا بھی افسانہ نگار پر ضرور اثر پڑا ہے ان کے افسانوں میں مکالمے پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ افسانوں کے مکالمے چست اور رواں ہیں۔ جبکہ زبان شستہ اور سلیس ہے۔ آفاق احمد کے افسانوں کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ زندگی کے کسی ایک گوشے پر فوکس کرتے ہیں اور سادہ وسلیس زبان میں اُسے پیش کرتے ہیں۔ گو ان کے افسانوں میں جدیدیت کی زیریں لہر موجود ہے لیکن ان کا افسانہ ترسیل کے المیے سے کہیں پر بھی دوچار نہیں ہوتا۔

'امانتِ قلب ونظر' (سن اشاعت ۲۰۰۴ء) میں ۱۵ تنقیدی مضامین شامل ہیں جن میں سے کچھ

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

دہائیوں کے دوران لکھی ہوئی کہانیوں میں سے آٹھ کہانیوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ مجموعے کا پہلا افسانہ 'پرشور خاموشی' ہے جس میں پہاڑوں کی سیاحت پر نکلی ایک ادھیڑ عمر کی عورت اپنے پتی کو ہوٹل میں ہی چھوڑ کر نوجوان گائیڈ کے ساتھ ٹریکنگ Trekking پر نکل جاتی ہے اور اپنی زندگی کی ویرانیوں میں رنگ بھرنے کے لیے اس کو ترغیب دیتی رہتی ہے۔ افسانے کی خوبی یہ ہے کہ اس میں علامتی انداز میں جنسی ناآسودگی کو درشایا گیا ہے مگر کہیں پر بھی کھل کر جذبات یا شہوت انگیز الفاظ کا استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ دوسرا افسانہ 'سوسن کا پھول' ہے جس میں سوسن کو بطور علامیہ پیش کیا گیا ہے کیونکہ گلشن میں سوسن باقی سبھی پھولوں کے لیے دلبستگی کا مرکز تصور کیا جاتا ہے۔ اس افسانے میں ایک لڑکا اپنی گرل فرینڈ کو، جسے اب وہ صرف 'دوست' کہہ کر مخاطب ہوتا ہے، آخر کار خط لکھ کر اسے دامن چھڑانے کی کوشش کرتا ہے حالانکہ اسی لڑکی نے اس میں اعلیٰ ہمتی اور اعلیٰ نصبی کی نشانیاں ڈھونڈی ہوتی ہیں۔ افسانہ نگار خط لکھنے والے کی مجبوریوں سے آگاہ نہیں کرتا ہے جس میں روزگار کی پریشانیاں، سماجی رسم و رواج یا پھر دولت کی لالچ ہو سکتی ہے مگر اس کی محبوبہ یہ سمجھتی ہے کہ شاید اسے کسی اور سے محبت ہو چکی ہے اس لیے وہ ان کے بیچ میں نہیں آنا چاہتی ہے۔ افسانہ 'پلکوں کا بوجھ' طویل رومانی افسانہ ہے جس میں نجم نہ صرف جسمانی طور پر بلکہ دماغی طور پر بھی تندرست و توانا ہوتا ہے۔ وہ پڑھنے لکھنے اور تقریر کرنے میں ویسے ہی مہارت رکھتا ہے جیسے کہ کھیل کود میں۔ حالانکہ نیلو ابتدا میں اس کو نظر انداز کرتی ہے مگر ہاکی کے میدان اور پھر ڈبیٹ میں اس کے کرتب دیکھ کر اس پر فریفتہ ہوتی ہے۔ البتہ وہ مارے شرم و جھجک کے محبت کا اظہار نہیں کر پاتی۔ اس مشکل کو دور کرنے میں نجم کی منہ بولی بہن منی، جس کے ساتھ ماضی میں ایسا ہی واقعہ گزرا ہوتا ہے، نیلو کو نجم کے سامنے پیار کا اظہار کرنے کے لیے اُکساتی ہے۔ نتیجے میں دونوں پیار کے بندھن میں بندھ جاتے ہیں۔ 'تصویر درد کیا جانے' ایک معصوم لڑکی ارچنا کی کہانی ہے جو اپنے پتا جی کے کیے ہوئے وعدے کو اپنے پیار پر ترجیح دیتی ہے، شکی مزاج بمل سے شادی کرتی ہے لیکن ہر روز اسے پٹتی ہے۔ آخر کار ایک پھیری والے کی باتوں میں آ کر فرار کا راستہ ڈھونڈ نکالتی ہے اور ٹاٹ والے بابا کے ہاں شرن لیتی ہے جہاں سے پولیس اس کو پکڑ کر لے جاتی ہے۔ وہ دونوں جگہ عصمت دری کا شکار ہوتی رہتی ہے جب تک کہ وہ موت سے ہم آغوش نہیں ہوتی۔ یہ کہانی خطوط پر مبنی ہے جو مختلف اشخاص ایک دوسرے کو لکھتے ہیں اور سبھی مرکزی خیال کو آگے بڑھانے میں مدد کرتے ہیں۔ یہ طرز بیاں کسی زمانے میں افسانوی اسلوب کا فیشن بن چکا تھا۔ 'بیوپاری چلے گئے' تقسیم ہند سے وابستہ ہے۔ افسانے میں گردش اپنی خوبصورت محبوبہ شاہینہ سے بہت پیار کرتا ہے مگر تقسیم کے سبب

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

شاہینہ کو، جس کے باپ پر مخبری کا الزام تھوپا جاتا ہے، دوسرے ہی دن پاکستان روانہ ہونا پڑتا ہے۔ بے بس ومجبور گردش بس دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔ 'موتیا کی کلیاں' کہانی ہے مجرد زندگی بسر کرنے والے دیارام کی جو اپنے پڑوسی کے کنبے سے اتنا گھل مل گیا ہوتا ہے کہ ان کے بیٹے سلیما کو اپنا بیٹا سمجھتا ہے۔ تقسیم ملک کے سبب دونوں بچھڑ جاتے ہیں۔ ہندوستان آکر راوی کی شکل میں دیارام کو اپنا سلیما نظر آتا ہے۔ وہ اسے سلیما کی طرح ہی پیار کرتا ہے اور عید کے دن اس کی کلائی پر موتیا کی کلیوں کا گجرا باندھ کر بہت خوش ہوتا ہے۔ انسانی محبت کی دردناک کہانی! افسانہ 'باندر چوا' ہماری جمہوریت اور نام نہاد ترقی پر طنز ہے۔ دراصل باندر چوا قبائلی بستی ہے جنہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ آزادی کب حاصل ہوئی اور آزادی کا مطلب کیا ہے۔ البتہ کچھ سال بعد ان میں سے ٹرک بھر کر لوگ ووٹ ڈالنے کے لیے چلے جاتے ہیں اور انہیں جہاں حکم دیا جاتا ہے وہاں پر وہ مہر لگاتے ہیں۔ چھ سال کے بعد بھی وہ یہ نہیں جانتے کہ ملک کی حکومت انگریز چلاتے ہیں یا نواب یا پھر وہ خود۔ ان کے لیے کبھی کچھ بھی نہیں بدلتا، نہ حکومت، نہ گاؤں اور نہ ہی ان کی تقدیر! آخری افسانہ 'چاندنی کے دیس میں' انگریزی سے ترجمہ کیا گیا ہے جس کی راوی ایک لڑکی ہے جو اپنے بابا کے مرنے کے بعد اکیلی مشینوں پر کام کرتی ہے۔ اپنی جھونپڑی کا پچھلا حصہ ایک تندرست وتوانا اجنبی کو ٹھہرنے کے لیے دیتی ہے لیکن وہ شہر جا کر کسی دوسری عورت کو چن لیتا ہے۔ اس لیے وہ نیا کرائے دار ڈھونڈتی ہے۔ قسمت اس کی یاوری نہیں کرتی پہلے اس کا خاوند جم اور پھر بیٹا ڈیوی مر جاتا ہے اور وہ عمر بھر ہمت کر کے خود ہی اپنی زندگی سنبھالتی ہے۔

پروفیسر آفاق احمد کے افسانوں پر پریم چند اور کرشن چندر کا خاصا اثر دکھائی دیتا ہے۔ کرشن چندر کی طرح وہ رومانی پلاٹ اور منظر نگاری میں مہارت رکھتے ہیں۔ حالانکہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہونے کے باعث ان کے کردار غریب اور متوسط طبقے ہی سے تعلق رکھتے ہیں مگر ہیئت کو دیکھ کر یوں لگتا ہے کہ جدیدیت کا بھی افسانہ نگار پر ضرور اثر پڑا ہے ان کے افسانوں میں مکالمے پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ افسانوں کے مکالمے چست اور رواں ہیں۔ جبکہ زبان شُستہ اور سلیس ہے۔ آفاق احمد کے افسانوں کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ زندگی کے کسی ایک گوشے پر فوکس کرتے ہیں اور سادہ وسلیس زبان میں اُسے پیش کرتے ہیں۔ گو ان کے افسانوں میں جدیدیت کی زیریں لہر موجود ہے لیکن ان کا افسانہ ترسیل کے المیے سے کہیں پر بھی دوچار نہیں ہوتا۔

'امانتِ قلب ونظر' (سن اشاعت ۲۰۰۴ء) میں ۱۵ تنقیدی مضامین شامل ہیں جن میں سے کچھ

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

سمیناروں اور ریڈیو وغیرہ کے لیے تحریر کیے گئے تھے۔ 'حرف چند' کے عنوان سے متنازعہ دیباچہ عزیز قریشی نے رقم کیا ہے جس کے کچھ حصے کو کتاب چھپ جانے کے بعد رد کرنا پڑا کیونکہ راقم ذاتیات پر اتر آئے تھے جس کے خلاف مقامی ادبی حلقوں میں کافی احتجاج بھی ہوا تھا۔ مضمون 'میر تقی میر۔ اپنے زمانے کی سب سے معتبر آواز' میں مصنف نے میر کی حیات اور فن کا مختصراً جائزہ لیا ہے۔ آفاق احمد کو اس بات کا احساس ہے کہ میر پر اردو کے نامور نقادوں نے بہت کچھ لکھا ہے اس کے باوجود عہد میر اور میر کی ذاتی محرومیوں اور نامرادیوں میں کچھ ایسے گوشے ہیں جو ابھی تحقیق کے لیے باقی رہ گئے ہیں۔ مضمون نگار نے میر اور اس کے ماحول، دلی کے اجڑنے، لکھنؤ تہذیب وتمدن کا گہوارہ بننے، ۱۷۸۲ء میں میر کے لکھنؤ چلے جانے اور دو سو روپے ماہوار تنخواہ پانے اور وہاں زندگی کے باقی ماندہ ۲۸ برس گزارنے پر روشنی ڈالی ہے۔ بقول شمس الرحمٰن فاروقی ''ہماری تاریخ میں میر کے علاوہ کوئی بڑا شاعر ایسا نہیں ہے جس نے زمانے کے سرد وگرم اتنے دیکھے ہوں۔'' 'بھوپال میں علامہ اقبال کا قیام اور وہاں تخلیق کی ہوئی نظمیں' میں آفاق احمد نے اقبال کے اسفار بھوپال اور وہاں پر ان کے قیام کا ذکر کیا ہے۔ بھوپال کے ریاض منزل اور شیش محل میں لکھی گئی چودہ نظمیں (سلطانی، تصوف، وحی، مقصود، حکومت، نگاہ، امید، صبح، مومن، امرائے عرب سے، ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام، ابی سینا، جمعیت اقوام مشرق اور مسولینی) اور ان کا تجزیہ مضمون میں شامل ہے۔ بقول آفاق احمد اسپنوزا اور افلاطون کے برعکس ''اقبال کے نزدیک زندگی اور موت التفات کے لائق نہیں ہیں بلکہ نگاہ کا مقصود خودی اور صرف خودی ہے۔'' مضمون 'غالب کے نو دریافت خطوط' میں مضمون نگار نے مرزا غالب کے نایاب نسخۂ حمیدیہ دیوان اور دو غیر مطبوعہ خطوط پر بحث کی ہے جو ۱۲/اگست ۱۸۶۱ء اور ۴ نومبر ۱۸۶۱ء کو غالب نے اپنے شاگرد رفعت کے نام لکھے تھے۔ 'مہدی افادی اپنے خطوط کے آئینے میں' مہدی افادی کی مکتوب نگاری پر لکھا گیا مضمون ہے۔ یہ خطوط دو جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ (۱) دوست احباب کے نام لکھے گئے 'مکاتیب مہدی' جس میں عملی وادبی مسائل، مشورے اور زندگی وادب پر تنقید ملتی ہے، اور (۲) اپنی بیوی کو لکھے گئے خطوط 'صحیفۂ محبت'۔ بقول عبدالماجد دریا آبادی: ''ارباب ذوق کے لیے مہدی کے مضامین سے بڑھ کر قیمتی ان کے خطوط ہوتے تھے۔'' ایک اور مضمون کا عنوان 'شبلی نعمانی اور مہدی افادی' ہے۔ بقول مضمون نگار ''اگر شبلی کو مہدی کا 'ادبی محبوب' کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ مہدی افادی نے متعدد مضامین میں شبلی کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ افسوس شبلی نے ان کے خطوط سنبھال کر نہیں رکھے۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

مضمون 'سرسید کی کہانی۔ کچھ ان کی کچھ حالی کی کچھ میری زبانی' میں مختصراً سرسید کی زندگی کا سفر درج ہے جس کی جلی سرخیاں (Highlights) ان کا لندن کا سفر، تہذیب الاخلاق کا اجراء، ایم اے او کالج اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا قیام ہے۔ سرسید ہمیشہ آزادیٔ رائے، عقائد مذہبی کی درستگی، تعلیم اطفال، عورتوں کی تعلیم، ہنروفن اور صنعت وحرفت، علوم اخلاق ومعاملاتِ معاشرت وتمدن پر خامہ فرسائی کرتے رہے۔ 'مولانا آزاد کی خوش گفتاری' میں مصنف کا خیال ہے کہ مولانا آزاد کی تقریروں، خاص کر تعلیم سے متعلق، پر ریسرچ ہونا چاہیے کیونکہ تعلیم سے متعلق ابھی بہت سارے گوشے ایسے ہیں جن پر بھرپور روشنی نہیں ڈالی گئی ہے۔ چنانچہ آزاد گیارہ برس سے زیادہ وزارت تعلیم سے وابستہ رہے اس لیے تعلیم کے بارے میں ان کے نظریے اور خیالات جاننا بہت ضروری ہے۔ وہ تعلیمی اداروں کی عمارتوں سے زیادہ تعلیم کی کوالٹی (Quality) پر زور دیتے رہے اور ہندی کے تسلط کے خلاف ہمیشہ لکھتے رہے۔ بین الاقوامی سطح پر انہوں نے تعلیمی، سائنسی اور تہذیبی سطح پر کام کرنے والے ادارے یونیسکو کا ہندوستان کو رکن بنوایا۔ مضمون 'وہ مزار کیا ہوا جہاں ولی کا مسکن تھا' ولی گجراتی کے مزار کا نشان مٹانے پر رقم کیا گیا ہے۔ ولی کے بارے میں مضمون نگار لکھتے ہیں ''تو وہی ولی جو سورت کا عاشق تھا، جسے احمد آباد گجرات کی جدائی خون کے آنسو رلاتی تھی، اور جس نے اپنی شاعری سے گجرات کا نام روشن کیا اور جس نے گجری اور دکنی کو اردو میں اس طرح شیر وشکر کیا کہ اس نے شمالی ہند میں جدید غزل کی بنیاد رکھی۔ جب اس کا دیوان دہلی پہنچا تو غزل جو فارسی کا جامہ پہنے ہوئے تھی اسے بیان واظہار کا ایک نیا ذریعہ مل گیا اور ساری دنیا میں اس کی وجہ سے گجرات کا نام روشن ہو گیا۔'' 'پریم چند اور بازارِ حسن' میں آفاق احمد فرماتے ہیں: کہ ''بازارِ حسن لکھتے وقت جو خیال پریم چند کے پیش نظر رہا وہ یہی تھا کہ کسی طرح زنان بازاری کی اصلاح کی جائے اور اپنے اس مقصد کو لے کر وہ آگے بڑھے ہیں۔ ان کے ذہن میں جو اصلاحی خاکہ تھا وہ پیش کیا ہے۔ ان اسباب سے بحث کی ہے جو عورت کو طوائف بننے پر مجبور کرتے ہیں۔'' اس مضمون میں ناول بازارِ حسن کے مختلف عناصر خصوصاً سماجی معنویت، کردار سازی اور تکنیک پر بحث کی گئی ہے۔ اسلوب کے بارے میں آفاق احمد رقم طراز ہیں کہ ''پریم چند رنگیں عبارت بہت کم لکھتے ہیں لیکن جب لکھنے پر آتے ہیں تو لفظوں کی مٹھاس کانوں میں عجب رس گھولتی ہے۔ اور اس سے روح جھوم جھوم جاتی ہے۔'' 'شفیق الرحمٰن بحیثیت حزن نگار' میں مضمون نگار نے شفیق الرحمٰن، جو مشہور مزاح نگار کے طور پر جانے جاتے ہیں، کے فن کی دیگر جہتوں پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کے خیال میں حزن نگاری شفیق الرحمٰن کی تحریر کا ایک خاص جزو ہے جو بدقسمتی سے ان کی مزاح نگاری کے

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

نیچے دب کر رہ گئی ہے۔ فرماتے ہیں: ''شفیق الرحمٰن کے ہیرو اور ہیروئن ہی رنجیدہ نہیں ہوتے بلکہ سارے مناظر، پہاڑ، دریا جنگل پھول قوس قزح سب ہی اداس دکھائی دیتے ہیں۔'' اس مضمون میں شفیق الرحمٰن کی حزن نگاری سے متعلق کئی اقتباسات درج ہیں۔ 'مثنوی صدق البیان' نواب صدیق حسن خاں کی بیوی شاہجہاں بیگم متخلص تاجورؔ/شیریںؔ کا کارنامہ ہے۔ اس میں آفاق احمد کی رائے میں شہزادوں اور جن پریوں کے بجائے موسموں، تہواروں، رسومات، افلاک اور فصلوں کو بڑی فنکاری کے ساتھ منظوم کیا گیا ہے اور یہ ''ماضی کی تہذیبی خزانوں سے حاصل کیا ہوا ایک قیمتی رتن'' ہے۔ 'طنز و مزاح کی دنیا کے دو تاجدار' میں بھوپال سے تعلق رکھنے والے ملا رموزی اور تخلص بھوپالی کا ذکر کیا گیا ہے۔ بقول پروفیسر عبدالقادر سروری ''ملا رموزی کی ظرافت نگاری قوم کے پژمردہ دلوں کے لیے مسرتِ پائیدار کا ساماں بہم پہنچائے گی۔'' انہوں نے طنز و مزاح سے خوب کام لیا اور ایسی گلابی اردو لکھنے کا جواز اس دور کے سیاسی جبر کو بتایا ہے۔ دو درجن کتابوں کے خالق ملا رموزی کے بارے میں بدر جلالی ایڈیٹر مدینہ لکھتے ہیں کہ وہ ''گلابی اردو کے خداوندِ اوّل ہی نہیں بلکہ اردو کے بہترین انشاء پرداز بھی ہیں۔''

عبدالاحد خاں تخلصؔ چونکہ تجارت کرتے تھے اس لیے ادب ان کا مشغلہ تھا اور طنز و مزاح کے گھوڑے دوڑانا ان کی تفریح۔ پوسٹ مارٹم، شیطان جاگ اٹھا، پاندان والی خالہ، غفور میاں اور ایسے ہی سینکڑوں مضامین ان کے قلم سے نکلے ہیں۔ تخلصؔ بھوپالی کو بقول آفاق احمد ''بھوپال کی بروکٹ تہذیب سے پٹھانی بیباکی، عوامی زبان اور روزمرہ جیسا کہ بولنا ویسا لکھنا کا ڈھیٹ انداز ملا تھا۔'' انہوں نے حکومت وقت اور معاشرے کی بے راہ روی کے خلاف بھی آواز اٹھائی۔ 'سردار جعفری کی یادوں کا اُجالا' میں مصنف نے سردار جعفری سے ان کی ملاقات، علامہ اقبال پر منعقد کیے گئے سیمناروں میں ان کی شرکت اور اقبال کے تئیں ان کی محبت، جذبات اور خیالات کا اظہار ہے۔ اسی نہج کا ایک اور مضمون بعنوان 'ظہیر بھائی' رقم کیا گیا ہے کہ وہ بھی بھوپال کے سیمناروں اور مشاعروں میں شرکت کی غرض سے آتے رہے۔ ان کے بارے میں مضمون نگار فرماتے ہیں۔ ''وہ اردو والوں میں ایک منفرد اور مثالی شخصیت کے مالک تھے۔ کبھی کسی کا برا نہیں چاہا۔ ہمیشہ ہر ایک کے کام آئے۔ ایسے دردمند دل کے انسان بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔'' کتاب کا آخری مضمون 'بھوپال کی صحافت کی آبرو حکیم سید قمر الحسن' ہے۔ جو ۱۹۰۹ء میں قصبہ رائسین میں پیدا ہوئے۔ منشی فاضل اور زبدۃ الحکما کی سندیں حاصل کر کے آصفیہ طبیہ کالج بھوپال میں آنریری لکچرر ہوئے مگر ۱۹۳۸ء میں اخبار ندیم کی ادارت سنبھالی۔ ادبی تہذیبی محفلوں اور فلاحی اداروں سے وابستہ رہے۔ فنون لطیفہ میں دلچسپی

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

تھی، سیاحت وشکار محبوب مشغلے تھے۔ بقول مضمون نگار ''قمر صاحب کا شمار اردو کے صحافیوں کی اس نسل سے ہوتا تھا جسے دیکھنے کو اب آنکھیں ترستی ہیں۔''

'امانتِ قلب ونظر' کے مضامین کو پڑھ کر یہ صاف ظاہر ہے کہ پروفیسر آفاق احمد کا مطالعہ وسیع اور مشاہدہ عمیق ہے۔ انہوں نے کوئی بھی ایسا موقعہ نہیں گنوایا جس کی بدولت وہ اردو ادب کے ستاروں سے مل سکتے تھے یا پھر کسی نایاب ونادر نسخے تک رسائی پا سکتے تھے۔ ان کی زبان میں مٹھاس ہے اور انہوں نے تنقیدی اصطلاحات سے گریز کیا ہے جس کے سبب کتاب پڑھنے میں مزہ آتا ہے۔

'پریم چند شناسی' کے مرتب پروفیسر آفاق احمد ہیں۔ یہ کتاب ۱۹۹۴ء میں شائع ہوئی اور اس میں پریم چند کے فن اور نظریے سے متعلق نو (۹) مضامین شامل ہیں جو مختلف ادیبوں نے تحریر کیے ہیں۔ 'حرف آغاز' میں مؤلف لکھتے ہیں کہ پریم چند ہر قسم کے بھید بھاؤ سے پاک تھے، اردو ہندی کے درمیان کوئی خلیج نہیں دیکھنا چاہتے تھے اور ایک زبان میں لکھی ہوئی کتاب کو دیر سویر دوسری زبان میں ترجمہ کروا دیتے تھے۔ مضمون 'گودان سے گئودان تک' میں پروفیسر مسعود حسین نے ناول گئودان کو ہندی تصنیف بتایا ہے جس کا ترجمہ سحر ہتگامی نے کیا تھا۔ مگر ڈاکٹر جعفر رضا اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ دوسرا مضمون 'پریم چند: اردو یا ہندی ادیب' ڈاکٹر جعفر رضا نے رقم کیا ہے۔ وہ پریم چند کو بنیادی طور پر اردو کا ادیب مانتے ہیں اور ان کی زیادہ تر نگارشات کے ہندی میں ترجمے دوسروں کے قلم کے رہین منت سمجھتے ہیں۔ تیسرا مضمون 'پریم چند کی افسانہ نگاری' ہے جو ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی نے قلم بند کیا ہے۔ اس میں اردو افسانے کا مختصر ارتقاء، اردو میں پہلے افسانے کی نشاندہی اور اردو افسانوں میں پریم چند کے یوگدان کے بارے میں خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ ادب کے بارے میں پریم چند کا نظریہ ان فقروں سے پتہ چلتا ہے: ''ادب کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں لیکن میرے خیال میں اس کی بہترین تعریف تنقید حیات ہے۔ چاہے وہ مثالوں کی شکل میں ہو یا افسانوں کی یا اشعار کی۔'' مضمون نگار کے خیال میں پریم چند زندگی کو گاندھی جی کی عینک سے دیکھا کرتے تھے، دیہات کے کرداروں پر جہاں اس کی گرفت مظبوط تھی وہیں شہر کے ماحول اور کرداروں کو پیش کرنے میں تصنع سے کام لیتے تھے۔ تکنیک کے اعتبار سے افسانے بہت کامیاب ہیں اور عالمی ادب کے شاہکاروں کے ہم پلہ رکھے جا سکتے ہیں۔ البتہ ان کے افسانوں میں کرداروں کی اندرونی واردات اور اس کی بدولت ان کی نشو ونما کا سراغ کم ملتا ہے۔ مضمون 'فسانہ نگار پریم چند: عمرانی مطالعہ' میں ڈاکٹر ابن فرید کے خیال میں پریم چند نے عموماً منضبط موضوعات Procedural Themes کو ہی برتا ہے حالانکہ آخری دور میں

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

انہوں نے پرفریب اصل Intriguing Substantive کے موضوعات کو بھی استعمال میں لایا ہے۔ (گلی ڈنڈا، وفا کی دیوی، لاٹری، کفن)۔ بنیادی طور پر وہ عینیت پسند ہیں اور معیاران کی معاشرتی کسوٹی ہے۔ وہ اپنی روایتوں میں غیر ارادی طور پر جکڑے رہے جبکہ سماجی بدعتوں اور بدعنوانیوں کا حل گاندھیائی اصولوں میں ڈھونڈتے رہے۔ ڈاکٹر شمیم نکہت اپنے مضمون 'پریم چند کی تخلیقات میں عورت کا مقام' میں فرماتی ہیں کہ ''انہوں نے عورت کو زندگی کی اہم اکائی کی شکل میں پیش کر کے اچھے خاندان اور ان خاندانوں سے مل کر بنے ہوئے صحت مند سماج کا تصور پیش کیا ہے۔'' وہ عورت کو خاندان کی اہم کڑی مانتے ہیں اور ان کی ناقدری اور محرومی کا ازالہ کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ چھوٹی عمر کی شادی، نسائی تعلیم، مذہبی وسماجی پابندیاں، بیوہ کی دوسری شادی، اور عورت کی معاشی غلامی وغیرہ پر انہوں نے بے شمار افسانے تحریر کیے ہیں۔ اگلا مضمون ڈاکٹر یوسف سرمست کا 'پریم چند کے ناولوں میں رومانیت' ہے جس میں رائٹر نے ابتدا میں رومانیت کے صحیح مفہوم پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور اسی پس منظر میں پریم چند کے افسانوں کو پرکھا ہے۔ ان کی نظر میں پریم چند کے یہاں رومانیت کا غلبہ ہے کیونکہ وہ بھی ایک نئی دنیا کی تعمیر کی شدید خواہش رکھتے ہیں اور اس کے لیے حقیقت نگاری کا استعمال بھی کرتے ہیں۔ پریم چند کی 'جذباتی آرزومندی' ہی ان کی رومانیت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ مذکورہ مضمون میں پریم چند کے مختلف ناولوں میں رومانیت کی نشاندہی کی گئی ہے 'پریم چند اور فرقہ پرستی' میں ڈاکٹر سعید عارفی نے یہ ثابت کیا ہے کہ پریم چند آدرش وادی، گاندھی وادی، انسانیت سے محبت کرنے والے، ہندو مسلم اتحاد کے حامی، مذہبی ریاکاری سے نفرت کرنے والے ادیب تھے۔ وہ اردو اور ہندی کی یکجہتی کے قائل تھے اور مشترکہ تہذیب کے علمبردار۔ 'اردو افسانے کو پریم چند کی دین' ڈاکٹر سید حامد حسین نے تحریر کیا ہے۔ اس مضمون کا ابتدائی فقرہ ہی اس کا لب لباب ہے۔ ''اردو افسانے کو جو فنی اعتبار اور ہستی و بالیدگی پریم چند کے تخلیقی شعور سے ملی ہے وہ کسی دوسرے تنہا فن کار سے اصل نہیں ہو پائی۔'' بقول مضمون نگار پریم چند نے عام اور سادہ مظاہر کو وسیلہ فن بنایا اور عام انسانی تجربے کی معنویت اور ڈرامائیت سے روشناس کرایا۔ ان کے یہاں اختصار اور تاثر کی مرکزیت ہے۔ بیانیہ اسلوب کا تنوع ہے، موضوعات کی رنگارنگی ہے اور گاؤں وشہروں کی بازگشت ہے۔ پریم چند کی کہانیوں میں المیہ کہانیاں بھی ہیں اور ہلکی پھلکی پرلطف کہانیاں بھی جن میں لاتعداد کرداروں کا ایک جہان آباد ہے۔ کتاب کا آخری مضمون پروفیسر اظہر راہی کا 'منشی پریم چند اور اردو' ہے جس میں پریم چند کا اردو سے لگاؤ کے ثبوت پیش کیے گئے ہیں۔ انہیں معاشی تنگدستی کے باعث ہندی کی جانب مڑنا پڑا۔ یہ بات بھی مسلم ہے کہ ''انہوں

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

نے اپنی ادبی زندگی کی ابتدا اردو سے کی اور اردو سے ہی انہیں شہرت بھی حاصل ہوئی ہے۔''

اقبالیات پر ترتیب دی گئی دو کتابیں 'مجلس اقبال (حصہ دہم)' اور 'کل ہند علامہ اقبال ادبی مرکز بھوپال۔ داستان سفر' بھی آفاق احمد کی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ اول الذکر کتاب میں اقبال کی شاعری میں تمثال کا مطالعہ، اقبال ایک نئی تعبیر، اقبال کی غالب شناسی، عورت کی آزادی اور تعلیم نسواں کے تئیں اقبال کا رویہ، یہ وہ صدا ہے جسے قتل کر نہیں سکتے، فلسفی شاعر اقبال کا جہانِ تخلیق، اقبال اور تصوف، اقبال شخصیت اور حب انسانی وآزادی، کلام اقبال میں صناعی کے عنوان سے مضامین شامل ہیں۔ موضوعات کا تنوع کتاب کی اہمیت کا ضامن ہے۔ بقول جگن ناتھ آزاد ''اقبال کی معنویت کل بھی تھی، آج بھی ہے اور کل بھی رہے گی۔'' ان مضامین سے صاف ظاہر ہے کہ اقبال کے یہاں مشرقی احساسات کی ترجمانی، قومی انا کا احساس، صوتی بصری، تاریخی، جمالیاتی اور حرکی تماثیلیں، اسلامی فلسفہ، تہذیبوں کے تصادم کا ادراک، گوئٹے اور غالب شناسی، آزادی اور تعلیم نسواں کا احساس، شعور آزادی اور مقصد حیات کی سوجھ بوجھ، ترقی پسند شاعروں جیسے سردار جعفری، جوش وغیرہ کی شاعری پر ان کا اثر، اتحاد امن حب الوطنی اور عزت نفسی کا پیغام، عشق فقر اور حریت پسند تصوف کا نظریہ اور تلمیحات استعارات اور علائم کے استعمال پر بے نظیر قدرت نظر آتی ہے۔ کتاب کے اخیر میں علامہ اقبال ادبی مرکز کی مطبوعات کی فہرست درج ہے جو اقبالیات کے طلبہ کے لیے حوالہ جاتی اہمیت رکھتی ہے۔ 'داستاں سفر' میں علامہ اقبال سے وابستہ کچھ یادوں اور تاریخی مقامات کا بھی ذکر ہے۔ مصنف نے خواجہ احمد فاروقی کے حوالے سے یہ اقتباس درج کیا ہے۔ ''اقبال ملک کی تقسیم نہیں چاہتے تھے بلکہ مسلم اکثریت کے صوبوں کا ایک منطقہ بنانا چاہتے تھے۔ انہوں نے کسی مرحلہ پر بھی تقسیم کی تائید نہیں کی۔'' مذکورہ بالا دونوں کتابوں سے پروفیسر آفاق احمد کی اقبال پرستی اور اقبال شناسی ظاہر ہوتی ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ پروفیسر آفاق احمد نے اپنی ساری زندگی اردو کی بقا کے لیے وقف کی اور خاموش سپاہی کی طرح ہمیشہ کام کرتے رہے۔ حالانکہ ان کی افسانہ نگاری سے کافی امیدیں وابستہ تھیں مگر انہوں نے تحقیق وتنقید کے میدان میں اپنے جوہر دکھائے اور پھر اسی کے ہو کر رہ گئے۔ ان کی قابل رہنمائی نے اردو کو کئی ریسرچ اسکالر بھی دیے۔ میں امید کرتا ہوں کہ آگے بھی وہ اردو ادب کو مالا مال کرتے رہیں گے۔

❖ ❖ ❖

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

وکیل نجیب اور بچوں کا ادب

بڑھتے ہوئے ذہنوں کی نشو ونما اور تربیت کے لیے مخصوص ادب کی ضرورت ہوتی ہے جو پڑھنے والوں میں صحیح سوچ وفکر اور صالح کردار کی بنیاد ڈال سکے۔ زندگی کے یہی چند تشکیلی سال ہوتے ہیں جب اخلاق وعادات کی نیو پڑ جاتی ہے اور بچے اچھے شہری بن جاتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر الیاس صدیقی ''بچے، بچے ہوتے ہیں، بڑوں کا منی ایچر (miniature) نہیں ہوتے۔ ان کی دلچسپیاں، نفسیات، عادات، ضروریات، مسائل اور تقاضے بڑوں سے جداگانہ ہوتے ہیں۔ جو ادیب جتنا بہتر طور پر ان سے واقفیت رکھتا ہے، اتنا ہی کامیاب ثابت ہوتا ہے۔'' ناگپور میں ادب اطفال کی جانب ۱۹۳۵ء سے قلمکاروں نے اپنی توجہ مرکوز کی۔ اس کارواں کے ایک اہم رکن وکیل نجیب ہیں جنہوں نے اپنی پوری تخلیقی زندگی بچوں کے ادب کے لیے وقف کی۔ انہوں نے بچوں کے لیے ناول بھی لکھے اور کہانیاں بھی۔ ان کی کئی کہانیاں باتصویر شائع ہوئی ہیں جن سے بچوں کی دلچسپی اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ بچوں کے لیے کہانیاں لکھنا وکیل نجیب کا محبوب ترین مشغلہ ہے۔

عبدالوکیل یکم جولائی ۱۹۴۶ء کے روز ناگپور میں پیدا ہوئے، ایم اے بی ایڈ کی تعلیم حاصل کی اور عمر بھر معلمی کے ساتھ جڑے رہے۔ وکیل نجیب کا قلمی نام اختیار کر کے انہوں نے بچوں کے لٹریچر کو مالا مال کر دیا۔ کئی اکادمیوں اور اداروں نے ان کی ادبی اور سماجی خدمات کو مدنظر رکھ کر انہیں انعامات اور اعزازات سے نوازا۔ ان کا ادبی سفر افسانہ نگاری سے شروع ہوا۔ ملک کے نامور جرائد میں ان کے افسانے چھپتے رہے لیکن

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

دھیرے دھیرے انہوں نے ادبِ اطفال کی طرف توجہ دی اور پھر اسی کے ہو کر رہ گئے۔ وکیل نجیب کے ۱۳ ناول (بے زبان ساتھی ۱۹۷۷ء، مہربان جن ۱۹۹۲ء، خوفناک حویلی ۱۹۹۵ء، پانچ بھائی ۱۹۹۹ء/ ۱۹۹۶ء، خطرناک راستے جانباز ساتھی ۲۰۰۱ء، غدّار وزیر ۲۰۰۷ء، جانباز شہزادے ۲۰۰۲ء، سازش ۲۰۰۵ء، کمپوٹان ۲۰۰۵ء، ایک عجیب حادثہ، نواب بنڈی والا ۲۰۰۶ء، انسانیت اور درندگی ۲۰۰۷ء؛ دو ناولٹ (واپسی ۱۹۹۹ء اور انوکھی دوا)؛ تین کہانیوں کے مجموعے (جنگل کی امانت ۱۹۷۶ء، ماں کی بددعا ۲۰۰۵ء، سنگریزے ۲۰۰۰ء) اور دو سفرنامے (شمالی ہندوستان کے چند خوبصورت مقامات کی سیر ۲۰۰۳ء، سفرنامۂ حج و زیارت مدینہ منورہ ۲۰۰۶ء) اب تک منظر عام پر آ چکے ہیں۔

'انسانیت اور درندگی' کے پیش لفظ میں سلام بن رزاق یوں رقم طراز ہیں: ''وکیل نجیب طویل عرصے تک درس و تدریس سے وابستہ رہے ہیں لہٰذا ایک تجربہ کار مدرس ہونے کے ناطے انہیں بچوں کی نفسیات، ان کے مزاج، ان کی پسند ناپسند کو قریب سے دیکھنے پرکھنے کے زیادہ مواقع نصیب ہوئے ہیں۔ اس لیے ان کی کہانیوں اور ناولوں میں صرف مشاہدے کی گہرائی نہیں تجربے کی پختگی بھی صاف جھلکتی نظر آتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی کہانیاں اور ناول بچوں اور بڑوں میں یکساں طور پر مقبول ہیں۔ ان کی زبان سلیس اور عام فہم ہوتی ہے جسے ہر عمر کا بچہ نہایت آسانی سے انگیز کر سکتا ہے۔ ان کا اسلوب اس قدر سادہ ہے کہ وہ پیچیدہ سے پیچیدہ بات کو نہایت شفافیت کے ساتھ پیش کر دیتے ہیں۔''

بچوں کے لیے فکشن لکھتے وقت نہ صرف پلاٹ، کردار، کلائمکس اور انجام کی طرف دھیان دینا پڑتا ہے بلکہ اسلوب، بچوں کی نفسیات، تجسس و تحیّر، دلچسپی کا تسلسل، تفریحی پہلو کے علاوہ مقصدی پہلو پر فوکس اور آسان و سلیس زبان کے استعمال پر خاصی توجہ دینی پڑتی ہے۔ اپنے فن کے بارے میں وکیل نجیب خود فرماتے ہیں:

> ''کہانی لکھنے میں مَیں سب سے زیادہ اہمیت پلاٹ کو دیتا ہوں تاکہ بچہ اُسے شروع کرے تو آخر تک پڑھے۔ واقعات دلچسپ ہوں اور تجسس پیدا ہو، ایسا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ پس منظر ایسا کہ بچہ جسے صرف تصور کی آنکھوں سے دیکھ سکے۔ زبان ایسی کہ آٹھ سال کے بچے سے لے کر اسی سال کے بزرگ تک آسانی سے پڑھ سکیں۔'' (جانباز شہزادے، صفحہ ۶)

وکیل نجیب عنوان سے لے کر انجام تک تجسس کے شعلے کو بجھنے نہیں دیتے۔ بقول شرف الدین ساحلؔ:

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

''وکیل نجیب کی کتابوں کے عنوانات بڑے ڈراونے ہیں۔ یہ دہشت وخوف کے ماحول کا احساس دلاتے ہیں۔ جنگل کا سناٹا، جن کی ہیبت ناک شخصیت اور خطرناک راستے کا تصور سامنے لاتے ہیں۔ اس تصور کے سامنے آتے ہی رونگٹے کھڑے ہونے لگتے ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ ان کتابوں کا مطالعہ کرتے وقت سچائی یہی ہے کہ پڑھنے والا قطعی خوف ودہشت محسوس نہیں کرتا بلکہ وہ لذت العقل محسوس کرتا ہے اور حیرت واستعجاب میں ڈوبتا چلا جاتا ہے۔ وکیل نجیب کی یہی وہ فنکاری ہے جو انہیں ہر مرحلے پر کامیاب کرتی ہے۔'' (خوفناک حویلی صفحہ ۹)

جہاں تک کرداروں کا سوال ہے۔ وکیل نجیب حسب ضرورت اُن کا تعارف بلاواسطہ کرواتے ہیں۔ چند مثالیں ذیل میں درج ہیں۔

- منگل مورشی گانو کا رہنے والا تھا۔ اس کا اصلی نام پیار محمد تھا، لیکن اسے منگل کے نام سے جانتے تھے کیونکہ وہ منگل کے دن پیدا ہوا تھا..... منگل ایک ہونہار فرماں بردار تعلیم یافتہ نوجوان تھا۔ قصبہ کے اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد اپنے پرکھوں کی زمین سے اناج پیدا کر کے ملک کی غذائی ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا..... (افسانہ' جنگل میں جنگل' ۔ماں کی بددعا، صفحہ ۲۷)
- بادشاہ احمد رضا شاہ کا ایک سوتیلا بھائی بھی تھا جس کا نام احمد شریف شاہ سلجوقی تھا۔ وہ نہایت جری اور بہادر شخص تھا۔ بادشاہ نے کبھی اُسے سوتیلا نہ سمجھا اور ہمیشہ ہر معاملے میں اس کی رائے کو فوقیت دیتا تھا۔ احمد شریف شاہ سلجوقی بھی بادشاہ پر اپنی جان نثار کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتا تھا۔ (جانباز شہزادے، صفحہ ۷۰)

چنانچہ ناول نگار بچوں کی اصلاح اور تربیت پر خاص توجہ دیتے ہیں، ان کے اکثر وبیشتر کردار مثبت ہوتے ہیں جو اپنی شخصیت کی امٹ چھاپ ننھے منے ذہنوں پر چھوڑ جاتے ہیں۔ ناول 'مہربان جن' کا جن بھی ایک معصوم بے یارومددگار بچے کی مدد کرتا ہے اور اسے وہ ساری خوشیاں لوٹاتا ہے جن سے وہ محروم کردیا جاتا ہے۔ ان کی کہانیوں اور ناولوں کے کردار ہمارے پاس پڑوس میں ملتے ہیں۔ جو محبت بھی کرتے ہیں اور نفرت بھی، معصوم بھی ہیں اور چالاک بھی، ذہین بھی ہیں اور گاؤدی بھی، نڈر بھی ہیں اور مجبور بھی، نواب بنڈی والا کا نواب جہاں ایک طرف اعلیٰ ہمت اور عقلمند ہوتا ہے وہیں پولیس اور عدالت میں کیس جیتنے کے

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

لیے رشوت دینے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ یہی زمانہ سازی (pragmatism) اس کو کامیابی سے ہمکنار بھی کرتی ہے۔ ناول نگار نے کہیں کہیں پولیس کی رشوت خوری سے بھی پردہ اٹھایا ہے مگر اس طریقۂ کار سے منفی نتیجہ بھی نکل سکتا ہے۔ بچوں کے ذہن میں نظام (establishment) اور پولیس محکمے کی منفی تصویر ثبت کر کے کبھی کبھی ان میں قنوطیت یا فراریت کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ وکیل نجیب کے افسانوں اور ناولوں میں ایک خاص بات جو نظر آتی ہے وہ کہانی میں کسی روحانی بابا، فقیر یا مافوق الفطرت جن کا عود کر آنا ہے۔ وہ مثبت کردار ادا کرتا ہے اور ہیرو کے لیے ہر مرحلے پر مشکل کشا بن جاتا ہے مگر اپنی غیبی قوتوں کا اظہار کہیں پر بھی نہیں کرتا۔ وہ صرف ایک ممد و معاون کا رول نبھاتا ہے۔ وکیل نجیب کی کہانیوں کے پلاٹ مربوط ہوتے ہیں اور پورے ناول میں کہیں ذہن اِدھر اُدھر نہیں بھٹکتا۔ چنانچہ وہ اپنے ناولوں کے بارے میں خود ہی فرماتے ہیں۔ ''میں جب ناول لکھنے کی شروعات کرتا ہوں تو مکمل خاکہ میرے ذہن میں موجود ہوتا ہے اور فرصت کے اوقات میں جلدی جلدی اسے صفحۂ قرطاس پر منتقل کرتا چلا جاتا ہوں۔ اس عجلت کی وجہ سے تحریر میں کبھی کبھی زبان کی کچھ خامیاں بھی باقی رہ جاتی ہیں۔ مجھے اس کا اعتراف ہے۔'' وکیل نجیب نے 'کمپوٹان' جیسے ناول لکھ کر سائنس فکشن میں بھی قدم رکھا ہے جو ایک خوش آئند بات ہے۔ اُردو ادب میں سائنس فکشن کی طرف بہت ہی کم قلمکار توجہ دیتے ہیں۔ اس لیے وکیل نجیب کی ان کوششوں کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔

'نواب بنڈی والا' حقیقی واقعے پر بُنی گئی فرضی کہانی ہے جس میں 'علی بابا چالیس چور' کی پرچھائیں نظر آتی ہے۔ سکول میں تعلیم یافتہ نواب کا باپ بیل گاڑی چلاتے ہوئے سڑک حادثے میں بیلوں سمیت فوت ہو جاتا ہے۔ اس کا چاچا، جو بھائی کی جائیداد پر لالچی نظر رکھتا ہے، کسی بھی طرح کی مالی مدد کرنے سے کتراتا ہے۔ اس کے برعکس نواب کی توجہ اس قرضے کی طرف مبذول کرتا ہے جو اس کے شرابی باپ نے لیا ہوتا ہے۔ بہر حال نواب کا خالو اور اس کے سکول کے اساتذہ اس کی مالی امداد کرتے ہیں۔ نواب پڑھائی چھوڑ کر اپنے باپ کے پیشے کو اپناتا ہے۔ اچانک اس کو ایک روحانی بزرگ سے سڑک پر ملاقات ہو جاتی ہے جس کی وہ اچھی طرح سے خاطر داری کرتا ہے۔ بدلے میں بابا اس کو ایک حویلی اور اس میں چھپے ہوئے خزانے کی جانکاری دیتا ہے۔ جس کی بدولت نواب کی کایا پلٹ جاتی ہے۔ حالانکہ اس کا چاچا اور چاچی رقابت کے جذبے کے تحت نت نئے طریقے ڈھونڈ نکالتے ہیں مگر نواب ہمت و حوصلے سے ان سب کا مقابلہ کرتا ہے یہاں تک کہ دو تین سال جیل کاٹ کر راہِ راست اختیار کر لیتا ہے اور شہر منالی میں ایک ہوٹل کھولتا ہے جس کا نام 'ہوٹل نوابس بُلک کارٹ' (Hotel Nawabs Bullock Cart) ہے۔ بقول

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ڈاکٹر الیاس صدیقی ''زیر نظر ناول نواب بنڈی والا غالباً ان کا پہلا ناول ہے جو بادشاہوں، شہزادوں، جنوں اور پریوں کی تخیلاتی دنیا کے بجائے انسان کی حقیقی زندگی کا عکاس ہے۔

'خوفناک حویلی' باتصویر ناول ہے جس میں اشرف علی کا تبادلہ شانتی نگر ہو جاتا ہے۔ لوگوں کے انتباہ کے باوجود وہ ایک آسیب زدہ حویلی میں سکونت اختیار کر لیتا ہے لیکن ہر قدم پر اسے طرح طرح کی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ حوصلے اور عزم کے ساتھ ان کا مقابلہ تو کرتا ہے مگر آخر کار اپنی جان گنوا بیٹھتا ہے۔ اس کا بیٹا مظہر علی ایک بوڑھے بابا کی مدد سے حالات کی چھان بین کرتا ہے جس کے باعث اسے یہ راز معلوم ہو جاتا ہے کہ حویلی کا مالک زمیندار، اس کا نوکر شنکر اور سرائے کا مالک سبھی اس قتل میں ساجھے دار ہیں۔ قتل کے لیے استعمال ہو رہے افریقی عقاب، خونخوار بلی اور عطر کی شیشی زمیندار کی ملکیت ہوتی ہے۔ یہی گروہ مل کر بچوں کا اغوا کر کے ان کے اعضاء غیر ملکی سوداگروں کو بیچتا ہے اور اس کام کے لیے حویلی استعمال کی جاتی ہے۔ مظہر علی کے توسط سے گوند سیٹھ کا اغوا شدہ بچہ پولیس کمشنر کو غار میں مل جاتا ہے اور بعد میں اعضاء فروشوں کے گروہ کو بھی کشتی سے اترتے ہی پکڑ لیا جاتا ہے۔ زمیندار اور سرائے کے مالک کو کیفر کردار تک پہنچایا جاتا ہے جبکہ مظہر علی کو انعام و اکرام سے نوازا جاتا ہے۔ جاتے سمئے بوڑھا بابا مظہر علی کو ہدایت کرتا ہے کہ گھر کی ذمہ داریاں سنبھالنا اور ماں کی تعظیم کرنا اس کا فرض ہے۔ ساتھ ہی وہ اسکو جھوٹ بولنے، غلط کام کرنے اور دھوکے بازی سے دور رہنے کی بھی ہدایت کرتا ہے۔

ناول 'جانباز شہزادے' میں احمد رضا شاہ سلجوقی کے چار شہزادے، آصف، یونس، عرفان اور شعیب اپنے گمشدہ باپ کو ڈھونڈنے کے لیے اپنی جان جوکھم میں ڈالتے ہیں۔ ان کا باپ شکار پر جاتا ہے جہاں وہ ایک خوبصورت سفید جلد والے بارہ سنگھا کا شکار کرتا ہے جس کی پاداش میں ایک بوڑھا فقیر، جو بارہ سنگھا کا مالک ہوتا ہے، اسے بددعا دیتا ہے۔ گھر واپس آتے ہی بادشاہ عجیب و غریب مرض میں مبتلا ہوتا ہے اور اس کی زندگی کی معیاد صرف ایک مہینہ طے ہوتی ہے۔ تاہم وہ زیادہ سمئے جی سکتا ہے بشرطیکہ بوڑھا فقیر اپنی بددعائیں واپس لے۔ چاروں شہزادے فقیر کی تلاش میں نکل جاتے ہیں۔ چونکہ بادشاہ کے سبھی سنگی ساتھی مر جاتے ہیں اس لیے انہیں کوئی بھی ایسا سراغ نہیں ملتا جو فقیر کا اتا پتا بتا سکے۔ سبھی شہزادے جنگل میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ ایک دوسرے سے بچھڑ جاتے ہیں، پہلا دریا میں ڈوب کر مچھیرے کے جال میں پھنس جاتا ہے، کوئی ایک بڑے گڈھے میں گر جاتا ہے جہاں ایک لڑکی اس کو بچانے میں مددگار ثابت ہوتی ہے، تیسرا قبائل لوگوں میں پھنس کر وہاں سے بھاگ نکلتا ہے جبکہ چوتھا ڈاکوؤں کے نرغے میں

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

پھنس کر طرح طرح کی صعوبتوں سے ہمکنار ہوتا ہے۔ بہر حال کسی نہ کسی غیبی طاقت کی یاوری سے چاروں شہزادے نہ صرف بچ نکلتے ہیں بلکہ ایک دوسرے سے مل بھی جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں انہیں اپنا اپنا ہمسفر بھی مل جاتا ہے۔ آصف کی معشوقہ شگفتہ کشف سے بوڑھے فقیر سے انہیں ملواتی ہے، ان کے ابا کو بددعا سے بچاتی ہے اور اس طرح بادشاہ صحتیاب ہو جاتا ہے۔ بادشاہ کا اپنا ہی بھائی، جس پر وہ بھروسہ کرتا ہے، جب بادشاہ کو مارنے کی کوشش کرتا ہے تو اس وقت بھی شگفتہ اس کی جان بچاتی ہے۔ آخر کار چاروں شہزادوں کی اپنی پسند سے شادی ہو جاتی ہے اور بادشاہ اور اس کی بیگمیں حج کرنے کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں۔

'مہربان جن' میں ایک بدصورت بچے کو اپنی سوتیلی ماں کی یاتناؤں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہاں بھی اس بچے کی مدد کے لیے ایک جن نمودار ہوتا ہے جو اس کو جھوٹے الزاموں سے بچاتا ہے اور صورت کی تقلیب کر کے ایران کے ایک گھرانے میں پہنچا دیتا ہے جہاں دونوں میاں بیوی اس کو اپنا بیٹا سمجھ کر پالتے ہیں۔ البتہ یہاں بھی رقیب پیدا ہوتے ہیں مگر جن کی مہربانی سے نہ صرف وہ ان رکاوٹوں سے نپٹ لیتا ہے بلکہ اپنے اصلی ماں باپ کے پاس جا کر ان کی بھی خبر لیتا ہے اور انہیں خوب مال وزر سے نوازتا ہے۔

'غدّار وزیر' باتصویر ناول ہے جس میں احمد عتیق شاہ سلجوقی کا پہلی بیوی سے ایک لڑکا پیدا ہوتا ہے جن کا نام احمد رضا شاہ رکھا جاتا ہے۔ شکار کے دوران احمد عتیق شاہ ایران کے بادشاہ یونس تبریز کو دلدل میں پھنسنے سے بچاتا ہے جس کے عوض وہ اپنی سات کنیزیں نذرانے میں پیش کرتا ہے۔ بیوی کے مرنے کے بعد وزیر بادشاہ کی دوسری شادی اپنی بہن سے کرواتا ہے اور اس کا بیٹا احمد شریف پیدا ہوتا ہے۔ وزیر چاہتا ہے کہ احمد شریف بادشاہ بن جائے اور خود وہ اس کا سرپرست بن جائے جس کے لیے یا تو بادشاہ کو مارنا ضروری ہے یا پھر پہلے بیٹے احمد رضا شاہ کو۔ کنیزوں کی نگرانی کے باوجود بادشاہ کا قتل کیا جاتا ہے مگر کنیزیں عقلمندی سے احمد رضا شاہ کو خفیہ راستے سے ایران پہنچاتی ہیں جہاں سے وہ یونس تبریز سے مدد لے کر واپس ملک پر حملہ کرتا ہے اور اپنی سلطنت حاصل کرتا ہے۔

ناول 'سازش' میں سیٹھ گوند داس اپنے بھائی اروند داس اور اس کے بیٹے پریم کی پراپرٹی ہتھیانے کے لیے سپاری دیتے ہیں اور پریم کی ماں کو اغوا کر کے اپنی قید میں رکھتے ہیں۔ اروند داس کا قتل ہوتے ہوئے ٹرین میں بیٹھا ایک لڑکا عدنان دیکھ لیتا ہے اور دوسری جانب پریم بچ جاتا ہے۔ پھر حاجی باوا، کلو بابا، سادھو مہاراج اور فادر رابرٹ کی مدد سے یہ راز کھلتا ہے اور گناہ گار اپنے کیے کی سزا پاتے ہیں۔ اس سازش میں

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

گو پولیس کمشنر اور انسپکٹر بھی ملا ہوتا ہے لیکن عین موقعہ پر انسپکٹر جگدیش اور حمید ڈنگر کا ضمیر جاگتا ہے اور وہ سچ کا ساتھ دیتے ہیں۔

'انسانیت اور درندگی' بہت ہی فکر انگیز ناول ہے جس میں عتیق احمد آباد گجرات کے دنگوں میں بچ جاتا ہے مگر دماغی ٹیومر کے سبب انتہائی ذہین ہونے کے باوجود طرح طرح کی بے ڈھنگی حرکتیں کرتا ہے اور نتیجے میں کئی نوکریاں کھو بیٹھتا ہے تاہم اس کی ذہانت اور ایمانداری کی لوگ قسمیں کھاتے ہیں۔ ندیم صاحب اور اگروال برادران کی سرپرستی سے نہ صرف وہ سنبھل جاتا ہے بلکہ اپنی کھوئی ہوئی بہن کو بھی کھوجنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ اس ناول کے توسط سے وکیل نجیب کی ترقی پسندی اور کھلے ذہن کا بھی پتہ چلتا ہے۔ وہ نہ صرف ایمانداری، راست بازی اور انسانیت پرستی (Humanism) کو فوقیت دیتے ہیں بلکہ فرقہ پرستی اور کٹر پرستی کے خلاف بھی آواز اٹھاتے ہیں۔ چنانچہ اس ناول میں دنیش اگروال ان کی ذہنیت کا آئینہ بن جاتے ہیں۔ ملاحظہ ہو چند اقتباسات:

- ''دیکھو بیٹا، مذہب کو اختیار کرنا یہ انسان کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ وہ تو اوپر والا طے کر کے بھیج دیتا ہے کہ کون ہندو بنے گا اور کون مسلمان۔''
- 'حرام اور حلال یہ سب انسان کی بنائی ہوئی چیزیں ہیں۔ جس مذہب کے سربراہ نے اپنے سماج میں جس چیز کو جیسا سمجھا ویسا لوگوں کو سمجھا دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ خدا کو ان سب معاملات میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''
- ''کیا شری رام جی میں اتنی بھی طاقت نہیں تھی کہ ان کے جنم استھان پر بنے ہوئے مندر کو توڑا جائے اور وہ خاموش بیٹھے رہیں یا مندر کی جگہ مسجد بنتی رہے اور وہ خاموش تماشہ دیکھتے رہیں اور اسی طرح جب بابری مسجد کو ہندوستان کے جذباتی ہندو مسمار کر رہے تھے اس وقت خدا بھی تو خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ وہ چاہتا تو اپنے کسی فرشتے کو بھیج کر اس کارروائی کو رکوا سکتا تھا۔''

ناول 'کمپوٹان' میں ایک نوجوان شاہ زیب قبرستان سے خالد جمیل کی لاش نکال کر اپنی تجربہ گاہ میں اس کے اندر ایک کمپوٹر نما نصب کر کے کرا سے اس قابل بناتا ہے کہ وہ چل پھر سکے اور پروگرام کر کے روبوٹ کی مانند کام انجام دے۔ رات کو وہ اسے ناکارہ بنا کر گھر کی ایک مخصوص الماری میں چھپا لیتا ہے۔ نوجوان اس کو سماج میں پل رہی برائیوں کا قلع قمع کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے جیسے کالج کی تقریریں

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

میں رشوت خوری اور کنبہ پروری، محبوب سے دھن کی لالچ میں دغا کرنا، کھیل کود اور کشتی میں گھپلے بازی اور حریف کو منشیات یا زہر دے کر ناکارہ کرنے کی سازش، بستی میں غنڈوں کا آتنک، ممبر پارلیمنٹ کی بے ایمانی وغیرہ۔ اس کے علاوہ 'کمپوٹان' پل ٹوٹنے کے باعث ڈوب رہے بچوں کو بھی ندی سے بچالیتا ہے۔ اس کارروائی کے دوران پولیس اس کا مسلسل تعاقب کرتی رہتی ہے۔ اس کا ہاتھ کاٹ کر اس کی جانچ کرواتی ہے مگر شاہ زیب کمپوٹان کو نت نئے ڈریس پہنا کر اور اس کی رہائش تبدیل کر کے اس پر آنچ نہیں آنے دیتا۔ البتہ خالد جمیل کا کمپوٹر جب آن ہوتا ہے تو اس کے ذہن میں گذشتہ زندگی کی دھندلی سی تصویریں ابھر آتی ہیں اور وہ اپنی فیملی کا دلدر دور کرنے کے لیے کوشش کرتا ہے جس کی وجہ سے پولیس کو اس کے بارے میں سراغ مل جاتے ہیں۔ آخر کار خالد جمیل عرف کمپوٹان اپنے گذشتہ حریف فرنانڈیز کو اسی کا حربہ استعمال کر کے مارنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ آنے والی مصیبتوں کا اندازہ کر کے شاہ زیب کمپوٹان کو تباہ کر دیتا ہے مگر اس کی گذشتہ فیملی کی دیکھ بھال کرتا رہتا ہے اور خود اپنی اسسٹنٹ شازیہ سے شادی کر کے کمپوٹر سنٹر چلاتا ہے۔

'ماں کی بددعا' افسانوی مجموعہ ہے جس میں چار افسانے شامل ہیں۔ پہلا افسانہ 'ماں کی بددعا' فیصل کی کہانی ہے جو ماں کی بددعا پا کر خوار و ذلیل ہو جاتا ہے، طرح طرح کی صعوبتوں سے دوچار ہوتا ہے، آخرش میں ہوش میں آ کر نیکی کا راستہ اپنا لیتا ہے اور ماں اسے خواب میں آ کر معاف کر دیتی ہے۔ مجموعے کا دوسرا افسانہ 'جنگل میں منگل' ہے جس میں اغوا شدہ بچے سریش کو منگل اور پیرو پہلوان بچا لیتے ہیں اور مجرموں کو پولیس کے حوالے کیا جاتا ہے۔ 'جنگل کی دولت' میں چوری کا مال چرانے کے جرم میں گڈریے اور شیخ چلی کو سزا بھگتنی پڑتی ہے۔ 'جنگل کی امانت' کا موضوع عصری اور بہت اہم ہے۔ کہانی میں رامو جنگل سے ایک بندر کو لے جا کر شہر میں اپنے پیشے سے جوڑ لیتا ہے مگر اسے شہر میں ڈھیر ساری مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس لیے واپس گاؤں کا ارادہ کرتا ہے جبکہ بندر کو جنگل میں اپنے فطری ماحول میں چھوڑ دیتا ہے۔

افسانوں اور ناولوں کے علاوہ وکیل نجیب نے سفر نامے بھی قلمبند کیے ہیں۔ سفر نامۂ حج و زیارت مدینہ منورہ میں ڈاکٹر الیاس صدیقی رقم طراز ہیں۔ ''سفر حج کے دوران ایک حاجی اجتماعی تجربات سے زیادہ انفرادی تجربات سے گزرتا ہے۔ بظاہر یہ دکھائی دیتا ہے کہ لاکھوں لوگ بیک وقت ایک جیسا عمل کر رہے ہیں، ایک سمت سفر کر رہے ہیں، یکساں ارکان ادا کر رہے ہیں لیکن ٹھیک اسی وقت ہر حاجی ذاتی اور شخصی تجربے سے گذر رہا ہوتا ہے۔'' وکیل نجیب نے سفر نامۂ حج و زیارت مدینہ منورہ کو روزنامچے کی صورت میں تحریر کیا ہے جو ۲۶ دسمبر ۲۰۰۵ء سے شروع ہوتا ہے اور ۹ فروری ۲۰۰۶ء کو اختتام پذیر ہوتا ہے۔ پڑھتے وقت قارئین کو

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قلم کار اس کو انگلی پکڑ کر ان تمام مقامات پر لے جاتا ہے جہاں سے وہ خود گزر رہا ہے۔ وکیل نجیب نے ہر مرحلے اور ہر مقام کو اختصار کے ساتھ بڑی چابکدستی سے بیان کیا ہے اور راستے میں آئی پریشانیوں سے بھی مطلع کیا ہے۔ انہوں نے نسلی امتیاز اور کوتاہیوں کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ چانچہ لکھتے ہیں۔

''حضرت بلال کی نسل کے لوگوں کی بدتری دیکھ کر افسوس ہوتا ہے جس سرزمین سے مساوات کا پیغام سب سے پہلے بلند ہوا اور جس مذہب نے ہر ایک کو یکسانیت کا درس دیا اسی سرزمین پر، اسی شہر میں اور اسی مقام کے اردگرد یہ حالات دیکھ کر کچھ کمی کا احساس ہوتا ہے۔'' دوسری جگہ لکھتے ہیں: ''انسانی جسموں کی خرید و فروخت اور رسم غلامی کو ختم کرنے پر اسلام میں کبھی کوئی روک نہیں لگائی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم ممالک میں ایک عرصہ دراز تک بردہ فروشی کا سلسلہ چلتا رہا۔'' وکیل نجیب نے سعودی حکومت کے انتظامات کی کوتاہیوں، بھیڑ کے وقت قیمتوں کی گرانی، خیرات مانگنے والے مردوں عورتوں اور خاص کر اپاہجوں کی لاچاری، ڈاکٹروں کی لاپرواہی اور ہندوستان کے مفت میں حج کی سعادت حاصل کرنے والے خدام کی بلیک مارکٹنگ اور کم ظرفی پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ لکھتے ہیں کہ ''ان حالات میں یہاں مسلمان حبشیوں کی بدحالی سعودی حکومت پر ایک بدنما داغ ہے۔'' ان سب سے قطع نظر کر کے حج کے دوران زائرین جس وجدان (Ecstasy) کا تجربہ کرتے ہیں وہ الفاظ کی گرفت میں لانا کسی سفرنامہ نگار کے بس کی بات نہیں ہے تاہم وکیل نجیب نے اپنے بیانیہ اور خوبصورت منظر نگاری سے بڑی ہنرمندی سے یہ مرحلہ طے کیا ہے۔ سفرنامے میں ایک جگہ فرماتے ہیں۔

> ''دنیا کا اتنا بڑا مذہبی مجمع لیکن میں نے آج تک کسی کو حجت حقارت کرتے نہیں دیکھا۔ سب ایک دوسرے کو راستہ دیتے ہیں۔ اگر کوئی بنا جائے نماز کے آئے تو اس کے لیے اپنی جائے نماز آڑی کر دیتے ہیں۔ انسانوں کا ایک ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہے جو ہر لمحہ موجزن نظر آتا ہے۔''

ایک اور جگہ رقم طراز ہیں:

> ''کہاں کہاں کی خواتین ہیں جو آج سے پہلے ایک دوسرے کو جانتی پہچانتی نہیں تھیں، یہاں آ کر ایک رشتہ قائم ہو گیا ہے۔ کوئی خالہ کہہ رہا ہے، کوئی باجی کہہ رہا ہے، کوئی بھابی کہہ رہا ہے، ایک دوسرے کی مددگار ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شامل۔''

ادب کا سب سے بڑا پھندہ یہ ہے کہ اکثر ادیب موجودہ دور کے مسئلہ جات کے حل کے لیے اپنے مذہب کی مکمل پیروی اور اس کے اصولوں پر ہر دم عمل کرنے پر زور دیتے ہیں۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

اگر کسی ایک مذہب میں ان سارے مسائل کا حل ہوتا تو لوگ خوشی خوشی اس مذہب کے اصولوں اور عقائد پر عمل کرتے اور ان مسائل سے نجات پاتے۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ لٹریچر کی آفاقیت کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ادیب تہذیبی اور مذہبی سرحدوں سے باہر نکل کر ان مسائل کا حل ڈھونڈے، ان پر غور و فکر کرے اور پھر تسلی بخش حل قارئین کے سامنے پیش کرے۔ مجھے یہ لکھنے میں کوئی باک نہیں کہ وکیل نجیب نے اکثر و بیشتر جگہ معروضیت سے کام لیا ہے اور کھلے ذہن سے مسئلوں کا حل ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے تاہم کہیں کہیں اجتماعی ردعمل کے ڈر سے انفرادی سوچ کو یا تو بالواسطہ پیش کیا ہے یا پھر ابہام کا استعمال کیا ہے۔ انہوں نے بچوں کی ضرورتوں کو سمجھ کر ہی کہانیوں کے پلاٹ بنائے ہیں اور ان میں واقعات کا تسلسل، حیرت و استعجاب اور تجسس اول سے اخیر تک توازن کے ساتھ بنائے رکھے ہیں۔ ان کہانیوں میں اخلاق واقدار سے وابستہ پند و نصائح لال و گہر کی مانند سموئے ہوئے ہیں جو کم سن ذہنوں کی نشو و نما کے لیے مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ وکیل نجیب انہی خوبیوں کے سبب اردو ادب میں نسل در نسل یاد رکھے جائیں گے۔

❖ ❖ ❖

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

تبصرے

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

فسانے منٹو کے اور پھر بیاں اپنا

—— خالد اشرف

سعادت حسن منٹو پر لکھی گئی کئی کتابیں منصۂ شہود پر نمودار ہو چکی ہیں جن میں اکثر و بیشتر اوریجنل ہیں جبکہ چند ایک مثلاً جگدیش چندر ودھاون کی 'منٹو نامہ' سرقے اور کٹ اینڈ پیسٹ کی مثال بن کر رہ گئی ہیں۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے ڈاکٹر برج پریمی کے مقالے 'سعادت حسن منٹو۔ حیات اور کارنامے' کی کتابت کرنے کا اور ہر باب کی ابتداء میں منٹو کی تصویر بنانے کا موقعہ ملا جس کے باعث مجھے منٹو سے عجیب قسم کا لگاؤ پیدا ہوا۔ آج ڈاکٹر خالد اشرف کی تصنیف 'فسانے منٹو کے اور پھر بیاں اپنا' پڑھ کر مجھے یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ منٹو پر لکھی گئی ایسی جامع، عمیق اور اطمینان بخش تصنیف اس سے پہلے نظر سے نہیں گزری ہے۔ پروفیسر محمد حسن نے اس کوشش کو 'منٹو پر اطلاقی تنقید کے آغاز' کا درجہ دیا ہے۔

مذکورہ کتاب چار ابواب میں تقسیم کی گئی ہے۔ پہلے باب میں سعادت حسن منٹو کی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسرے باب میں منٹو کی تصانیف کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے جبکہ تیسرے باب میں منٹو کے فن کے مختلف پہلوؤں اور نظریات پر بحث کی گئی ہے۔ چوتھے باب میں منٹو کے تیس مشہور افسانوں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

پہلے باب 'زندگی: ایک ٹیڑھی لکیر' میں یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ منٹو متوسط کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھنے کے باوجود بچپن ہی میں بگڑ چکا تھا، تعلیم چھوڑ کر ممبئی پہنچ گیا، در در کی ٹھوکریں کھانے کے بعد

ناشر: مصنف، کے ایم کالج، دھلی یونیورسٹی، دھلی ۱۱۰۰۰۷ سن اشاعت ۲۰۰۶ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

واپس آ کر کامریڈ باری علیگ کی سنگت میں استرائی بن گیا، ایک دو کتابوں اور روسی افسانوں کے ترجمے کیے اور پھر ممبئی کی راہ اپنالی۔ بیچ میں دلی ریڈیو کے ساتھ بھی وابستہ رہا مگر زندگی کا اہم حصہ ممبئی کی فلم نگری ہی میں گزارا۔ ممبئی میں اندھی متعفن گلیوں میں رہائش پذیر ہوا جہاں طوائفوں، دلالوں اور پنواڑیوں سے روبرو ہونے کا موقعہ ملا۔ یہاں فلموں کے اسکرپٹ لکھے، مکالمے لکھے، فلمی ہستیوں کے اندر باہر جھانکا اور ایک فلم میں پاگل کا رول بھی ادا کیا۔ کبھی روپے پیسے کی کمی کے باعث پریشاں رہا اور کبھی سخی حاتم کی طرح یاروں دوستوں پر دولت لٹاتا رہا۔ اپنی پوری زندگی سگریٹ اور شراب کی نذر کی، آئے دن عدالتوں میں پیش ہوتا رہا اور آخر کار بٹوارے کی ہولناکیوں کی تاب نہ لا کر کراچی کے راستے لاہور پہنچا جہاں اس نے ۴۵ سال کی عمر میں ہی دم توڑ دیا۔ بقول خالد اشرف ''منٹو کو مذہب اور مذہبی اداروں سے دور کا تعلق تھا بلکہ کدتھی۔'' یہی وجہ ہے کہ فسادات کے بارے میں جتنے بھی ' ' نے اس نے لکھے ان میں کسی بھی فرقے کی طرفداری نہیں کی۔ چنانچہ افسانہ 'سہائے' میں رقم طراز ہے۔ ایک لاکھ ہندو مار کر مسلمانوں نے یہ سمجھا ہوگا کہ ہندو مذہب مر گیا لیکن وہ زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔ اسی طرح ایک لاکھ مسلمان قتل کر کے ہندوؤں نے بغلیں بجائی ہوں گی کہ اسلام ختم ہو گیا۔ مگر اسلام پر ایک ہلکی سی خراش بھی نہیں آئی۔ وہ لوگ بے وقوف ہیں جو سمجھتے ہیں کہ بندوقوں سے مذہب شکار کیا جا سکتا ہے۔''

تنقید نگار نے البتہ لفظ 'منٹو' کے بارے میں صحیح نتیجہ نہیں نکالا ہے۔ پرانے زمانے میں چھٹانک، رتی، تولہ، ماشہ، سیر، من وغیرہ کے باٹ ہوتے تھے جن سے مختلف اشیاء کا وزن کیا جاتا تھا، کشمیر میں ڈیڑھ سیر کے باٹ کو 'منوٹ' (Manut) کہا جاتا تھا جس کی بنا پر سعادت حسن کے خاندان کا نام مَنٹو (بالفتح م) پڑ گیا ہوگا کیونکہ کشمیر میں بیشتر ذاتیں دراصل عُرف (Nickname) سے ہی منسوب ہیں۔ کشمیر سے منٹو کا تعلق یوں بھی اس کے کئی افسانوں سے ظاہر ہوتا ہے حالانکہ وہ خود کبھی کشمیر نہیں جا پایا۔ البتہ ایک بار بٹوت میں رہ کر لوٹ آیا۔ اس قیام کے بارے میں اس نے چند ایک افسانے تحریر کیے ہیں۔ اس کے کئی کردار خاص کر طوائفیں کشمیری نژاد ہیں۔ مسئلہ کشمیر پر بھی اس نے چند افسانے تحریر کیے ہیں (یزید، ٹیٹوال کا کتا وغیرہ)۔ کئی جگہوں پر کشمیری اجناس کا ذکر بھی ملتا ہے۔ منی افسانہ 'مزدور' کشمیری مزدور پر مرکوز ہے۔

بہر حال منٹو کی حیات کے حوالے سے مجھے ایک بات کی کمی ہمیشہ محسوس ہوئی اور وہ ہے منٹو کے سوانحی اور نفسیاتی توضیحات کی عدم موجودگی۔ منٹو نے اپنے دوست احباب کی خاکہ نگاری تو کی مگر منٹو پر کسی قریبی رفیق نے کچھ بھی نہ لکھا۔ منٹو کے دوست جو میخانوں میں اس کا ساتھ دیتے تھے یا وہ احباب جو لال کرتی میں اس

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

کے ساتھ اوباشیوں میں شریک ہوتے تھے ہمیشہ چپ رہے۔ شاید اس لیے کہ وہ قلمکار نہیں تھے یا پھر منٹو کی طرح بے باک اور نڈر نہیں تھے۔ اس طرح منٹو کی زندگی کا یہ شعبہ در پردہ ہی رہ گیا۔ اس کے باوجود خالد اشرف نے منٹو کی شخصیت کے ہر شعبے پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے اور اسے متبرک مجسمے کی مانند کھڑا کرنے کے بجائے گوشت پوست کے انسان کی طرح ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔

'تصانیف کا اجمالی جائزہ' میں خالد اشرف نے منٹو کے افسانوں، خاکوں اور مضامین کی مجموعی تعداد اور زمانی تسلسل کے حساب سے فہرست سازی کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان افسانوں پر مختصر طور پر روشنی بھی ڈالی گئی ہے۔ افسوس کہ منٹو نے بہت عرصے تک ریڈیو میں بھی کام کیا ہے اور وہاں پر لکھے گئے ریڈیائی ڈراموں کی مکمل مِتی وار تفصیل ابھی تک حاصل نہیں کی گئی کیونکہ اس میدان میں کسی نے سنجیدگی سے دلچسپی نہیں دکھائی۔ منٹو کے فلمی اسکرپٹ بھی اس کے فن کا اہم حصہ بن سکتے ہیں۔

'فن کے مختلف پہلو اور نظریہ' میں خالد اشرف نے پہلے اس دور کا جائزہ لیا ہے جس میں منٹو، کرشن چندر، بیدی، اشک اور عصمت چغتائی خامہ فرسائی کرتے رہے۔ ۱۹۳۲ء میں 'انگارے' نے ادبی حلقوں میں جو آگ لگائی اس کے نتیجے میں ادیبوں کا ایک بڑا کارواں، جس میں منٹو بھی شامل تھا، ترقی پسند تحریک کا ہمنوا بن گیا مگر جلدی ہی فرائیڈ کے خیالات نے انٹلکچول طبقے میں تلاطم بپا کر دیا۔ چونکہ منٹو کی طبیعت ترقی پسندی کے ساتھ پوری طرح میل نہیں کھاتی تھی اس لیے اس نے نفسیاتی و جنسیاتی موضوعات پر قلم اٹھایا۔ نتیجتاً ترقی پسندوں نے منٹو سے کنارہ کشی اختیار کر لی مگر منٹو کا حلقۂ اثر روز بروز بڑھتا گیا۔ منٹو نے اس دور میں کئی خوبصورت افسانے لکھے جن میں سے دو تین افسانوں کے لیے اس پر عدالتی کاروائی بھی کی گئی۔ تقسیم ملک کے بعد ایک نئے دور کا آغاز ہوا جس نے ایک نئے منٹو کو جنم دیا۔ اس منٹو نے ایک طرف ٹوبہ ٹیک سنگھ اور کھول دو جیسے افسانے اردو ادب کو دیے اور دوسری طرف وہ شراب کی بوتل کی خاطر بے تحاشہ افسانے لکھتا رہا۔ اس باب میں تنقید نگار نے اکثر و بیشتر افسانوں کا مرکزی خیال پیش کر کے منٹو کے افسانوں کے تنوع کو ظاہر کیا ہے۔ خالد اشرف نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ''منٹو کے افسانے عموماً کرداری افسانے نہیں ہیں کیونکہ وہ کردار سے زیادہ تھیم پر توجہ دیتے تھے۔'' میں اس بات سے اتفاق نہیں کرتا کیونکہ منٹو کے بیشتر افسانے کردار کو محور بنا کر اسی کے ارد گرد گھومتے ہیں۔ مثلاً سہائے، ممی، موذیل بابو گوپی ناتھ، خوشیا، جانکی ٹوبہ ٹیک سنگھ، شاردا ممد بھائی وغیرہ اگلے باب میں افسانوں کا تجزیہ کرتے وقت خود تنقید نگار بھی اس بات کی تصدیق کرتے ہیں۔

افسانوں کا جائزہ لیتے ہوئے خالد اشرف رقم طراز ہیں: ''منٹو کے افسانوں کی بڑی تعداد ایسی ہے

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

جہاں کردار اور واقعات پس ماندہ طبقات سے اخذ کیے گئے ہیں۔ ویسے بھی طوائفیں، کوچوان، دلال، پہلوان، غنڈے، چاقو باز، شرابی اور گھریلو ملازم جتنی بڑی تعداد میں منٹو کی تخلیقات میں سانس لیتے ہیں اور چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ اتنے کسی دوسرے افسانہ نویس کے یہاں نہیں ملتے۔'' اسلوب کے بارے میں تنقید نگار فرماتے ہیں کہ منٹو کے یہاں کرشن چندر کی طرح شاعرانہ زبان نہیں ملتی۔ وہ بنیادی طور پر مدنی (Urban) ہیں حالاں کہ چند ایک افسانے دیہی پس منظر میں بھی لکھے گئے ہیں۔ منٹو کے چند افسانے جدید علامتی انداز میں بھی لکھے گئے ہیں۔ شاید یہ مبالغہ نہ ہو کہ 'پھند نے' اُردو لٹریچر میں جدید اسلوب کا پہلا افسانہ تھا۔ افسانچوں (منی افسانوں) کی داغ بیل بھی سعادت حسن منٹو نے ہی ڈالی جس کے دلائل خالد اشرف یقینی طور پر پیش کرتے ہیں۔ بقول خالد اشرف ''بلاشبہ منٹو بیسویں صدی کی چوتھی پانچویں اور چھٹی دہائی کے ایک بڑے افسانہ نگار تھے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ منٹو کے کمزور اور معمولی افسانوں کی فہرست بھی خاصی طویل ہے۔''

خالد اشرف نے تجزیے کے لیے جن افسانوں کا انتخاب کیا ہے ان کے نام ہیں: بابو گوپی ناتھ، ٹوبہ ٹیک سنگھ، نیا قانون، خوشیا، ہتک، ۱۹۱۹ء کی ایک بات، سوراج کے لیے، بلاؤز، دھواں، بو، کالی شلوار، جانکی، شاردا، ممی، موذیل، ٹھنڈا گوشت، ننگی آوازیں، کھول دو، سہائے، رام کھلاون، آخری سلیوٹ، ٹیٹوال کا کُتا، دو قومیں، شاہ دولے کا چوہا، نعرہ، سیاہ حاشیے، کبوتروں والا سائیں، ممد بھائی، دودا پہلوان اور پھوجا حرام دا۔ ان تجزیات کا فرداً فرداً ذکر کرنا یہاں مناسب نہیں البتہ اتنا ضرور ہے کہ ان سے اخذ کیے گئے نتائج کو مختصراً پیش کیا جا سکتا ہے۔

- منٹو کے اکثر کردار باہر سے کرخت مگر اندر نرم دل ہوتے ہیں وہ مجبوراً بُرے پیشے تو اختیار کرتے ہیں۔ مگر انسانیت اور ہمدردی کا دامن نہیں چھوڑتے۔
- جنس (سیکس) انسانی زندگی کا محور ہے اور اس کے بنا زندگی نباہنا بہت مشکل ہے۔ یہ عمر اور طبقے کا لحاظ نہیں کرتا۔ جنسی آسودگی میں فطری عمل غیر فطری کوششوں کے بہ نسبت زیادہ کارگر ثابت ہوتا ہے۔ (افسانہ بُو)۔ جنسی کجرویاں فطرت کے خلاف ہیں اور شخصیت پر منفی اثر ڈالتی ہیں۔
- توہم پرستی انسانی سرشت میں ہے مگر اولاد کی محبت تو اس سے بھی بڑھ کر ہے۔

(شاہ دولے کا چوہا)

- انسان پیٹ کی خاطر کچھ بھی سہہ لیتا ہے مگر اَنا (Ego) کی ٹھیس برداشت نہیں

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

کرپاتا۔

(خوشیا/ھتک)

- آزادی کی لڑائی کے دوران ہندوستان کے نچلے طبقے کے لوگ نہ صرف برطانوی حکمرانوں سے نفرت کرتے تھے بلکہ اپنے ملک کے سرمایہ داروں سے بھی تنگ آچکے تھے۔ آزادی کی خاطر ان گنت غریب لوگوں نے قربانیاں دیں مگر وہ تواریخ کی شاہ سرخیاں نہیں بنیں۔

(نیا قانون /۱۹۱۹ءکی ایک بات)

- تقسیم ہند کے حوالے سے لکھے گئے افسانوں کے کردار جو بہیمیت اور خونریزی کے پیکر بن جاتے ہیں مختلف مذہبوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ 'کھول دو' میں تو سکینہ کو اپنے ہی ہم مذہب سوشل ورکر آبروریزی کرتے ہیں۔
- ٹوبہ ٹیک سنگھ صرف ایک افسانہ نہیں بلکہ بٹوارے کا علامیہ ہے جس میں پاگل خانے کے اندر اور باہر کے مناظر میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

'فسانے منٹو کے اور پھر بیاں اپنا' منٹویات میں اہم اضافہ ہے اور حوالہ جاتی حیثیت رکھتی ہے۔ خالد اشرف نے بڑی دقیقہ شناسی اور عرق ریزی سے اس تصنیف کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے۔ آخر میں مذکورہ کتاب کے بارے میں وارث علوی کے تاثرات پیش کرتا ہوں:۔ ''یہ کتاب بڑی محنت، محبت اور دقتِ نظر سے لکھی گئی ہے۔ یہ کتاب ثبوت ہے اس بات کا کہ جب ایک بڑے فن کار کا جادو ایک باشعور نقاد کے سر چڑھ کر بولنے لگتا ہے تو کیسے صریر خامہ نوائے سروش بنتا ہے۔''

❖ ❖ ❖

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

منٹوشناسی اور شکیل الرحمٰن

—— کوثر مظہری

'منٹوشناسی اور شکیل الرحمٰن' میں ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کے تحریر کیے ہوئے منٹو کے پندرہ افسانوں کے تجزیے، 'سیکس' اور 'سعادت حسن منٹو اور ٹریجڈی کی جمالیات' پر لکھے گئے دو مضامین اور منٹوشناسی پر پندرہ نامور ادیبوں کے ریویو شامل ہیں۔ مذکورہ کتاب کی ترتیب معروف نقاد اور نثر نگار کوثر مظہری نے دی ہے جن کی تبحر علمی کا اندازہ ان کی تحریر کی ہوئی تصانیف سے لگایا جاسکتا ہے۔ جمالیاتی تنقید کے موجد شکیل الرحمٰن نے ان تجزیوں کے توسط سے منٹو کی شخصیت اور فن پر نئے زاویوں سے روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے تجزیوں کی شروعات کسی قصے، تلمیح یا تمثیل سے کی ہے جو نہ صرف افسانے کے ادراک کے لیے راستہ ہموار کرتی ہے۔ بلکہ منٹویات کے لیے 'کھل جا سم سم' کا کام بھی کرتی ہے۔ شکیل الرحمٰن نے منٹو سے متعلق بہت سارے غلط تصورات کو بھی دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ منٹوشناسی پر لکھے گئے جو تبصرے شامل کیے گئے ہیں نہ صرف کتاب کی خوبیوں اور خامیوں کا احاطہ کرتے ہیں بلکہ ان سارے نکتوں کو، جن پر شکیل الرحمٰن نے رائے زنی کی ہے، زیر بحث لاتے ہیں تاکہ منٹو کے فن پر مزید روشنی ڈالی جاسکے۔ بقول شکیل الرحمٰن ''سعادت حسن منٹو اردو فکشن کی آبرو ہیں''۔

اپنے مقالے 'سعادت حسن منٹو اور ٹریجڈی کی جمالیات' میں شکیل الرحمٰن نے منٹو کے بارے میں اپنے تاثرات کا یوں اظہار کیا ہے۔ ''سعادت حسن منٹو اردو فکشن میں ٹریجڈی اور اس کی جمالیات کے ایک

ناشر: نرالی دنیا پبلی کیشنز، دھلی گیت، دریاگنج، نئی دھلی۔۱۱۰۰۰۲ سن اشاعت۔۲۰۰۸ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

بڑے تخلیقی فن کار ہیں کہ جنھوں نے سچائی تک پہنچنے کے لیے باطن کی راہ پسند کی، سائیکی (Psyche) میں اترنے کی کوشش کی اور انسانی وجود کی نفسیاتی الجھنوں (Complexities) پر گہری نظر رکھی۔'' منٹو کا تقابل اس کے ہم عصروں سے کرتے ہوئے موصوف فرماتے ہیں کہ ''کرشن چندر کے کردار اور موضوعات ندی کے بہت ہی صاف پانی کا احساس بخشتے ہیں۔۔۔۔ راجندر سنگھ بیدی اور عصمت چغتائی کے موضوعات، واقعات اور کردار کبھی ندی کی گہرائیوں میں لے جاتے ہیں کہ جہاں پانی میلا نظر آتا ہے اور کبھی ندی کے صاف وشفاف پانی کا احساس دلاتے ہیں..... سعادت حسن منٹو کے افسانے اور کردار عموماً ''ندی کی بہت گہرائی میں ہوتے ہیں کہ جہاں اندھیرا ہے، اندھیرے یا گہری تاریکی سے یہ کہانیاں باہر آتی ہیں اس سطح پر بھی جہاں پانی کا رنگ میلا ہو اور اس سطح پر بھی کہ جہاں پانی بہت ہی صاف وشفاف ہے۔'' یہی وجہ ہے کہ منٹو کو اس کے کرداروں سے الگ کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ اس کے یہاں اکثر وبیشتر معاشرے کے ادنیٰ طبقے کے کردار جیسے طوائفیں، دلال، کوچوان، مزدور اور پہلوان وغیرہ ملتے ہیں۔ ان میں سے کئی کردار انسان دوست، فیاض وسخی ہیں اور خود فریبی میں مبتلا ہیں مثلاً بابو گوپی ناتھ، سہائے، ممی وغیرہ۔ یہ لوگ کیچڑ میں رہ کر بھی کنول کی طرح مسکراتے ہیں اور آخر کار اپنی نیک خصلت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ 'ممی' کے بارے میں شکیل الرحمٰن رقم طراز ہیں کہ ''ممی ان سب کے لیے پی کوک ویل (Peacock well) ہے، ایسا آرکی ٹائپل پیکر ہے جو محبت اور شفقت کا سرچشمہ ہے۔''

منٹو نے اپنے افسانوں میں علامتوں کا استعمال بھی بڑی خوبی سے کیا ہے۔ چنانچہ بشن سنگھ (کردار) اور ٹوبہ ٹیک سنگھ (مقام) ایک ہو کر رہ گئے ہیں اور یہ افسانہ بٹوارے کے پاگل پن کا استعارہ بن کر رہ گیا ہے۔ ان کے افسانوں میں کئی کردار ایسے ہیں جو المیہ سے ہم کنار ہوتے ہیں۔ بقول شکیل الرحمٰن ''ٹریجڈی کو ادب میں سب سے اونچا مقام حاصل ہے اور منٹو کے المیے اس کسوٹی پر کھرے اترتے ہیں۔'' اسی طرح افسانہ ٹھنڈا گوشت کا تجزیہ کرتے ہوئے موصوف فرماتے ہیں کہ ''سعادت حسن منٹو اردو فکشن کے سب سے بڑے المیہ نگار اور المیہ کرداروں کے خالق ہیں۔ منٹو کے افسانوں میں جو ڈرامائیت ہے وہ ان کے تاثر کو دوبالا کرتی ہے۔ ان کا 'وژن' ایک انسان دوست (Humanist) کا ہے جس کی مثالیں ٹوبہ ٹیک سنگھ، سہائے، شاردا اور بابو گوپی ناتھ جیسے افسانوں میں ملتی ہیں۔ بقول شکیل الرحمٰن ''منٹو کے افسانوں کا تقاضا یہ ہے کہ آنکھیں کھولے ہوئے آؤ اور ان واقعات اور کرداروں کو بھی دیکھو جو دھرتی کے اندر سے نکلے ہیں اور نکل رہے ہیں۔'' منٹو پر کئی الزامات لگائے جا چکے ہیں اور کئی بار انہیں عدالتوں میں حاضری بھی دینی پڑی۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

اس کے باوجود وہ اپنے موقف پر ڈٹے رہے اور اپنے نظریے کا دفاع کامیابی سے کرتے رہے۔

حقیقت نگاری میں بھی منٹو اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ان کے یہاں حقیقت نگاری ''آرٹ کی داخلی منطق'' کے مطابق ہے۔ اس بارے میں شکیل الرحمٰن فرماتے ہیں:۔ ''سعادت حسن منٹو کی حقیقت نگاری پر زور ڈالنے والے اس بات کو یاد رکھیں کہ ان کے افسانوں میں جو چیزیں خلق ہوگئی ہیں وہ دوسری اور بھی سچائیوں کی جانب اشارہ کرتی ہیں'' مصنف ایک اور جگہ فرماتے ہیں: ''سعادت حسن منٹو کی تخلیقی فن کاری کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ فنکاری قاری کو مرکزی کردار کے تجربوں میں شریک کر دیتا ہے۔ ان کے بیشتر خوبصورت افسانوں کا اسلوب اور انداز بیاں ایسا ہے کہ ہم تماشائی نہیں رہ جاتے ہیں کہانی میں شریک ہو جاتے ہیں''۔ شکیل الرحمٰن نے منٹو کے یہاں عورت کے حسن و جمال خصوصاً پستانوں کی پیکر نگاری کو اعلیٰ درجے کا قرار دیا ہے جو افسانہ نگار کی عظمت کا ایک اہم ستون ہے۔

'سیکس' عنوان سے لکھے گئے مضمون میں انہوں نے مغربی اور مشرقی روایات اور اس بارے میں منٹو کے خیالات کا بخوبی جائزہ لیا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تجزیہ نگار نے منٹو کی جمالیات کا تجزیہ ہندوستان اساطیر کے تناظر میں کیا ہے کیونکہ قدیم ہندوستانی ادب اور مجسمہ سازی میں جنس کو شجر ممنوعہ (Taboo) نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ''تانتر'' بقول شکیل الرحمٰن ''کہتا ہے کہ سیکس سے بڑی بنیادی سچائی اور کوئی نہیں ہے۔'' افسانہ 'بو' کو ادبھت وبھو (Adbhutha Vibhava) کا ایک خوبصورت یادگار افسانہ قرار دیا ہے جبکہ 'ہتک' اور 'خوشیا' میں انا کو ٹھیس لگنے پر انسانی ردعمل کی دو مختلف مگر فطری جہتیں ہمارے سامنے آتی ہیں جو ممکنات کی حدود سے گریز نہیں کرتیں۔ 'موذیل' کے بارے میں شکیل الرحمٰن فرماتے ہیں کہ ''موذیل ایک نغمہ ہے جو زندگی اور وجود کے آہنگ اور فنکار کے مشاہدے اور اس کی شفاف بصیرت کی وحدت سے خلق ہوا ہے۔'' ''ستاردا'' ''نغمۂ محبت کا آہنگ ہے جو کہانی میں پھیلا ہے''۔ 'شاہ دولے کا چوہا' توہم پرستی، اولاد کی محبت اور احساس گناہ کی کہانی ہے۔ ''سہائے سڑک پر ایک کھلی کتاب کی مانند پڑا ہوا ہے۔ یہ صحیفہ بھی اپنی جگہ بہت قیمتی ہے''۔ ''کہانی 'کھول دو' میں تاریخ، معاشرہ اور کلچر اور ان میں سانس لیتے ہوئے انسانوں کے معنی خیز امیجز موجود ہیں۔'' ''ٹھنڈا گوشت' میں خونی ایشر سنگھ کی مردہ صحبتی (Necrophilia) اس کے روح کو زخمی اور لہولہان کر دیتی ہے جو اس کی سائیگی کی گہرائی میں اتر کر اس کے حواس کو مختل کر دیتی ہے۔ سرمے کی پابندی فہمیدہ کے تحت الشعور میں اختلال پیدا کرتی ہے اور وہ دوسرے طریقوں سے اس کا اظہار چاہتی ہے۔ ممد بھائی بھی سعادت حسن منٹو کا ایک یادگار کردار ہے۔ اس کی مونچھیں اس کے تحت الشعور میں گڑھی ہوتی

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ہیں لیکن جب یہ مونچھیں نہیں رہیں تو پورے وجود کا ماسک (Mask) اتر جاتا ہے۔ ایک دوسری شخصیت سامنے آتی ہے۔''

منٹو کی کہانیوں کی خامیوں کی نشاندہی بھی شکیل الرحمٰن نے بڑی خوبی سے کی ہے۔ 'ممی' کی طوالت اور غیر ضروری واقعات کا بیان تھیم کو دھندلا کر دیتے ہیں اور کردار کے ارتقاء پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ 'سرکنڈوں کے پیچھے' کی ڈرمائی اذیت رسانی (Dramatic Sadism) امکان کے حدوں کو پھلانگتا ہے اور افسانے کو کمزور بنا دیتا ہے۔

جہاں تک 'منٹو شناسی' پر لکھے گئے مختلف تجزیوں کا سوال ہے۔ یہ سبھی معیاری اور مدلل ہیں۔ تجزیہ نگاروں نے ہر کہانی کا اپنے ڈھنگ سے محاسبہ کیا ہے اور کتاب کے مثبت و منفی نکتوں پر بحث کی ہے۔ بقول بلراج کومل ''شکیل الرحمٰن نے منٹو شناسی میں ہر قسم کی طرفداری سے احتراز کیا ہے۔ تمام تر مشتہر مفروضوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھا ہے۔'' بابو گوپی ناتھ کے تجزیے پر اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے اظہار خضر فرماتے ہیں کہ ''بظاہر تو یہ باغیانہ لہجہ ہی منٹو کے فن کا شناخت نامہ ہے۔ لیکن بہ باطن اس میں منٹو کا اصلاح پسند ذہن کارفرما نظر آتا ہے۔'' اے خیام نے ممتاز شیریں کے مضمون 'منٹو ایک اخلاقی فنکار' کا حوالہ دیتے ہوئے اپنے تاثرات یوں قلمبند کیے ہیں۔ ''منٹو کے اکثر افسانوں میں ابہام تو شاید نہ ہو لیکن پوشیدہ رمز و اشارے یقیناً ہیں۔'' بقول حقانی القاسمی ''شکیل الرحمٰن نے منٹو کو مکمل طور پر سمجھا ہے اور ان کی نفسیاتی گرہوں کو سلجھانے کی اچھی کوشش بھی کی ہے۔ منٹو کی جمالیاتی جہتوں نے کا ادراک کرتے ہوئے انہوں نے یہ اشارہ دیا ہے کہ منٹو کائنات کے اسرار و رموز کا عارف ہے اور Biology of beauty پر ان کی نگاہ اتنی گہری ہے کہ جمالیات کی روح تک رسائی حاصل کی ہے اور کائنات کی سب سے خوبصورت شئے کا اکتشاف کیا ہے۔ عورت کے جسم میں جو Symmetry ہے اور جسمانی کشش کا جو معیار ہے منٹو اس سے آگاہ تھے۔''

کوثر مظہری نے مذکورہ کتاب کی از سر نو ترتیب دے کر اور اس میں مشاہیر کے تجزیے جوڑ کر اردو ادب پر بڑا احسان کیا ہے۔ ان کے حسن ترتیب کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ 'منٹو شناسی اور شکیل الرحمٰن، منٹویات میں ایک اہم اضافہ ہے جو نہ صرف حوالہ جاتی حیثیت کی حقدار ہے بلکہ عام قارئین کے لیے منٹو کو سمجھنے کے لیے بہت ضروری بھی ہے۔ اس سے قطع نظر میں پھر بھی یہ سمجھتا ہوں کہ سعادت حسن منٹو پر ابھی بہت کام ہو سکتا ہے۔ اس کی شخصیت کے کئی گوشے اور اس کے فن کے کئی ابعاد ابھی دنیائے ادب سے پوشیدہ ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ مستقبل میں اس جانب اور بھی پیش رفت ہوگی۔ ❖ ❖ ❖

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

دُعا زمین

پروین کمار اشکؔ

غزل مایوس ہو کر ہر جگہ سے
کھڑی ہے میرے در پر رو رہی ہے

پروین کمار اشکؔ کا تازہ ترین غزلوں کا مجموعہ 'دعا زمین' حال ہی میں منظر عام پر آچکا ہے۔ اس سے پہلے موصوف کے تین اور مجموعے 'چاندنی کے خطوط'، 'غزل تیرے شہر میں' اور 'در بدر' شائع ہو چکے ہیں جن کی کافی پذیرائی ہوئی۔ پروین کمار اشک کو ادب ورثے میں ملا ہے۔ ان کے والد مرحوم جناب کلونت رائے کنولؔ ہوشیار پوری اُردو ادبی مجلّہ 'جنم بھومی' کے ایڈیٹر تھے۔ پروین کمار لدھیانہ پنجاب میں یکم نومبر ۱۹۵۱ء کو پیدا ہوئے۔ انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کر کے وہ محکمہ آبپاشی پنجاب میں ملازم ہوئے اور آج کل تعلقات عامہ کے افسر ہیں۔ ان کے نغمے فلموں اور موسیقی کے البموں کے ذریعے سامعین کو لبھاتے رہے ہیں۔ ناشر کا یہ دعویٰ ہے کہ "دعا زمین کی غزلوں میں بندہ وخدا، جسم وروح، زمین وآسمان، ذات وکائنات کے تمام درمیانی فاصلے ختم ہوتے جاتے ہیں۔ اس لیے 'دعا زمین' کی شاعری اپنے مومن ضمیر قاری کو دل دماغ اور روح تینوں سطحوں پر انشاء اللہ وجدانی سرور عطا کرے گی۔" اور مجھے اس پر لبیک کہنے میں ذرا بھر بھی ہچکچاہٹ نہیں ہوتی۔

پروین کمار اشکؔ کی شاعری کی تین جہات ہیں۔ انفرادی، سماجی اور سیاسی۔ وہ انسانی مسائل کو اپنی

ناشر: غزلستان، تی /۱۶۱/۴، شاہ پور کنڈی، ٹاون شپ، نزد پٹھانکوت، پنجاب سن اشاعت: ۲۰۰۹ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

8 ذات کا حصہ بنا کر غزلوں میں ڈھالتے ہیں۔ حالانکہ انہوں نے سکوتِ پنجاب کے بعد آنکھیں کھولی ہیں مگر اس المیہ کی گونج آج بھی پنجاب کی سرزمین میں سنائی دیتی ہے۔ یہی بازگشت اشکؔ کی شاعری میں واضح طور پر سنائی دیتی ہے۔ گو اشکؔ کی شاعری عصری تقاضوں کی عکاسی کرتی ہے تاہم انہوں نے روایتوں سے کبھی انحراف نہیں کیا۔ اس کے برعکس انہوں نے صنف غزل کو ایک نئی سمت اور تازگی بخشی ہے۔ ان کا شعری اسلوب یکتائے عصر ہے جبکہ زبان و بیاں پر بھی انہیں قدرتِ کاملہ حاصل ہے۔

عشقیہ شاعری کے حوالے سے اشک کے یہاں بے لوث محبت، معشوق کی بے اعتنائی اور عاشق کی خود فراموشی جا بہ جا ملتی ہے مگر آگے جا کر یہی محبت عرفان ذات کا وسیلہ بھی بن جاتی ہے۔

ے تجھ کو سوچا ہے اس قدر میں نے — تیرا کردار ہوگیا ہوں میں
ے میں جب اڑتا ہوں سورج، چاند تارے توڑ لاتا ہوں — مگر افسوس ایک پنچھی مرے قابو نہیں آتا
ے خطوط لکھنا تو پہلے ہی کر چکا تھا ترک — کبوتروں کو بھی چھت سے اڑا دیا اس نے
ے میں کیسے اشکؔ پھولوں کو مسل دوں — مری نظر میں ہر خوشبو خدا ہے
ے وہ لڑکی تو کب کی مرگئی یاد آیا! — میں کس کو آواز لگانے والا تھا
ے ہر دیوار کے پیچھے سو دیواریں ہیں — کتنی دیواریں مَیں روز گراتا ہوں
ے تو نے میری گاگر ریت سے بھر دی میرا دوش تھا کیا — میں تو پانی میں اترا تھا دریا تیرے کہنے پر

زندگی کی سچائیوں سے آنکھیں ملا کر جب شاعر روحانی اور تصوف کے مسائل پر غور کرتے ہیں تو ان کے قلم سے مندرجہ ذیل اشعار بہہ نکلتے ہیں:۔

ے باپ نہ ماں نے بیوی بچہ سائیں! میرا کوئی نہیں — سارا گھر ہے سائیں میرا! میرا کوئی نہیں
ے یا خدا ایسی آنکھ دے ہم کو! — کچھ نہ آوے نظر خدا کے بغیر!!
ے کسی کسی کو تھماتا ہے چابیاں گھر کی — خدا ہر ایک کو اپنا پتا نہیں دیتا
ے کیا یہ مسجد ہے صرف مومن کی! — کیا یہ کافر ہیں سب خدا کے بغیر

اور پھر جب اس شاعری کا کینواس پھیل کر سارے معاشرے کو احاطہ کرتا ہے تو قاری نئے مشاہدات اور تجربات سے ہمکنار ہوتا ہے۔

ے کئی برسوں سے عرضی زندگی کی گم ہے دفتر میں — کبھی افسر نہیں ہوتا کبھی بابو نہیں آتا
ے اب لوگ زمینوں میں محبت نہیں بوتے — اس جنس کا کہتے ہیں خریدار نہیں ہے

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ے بزرگوں کا بس اک کمرا بچا کر — تو جب چاہے پرانا گھر گرا دے
ے ہمارے شہر میں اک ایسا کنبہ ہے جس میں — ترقی دیکھ کر بچوں کی باپ جلتا ہے
ے اس کا گھر بھی ہے نیک بیوی بھی — جانے کیوں ہوٹلوں میں رہتا ہے
ے جو دانہ ڈھونڈنے نکلا تھا گھر سے — وہ پنچھی آج تک لوٹا نہیں ہے

دیکھا جائے تو پروین کمار اشکؔ کی بیشتر شاعری سیاسی وسماجی شعور کی آئینہ دار ہے۔ وہ اقدار کی شکست وریخت، سیاسی رہنماؤں کی شعبدہ بازی، فرقہ واریت، مذہبی خونریزی اور انسانی قدروں کی پامالی پر اس طرح نالاں ہیں کہ خدا سے کسی خوفناک زلزلے یا سیلاب نوحؑ کی فریاد کرتے ہیں۔ یہ ان کے ذہنی انتشار کی منتہا ہے کہ ان سے موجودہ دور کی افراتفری نہیں دیکھی جاتی۔

ے تمام دھرتی پہ بارود بچھ چکی ہے خدا — 'دعا زمین' کہیں دے تو گھر بناؤں میں
ے تم نے کیوں بارود بچھادی دھرتی پر — میں تو دعا کا شہر بسانے والا تھا
ے جہاں پرکھوں کے سجدوں کے نشاں ہیں! — وہ گلیاں خون سے کیوں دھو رہے ہو
ے یہ کس نے قتل کیا شہر خوش کلام مرا — میں جس سے بات کروں بے زباں نکلتا ہے
ے کبھی ہم جس کی چھت پر کھیلتے تھے! — سنا ہے آج وہ گھر ڈھے گیا ہے!!
ے آنسو، بادل، دریا سبھی سیاسی ہیں — جلتا شہر بچانے والا کوئی نہیں
ے چراغ درد کسی بام پر نہیں جلتا — تمام شہر میں میرا مکان روشن ہے
ے تمام زخمی پرندے پناہ لیتے تھے — بس اس خطا پہ مرا گھر جلا دیا اس نے
ے مرے خدا تیری مخلوق سب سلامت ہو — دعا یہ مانگوں جب اخبار سامنے آئے
ے اب میں اس سرحد سے ٹکراتا ہوں سر — پار جس کے میرا بازو رہ گیا
ے زمیں کو اے خدا وہ زلزلہ دے — نشاں تک سرحدوں کے جو مٹادے

بہر کیف بدترین حالات کے باوجود اشکؔ امید کے دامن کو اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑتے کیوں کہ انہیں ایشور پر پورا بھروسہ ہے اور اُسی سے آس لگائے بیٹھے ہیں۔

ے خدا کے فضل سے روشن مری دعا کا گھر — مری دعا سے خدا کا مکان روشن ہے
ے محبت میں بدل جائے سیاست — خدا! لاہور دِلّی سے ملا دے

آخر میں صلاح الدین پرویز کی رائے نقل کرتا ہوں تا کہ اشک کی شاعری کا مجموعی تاثر قارئین کے

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

سامنے آئے۔

''پروین کمار اشک اردو شاعری کے مجذوب اور قلندر ہیں۔ ان کے یہاں جو عشقیہ آہنگ، موسیقیت اور تغزل ہے وہ سب قلندری آب کا کمال ہے۔ پروین کمار اشک کو پڑھتے ہوئے سائیں بلھے شاہ کی کافیاں یاد آنے لگتی ہیں۔ وہی رموزِ عشق، سریت وہی والہانہ لے۔ اُردو غزل کی تاریخ میں ایسے خلاقانہ اسلوب کی مثال نہیں ملتی۔ پروین کمار اشک کے سینے میں عشق کی آگ ہے اسی آگ سے ان کا میکدۂ تخلیق روشن اور سرشار ہے وہ ایک سنیاسی کی طرح جنگل میں غزل کی پرستش کر رہے ہیں۔ ان کی پوجا سے غزل نکھرتی جا رہی ہے اور اس کے چہرے پہ ایسے ایسے رنگ ابھر رہے ہیں جو اس سے پہلے کبھی دیکھے ہی نہیں گئے۔''

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ہوا دشتِ دیار

مظفر ایرج

تیرے شہر کی حالت میرے شہر کی حالت جیسی ہے
تم نے مسجد ڈھائی تو میں نے بھی مندر لوٹ لیا

مندرجہ بالا شعر ایرج کی شخصیت کا آئینہ ہے۔ محمد مظفر ایرج (قلمی نام مظفر ایرج) کشمیر کے نامور شاعر ہیں جن کا پانچواں غزلوں اور نظموں کا مجموعہ حال ہی میں منظر عام پر آچکا ہے۔ اس سے پہلے ابجد (۱۹۸۳ء)، انکسار (۱۹۸۸ء)، ثبات (۲۰۰۷ء) اور دل کتاب (۲۰۰۹ء) شائع ہو چکے ہیں جن کی ادبی حلقوں میں خوب پذیرائی ہوئی۔

گو مظفر ایرج کی شاعری پر جدیدیت کا خاصا اثر دکھائی دیتا ہے تاہم انہوں نے کلاسیکی روایات سے انحراف نہیں کیا۔ مظفر ایرج کی شاعری میں ایک طرف عرفانِ ذات کی کوشش ملتی ہے اور دوسری طرف سماجی شعور کی آئینہ سازی۔ ان کی شاعری میں عرفانِ ذات کی جو کوشش ملتی ہے وہ اُس دھرتی کی دین ہے جس نے لل دید اور نند ریشی جیسے صوفی شاعر پیدا کیے ہیں۔ مجموعے میں شامل حمد و ثنا، نعتوں اور منقبتوں میں بھی اسی روحانیت کی جھلک نظر آتی ہے۔ زندگی کی بے ثباتی، بے سمتی اور مقصدِ ہستی پر چند

ناشر: شب خون کتاب گھر، الہ آباد۔
سن اشاعت ۲۰۰۹ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

اشعار نقل کر رہا ہوں:

ے رستہ ہے نہ منزل ہے نہ ہی سمتِ سفر ہے — بیٹھا ہوں کسی بے سروساماں کی طرح چپ
ے جسے ہو گھیرے ہوئے چار سو حیات حصار — وہ اپنے ہونے کی تجرید کر سکے تو کرے
ے نہ لفظ لفظ حقیقت نہ حرف حرف کتھا — میں ہست و بود کے صفحے تلاش کرتا ہوں

ایرؔج کے یہاں عشق کا ارتفاع اور محبت کی پاکیزگی صاف جھلکتی ہے۔ وہ اپنے محبوب سے خفا بھی ہیں اور مسرور بھی۔ ہجر و وصال، تنہائی اور بے اعتنائی ان کے اشعار میں جا بجا ملتے ہیں۔ نمونۂ کلام:

ے وہی تو دے کے گیا مجھ کو میری دل دنیا — وہی تو کر کے گیا مجھ سے ہی جدا مجھ کو
ے تم آئے نہ تمہاری یاد — برسوں تھی تنہائی ساتھ
ے وہ تو پردے کے ہی قائل ہیں نہ پردے کے خلاف — مجھ سے پردہ تھا تو چہرا نہ دکھا دیتے
ے تیرے بعد ہر اک موسم ہے آگ الاؤ — تیرے ساتھ ہمیشہ ساون، مان نہ مان

مظفر ایرؔج جس یگ میں جی رہے ہیں اس میں بارود کی بُو ہے، دھواں ہے، یورشِ عفریت ہے اور ہر سو ویرانی ہی ویرانی ہے۔ اس کے شہر میں عدم تحفظ کے باعث ہر شخص ڈرا سہما رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کشمیر کے موجودہ حالات نے شاعر کے دل و دماغ کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا ہے اور یہی درد و کرب ان کی شاعری میں بار بار ابھر آتا ہے۔ ملاحظہ ہو چند اشعار:

ے سلگتی دھوپ تھی، دشت و جبل تھے، بنجر تھے — جہاں جہاں سے بھی گزرے عجیب منظر تھے
ے دھوپ تمازت، شام دھندلکا، رات سمندر آنچ — اس بستی میں آتے مجھ کو ڈر لگتا ہے
ے ہر سو آگ، دھواں، لاشیں، بارود کی بُو — دل روداد سخنور کوئی کیوں کر لکھے
ے سب پرندے ہیں گھونسلوں میں اداس — کیوں مخالف ہوئی ہوا میری
ے اُس کو کاٹا، اِس کو مارا، اپنا بھی گھر لوٹ لیا — ہم ہی درندوں نے بچوں کے منہ کا فیڈر لوٹ لیا
ے یہ کیسا زہر میرے لہو میں اُتر گیا — دیکھو تو چاٹتے ہوئے خنجر بھی ڈرے ہے
ے کیسی بستی ہے یہ کس طرح کے باسی ہیں یہاں! — جو ملا، اس کے دل و جان میں ڈر دیکھا ہے
ے کس کس نے دفنائے پھولوں جیسے لوگ — کس کس نے بارود کو پوجا دھرتی پر
ے ہر طرف سے ہے یورشِ عفریت — خیر مولا! اِس انجمن کی ہو
ے گُہار کیسے لگاتا میں امنِ عالم کا — کہ میرا گھر کسی رَن کی مثال ہے بھائی

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ایرؔج ان حالات کا ذمے دار سیاست دانوں کو گردانتے ہیں جنہوں نے قانون کو بھی اپنی لونڈیا بنا رکھا ہے۔ اس حوالے سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہمارے حکمران کیا رہنما کیا؟ اندھیرے بیچنے والے بہت ہیں

ایک یہی قانون ہے چلتا انسانوں کے جنگل میں کچھ کچھ جینے کی پابندی کچھ مرنے کی مجبوری

جھوٹے لوگ ہیں میرے شہر میں فائز اونچے عہدوں پر وہ جو کچھ فرمائیں گے ٹکسال میں سچ کہلائے گا

ایسے حالات کے باوجود شاعر رجائیت کا دامن نہیں چھوڑتے۔ فرماتے ہیں:

دلوں کو آنکنے والے بہت ہیں ابھی سچ بولنے والے بہت ہیں

ایک شعر ماحولیات کے بارے میں:

آلودگی فضا میں ہے اتنی ، اُڑان میں طائر بھی سوگوار ہیں شہپر بھی ڈرتے ہیں

مظفر ایرؔج کی نظموں میں بھی وہی موضوعات نظر آتے ہیں جو انہوں نے غزلوں میں برتے ہیں البتہ نظموں میں ہر ایک خیال کی توضیع کی گئی ہے۔ ان نظموں میں احساس کی چبھن، دل کی کسک اور وجود کی لرزش سنائی دیتی ہے۔ ہوا دشتِ دیار، مسیحا کی واپسی اور ٹارگیٹ میں جہاں اجتماعی شعور کی بازگشت ملتی ہے، وہیں اعتراف، تیسری سوچ، اچنبھا اور واپسی میں وجود کی حقیقت پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ بقاء اور وردان میں ایمان اور سچائی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ چند نظموں کے اقتباسات:

بے جہت خلاء میں/ مکاں سے گزرا تو لامکاں تک/ فلک سے اترا/ ستارہ ٹوٹا/ مجھے/ تو اکثر گماں گزرتا ہے/ میری بیوی بھی/ میرے بچے بھی/ دوسرے/ آشنا وجودوں کی طرح/ میرے لیے/ ازل سے ہی اجنبی ہیں/ مگر/ میں گو تم نہیں/ کہ/ اپنے لہو کی زندہ امانتوں کو/ زمانے بھر کے/ عمیق صحرا میں/ دھوپ/ پانی/ سراب/ مٹی کے قید خانے میں/ پا بہ جولاں تڑپتا چھوڑوں/ بنوں میں بھٹکوں/ کہ/ گیان پاؤں۔ (تیسری سوچ)

مگر/ یہ المیہ میرا ہے/ میں سچ بولتا ہوں/ جو کسی انساں کے کام آتا ہی نہیں/ اس لیے میں بھی redundant ہو گیا ہوں۔ (بقاء)

دیویوں دیوتاؤں نے/ وردان جیون کا دے کر/ بڑے/ چکرویو میں پھنسایا/ جہاں کوئی پہچان/ کتنے یگوں کی دشا/ اپنی ہو کر بھی/ اپنی نہیں/ یہ حقیقت ہے/ پہچان کا اپنی/

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

وردان مانگا تھا/لیکن تشخص کے/لاکھوں کروڑوں ہی/خانوں میں تقسیم/یہ نسل کی رنگ کی /ذات کے ماورائی تفاوت کی الجھن/زیاں بن گئی/جس کا/ادراک اب تک کسی کو نہیں/دیوی اور دیوتا اپنا وردان دے کر/کہاں کھو گئے/کچھ پتہ ہی نہیں/کچھ خبر ہی نہیں/ہاں!/کتابوں میں تحریر ہے/سورگ واسی ہوئے۔ (اچنبھا)

سادہ اور سلیس زبان، برمحل استعارات و علامات، نئی لفظیات، چھوٹی بڑی بحریں، ہندی الفاظ کی آمیزش اور گیتوں کا مدھر رس مظفر ایرج کی شاعری کو اوج کمال تک پہنچاتی ہے۔ انہوں نے خاص طور سے معرب اور مفرس الفاظ کو ترک کر کے عام بول چال کے ہندی الفاظ کا استعمال کیا ہے جس کی بدولت ان کی غزلوں اور نظموں میں مقامی رنگ و آہنگ پیدا ہو گیا ہے۔ ایرج کا مطالعہ وسیع اور مشاہدہ عمیق ہے۔ اس پر طرّہ یہ کہ ان کے سینے میں ایک حساس دل ہے جو انسانیت کے لیے ہمیشہ تڑپتا رہتا ہے۔

آخر میں بشر نواز کا تحریر کیا ہوا تاثر پیش کرتا ہوں جو ایرج کی شخصیت اور فن کو سمجھنے کے لیے اہم ہے۔

مظفر ایرج کی شاعری اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ جب فن کے پیچھے ایک پوری شخصیت کارفرما ہوتی ہے تو اصناف کی ذیلی حد بندیاں ٹوٹ جاتی ہیں۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

نرم جھونکوں کی صدا

ـــــ گنگا دھرناتھ نگم فرحتؔ کانپوری

شعری مجموعہ 'نرم جھونکوں کی صدا'۔ایک بیٹی کی بھینٹ اپنے سورگیہ پتا کے نام گنگا دھرناتھ نگم فرحتؔ کانپوری کی رحلت کے چھپّن برس بعد منظر عام پر آچکا ہے۔خوش آئند بات یہ ہے کہ اس صارفی دنیا میں بھی ایسی بیٹیاں موجود ہیں جو اپنے بزرگوں کی میراث تلف ہونے نہیں دیتیں۔مجموعے کی ترتیب وتزئین میں پروفیسر مامون ایمن نے جس خلوص اور تندہی کا مظاہرہ کیا ہے وہ بھی قابل ستائش ہے۔

گنگا دھرناتھ فرحتؔ کانپوری ۱۹۰۵ء میں کانپور، یوپی میں پیدا ہوئے، بی اے ایل ایل بی کر کے لکھنؤ میں وکالت بھی کرتے رہے اور ڈی اے وی کالج میں فوجداری قانون بھی پڑھاتے رہے۔سیاسی اور ادبی دونوں میدانوں میں فعال رہے۔ایک طرف گاندھی جی کی رہنمائی میں آزادی کی لڑائی میں شریک ہوئے تو دوسری طرف ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو کر آل انڈیا اُردو کانفرنس کے سیکریٹری بھی رہے۔گنگا دھرناتھ نگم نہ صرف مہمان نواز اور غریب پرور تھے بلکہ فرسودہ رسم ورواج کے مخالف بھی۔

فرحتؔ کانپوری کی شاعری میں روایتی اسلوب کا کلاسیکی انداز غالب ہے جس کی جڑیں دبستان لکھنؤ سے جاملتی ہیں۔ایک جانب وہ اپنے خیالات کے اظہار میں الفاظ کی آرائش اور صنائع بدائع کو فکر وخیال پر ترجیح دیتے رہے تو دوسری جانب ترقی پسند تحریک کے اہم رکن بن کر مقصدیت کو بھی گلے لگاتے رہے۔یہ

ناشر:وجے نگم، ۱۰۷۴، بنٹوک لین، سین ہوزے، کیلی فورنیا ۹۵۱۲۹۔ سن اشاعت:۲۰۰۸ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

تضاد ان کی شاعری میں واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔ اردو اور فارسی پر قدرت، علم و عروض پر مکمل گرفت اور مانوس محاوروں کا استعمال ان کی شاعری کو نغمگی اور غنایت عطا کرتا ہے۔ فرحتؔ کی شاعری، خصوصاً نظموں پر، علامہ اقبالؔ کا اثر صاف نظر آتا ہے۔ اقبالؔ کی طرح ہی وہ نادر ترکیبوں کا استعمال بھی کرتے ہیں جیسے حیات ہفتہ روزہ، فتنۂ وجود، گونگے کا سپنا، رقاصۂ بے رنگ، مستیٔ رندانِ قدح خوار وغیرہ اور کبھی کبھی قوم کو بیدار کرنے کا بیڑا بھی اٹھاتے ہیں۔

پروفیسر مامون ایمن نے مجموعے کو تین فصلوں میں تقسیم کیا ہے۔ غزل، نظم اور رُباعی۔ حصۂ غزل کا پیش لفظ خود مرتب نے ہی رقم کیا ہے جبکہ نظموں اور رباعیات کا تعارف بالترتیب پروفیسر ستیہ پال آنند اور پروفیسر یحییٰ نشیط سید نے کیا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ تینوں تنقید نگاروں نے فرحتؔ کی شاعری کا دقیقہ شناسی سے تجزیہ کیا ہے۔

فرحتؔ کی غزلوں میں عام روش کے عشقیہ مضامین نہیں ملتے جس کا اعتراف خود شاعر نے بھی کیا ہے تاہم ان کا ذوق جمال عمدہ اور حسن شناسی مجنونانہ ہے۔ پیش ہیں چند اشعار:۔

ے عریانیٔ جذبات کا امکان نہیں ہے — مانا میرے اشعار میں رومان نہیں ہے

ے تڑپ اٹھی ہے جو ساری محفل تو ہم ہیں مجبور کیا کریں ہم — ہمارے نغمے وہی ہیں رنگیں کہ جن میں خونِ جگر بھرا ہے

ے وہ بہکی نگاہیں کیا کہیے وہ مہکی جوانی کیا کہیے — وہ کیف میں ڈوبے لمحوں کی اک رات سہانی کیا کہیے

ے لگتے ہی آنکھ عہد جوانی گزر گیا — جھونکا نسیم کا ادھر آیا، اُدھر گیا

ے یا رب یہ کیا عبادت، یا رب یہ کیا دعا ہے — دل میں خیال جنت، لب پر خدا خدا ہے

ے جنت کی تمنا سے نہ بہلا مجھے، اے شیخ! — کشتہ ہے مرا دل کسی فردوس نظر کا

ے نہ حسرت ہے، نہ ارماں ہے، نہ امیدیں، نہ مایوسی — نہیں مٹتا، نہیں مٹتا، غمِ شام و سحر پھر بھی

ے وفورِ ہجر میں نہاں وصالِ یار کا مزہ — یہی تو اک کمال ہے، جمالِ دل نواز کا

ے تمہیں مبارک ہجوم راحت ہمیں مبارک ہجوم کلفت — نہ تم کو فرصت، نہ ہم کو فرصت، نہ تم اکیلے، نہ ہم اکیلے

ے جب کشتی اپنی کشتی تھی، جب ساحل اپنا ساحل تھا — منجدھار میں کشتی لا کر اب ساحل کی تمنا کون کرے

فرحت زندگی اور موت، جوہر ہستی اور ہست و بود کے سوالوں سے بھی نبرد آزما ہیں۔ وہ کہیں زندگی کی یک رنگی سے اُکتا جاتے ہیں اور کہیں اُسے فریب نظر (مایا) قرار دیتے ہیں۔ البتہ اقبال کی طرح ہی انسان کو انجمن بہار بننے کی ترغیب دیتے ہیں۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ہستی کا راز کیا ہے، غم ہست و بود ہے — عالم تمام دامِ رسوم و قیود ہے
جو کچھ بھی ہے نظر میں سو وہم نمود ہے — عالم تمام ایک طلسم وجود ہے
فتنۂ وجود بھی فتنہ درکنار ہے — حسن کو جگا دیا، عشق کو سُلا دیا
موت کے واسطے فکر و غم جنت بے سود — زیست کے واسطے دنیا کا خیال اچھا ہے
در پردہ حقیقت ترے ناظر کو ہے منظور — منظر تو بہت ہیں جو نہیں ہے وہ نظر ہے
حیات ہفت روزہ میں نکل سکیں نہ حسرتیں — صراحیاں دھری رہیں، ایاغ ہی نہ مل سکا
گزر چلی ہے زندگی، روش رہی ہے ایک ہی — ہنوز حال ہے وہی، عروج کیا، زوال کیا
دل میں ہوں غم کی نرمیاں، عشق و جنوں کی گرمیاں — گل نہ اگر تو بن سکے، بہرِ خدا نہ خار بن
راہرو جنون سے تو، راہ بر حیات ہو — رہ نہ گدائے رہ گذر، مشعلِ رہ گذار بن
اہل نظر کے واسطے، لالۂ سحر کار بن — دستِ دراز کے لیے، ناوکِ نوکِ خار بن

بت پرستی، مذہبی تنفر، کفر پرستی، انسانیت دوستی اور عبادت پر فرحت کانپوری نے طنزیہ پیرائے میں ندرتِ خیال کا مظاہرہ کیا ہے۔ ملاحظہ ہوں چند اشعار:۔

ذرے ذرے کو کیے ہیں میں نے سجدے پے بہ پے — رفتہ رفتہ بن گیا ہر بت خدا میرے لیے
کعبے سے نہ مِٹ پائی پرستاریٔ کعبہ — کیا کفر کے پردے میں بھی ایمان نہیں ہے
مٹائے مِٹ نہ سکے بتکدے جہالت کے — پیمبروں کی بھی شانِ پیمبری معلوم
ان سے پنپ نہ پائے گی آدم کی نسل بھی — انساں کو پھاڑ کھاتے ہیں مذہب کے بھیڑیے
ایک عالم ہے مری کفر پرستی پہ نثار — خود کو کم بخت کبھی دین سے بے زار بھی دیکھ
مشقِ عمل ہے اور شے، حسن عمل ہے اور چیز — سجدے میں سر جھکا دیا، سر کی مگر خبر نہیں
دل جو سجدہ کرے بھی تو کس جا — آپ کا ہر طرف آستانہ

مقصدی شاعری کی جھلک مندرجہ ذیل اشعار میں نظر آتی ہے:

بُتِ قدامت، رسومِ کہنہ، میری نظر میں ہیں زندہ لاشیں
مری طبیعت ہے انقلابی، مرے خیالات باغیانہ
مستور ہیں اُن تنکوں میں، مزدور کی آہیں
جن تنکوں سے زردار کا خس خانہ بنا ہے

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

جہاں تک نظموں کا سوال ہے، فرحت کانپوری عموماً مسلسل نظمیں رقم کرتے ہیں جن میں ایک طرف ذاتی جذبات کی عکاسی ہوتی ہے اور دوسری طرف اجتماعی شعور کا ردِ عمل ہوتا ہے۔ ابتداء میں انہوں نے ذاتی نوعیت کی نظموں کے علاوہ حب الوطنی کے نغمے زور وشور سے قلمبند کیے (آرزوئے دل، شاعر، نوگرفتار قفس، صبح انتظار) مگر آزادی کے بعد حالات سے مایوس ہوکر ان پر نوحے بھی رقم کیے۔ (چمن، اسیران قفس، اندازِ دل خراش، دور خزاں، قافلۂ بے سروساماں)۔ تاہم انہوں نے کبھی اُمید کا دامن نہیں چھوڑا اور 'روشن مستقبل' جیسی نظمیں لکھیں۔ مہاتما گاندھی کی قیادت سے متاثر ہوکر انہوں نے خراج کے طور پر نظم 'مہاتما گاندھی' قلمبند کی۔ اس کے علاوہ 'بزم شوق' میں مظاہر قدرت کی بڑی خوبی سے منظر کشی بھی کی۔ البتہ ایک بات جو انہوں نے اعلانیہ کہی ہے اور جو ان کی فطرت کا آئینہ دار ہے وہ یہ کہ وہ ''حکماً شعر نہیں کہہ سکتے۔'' چند نظموں کے اشعار ملاحظہ ہوں:

ذات سے متعلق:

ے جس دل کے نہاں خانے میں صورت ہے تمہاری
اس دل میں کسی اور کو مہماں نہ کروں گا
(نظم 'عید')

ے اے سفیران قفس! ذکر نشیمن نہ کرو
مانتا ہوں کہ تمہیں عشق تھا گل زار کے ساتھ
دشت غربت میں کہاں ہائے وہ اجڑا ہوا گھر
رو تو لیتے تھے لپٹ کر در و دیوار کے ساتھ
(کلام فرحت)

ے نغمۂ ہستی، فروغ زندگی، بزم حیات
بے حقیقت سی ہے ساری داستاں تیرے بغیر
(تیرے بغیر)

سوسائٹی سے متعلق:

ے اب نہ ہو ناقوس سے پیدا صدائے فرقہ وار
اب نہ ہو سوزِ ازاں سے شورش ہنگامہ بار
(میرا مذہب)

حب الوطنی:

ے کوثر و تسنیم ہیں، گنگ و جمن میرے لیے
غیرتِ فردوس ہے باغ وطن میرے لیے
(میرے لیے)

ملک میں ہو دورِ امن و عیش و صلح و آشتی
رشک فردوسِ بریں ہو جائے حالت ہند کی

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

راگ آزاری کا گائیں بلبلیں بی کھول کر — اور فضائے آسمان پر اُڑ سکیں پر تول کر
باغباں کی کاوشوں سے ہو وہ امکانِ بہار — اب نہ ہو صیاد کو سیرِ چمن کا اختیار
فارغ البالی وطن میں آئے اٹھلاتی ہوئی — ہر طرف آسودہ حالی پھر ہو اتراتی ہوئی
رشکِ فردوس بریں ہو سرزمینِ ملکِ ہند — نازِ چرخِ ہفت میں ہو سرزمین ملکِ ہند

(نظم آرزوئے دل)

ملک کی حالت بے زار:

ے نہ کھانے کو روٹی، نہ کپڑا بدن کو — دعائیں دیے جاؤ اہل وطن کو
کبھی رنگ لائے گا خونِ شہیداں — ابھی اور سینچو لہو سے چمن کو
ہمیں کو ڈراتی ہے وہ انجمن اب — ہمیں نے سجایا تھا جس انجمن کو
خود اہل وطن ہی لیٹرے بنے ہیں — سجاؤ ابھی اور اس انجمن کو
وہی ہم کو آنکھیں دکھاتے ہیں اکثر — جنہوں نے کیا ٹکڑے ٹکڑے وطن کو

(نظم 'چمن')

ے آزاد گو ہے ملک، قفس پھر بھی ہے قفس — بلبل ہنوز باغ میں ہے دلفگار سی

(دورِ خزاں)

ے آدمی فرطِ ندامت سے پشیماں ہے ابھی — خونِ انسان جسے کہتے ہیں، وہ ارزاں ہے ابھی

(قافلۂ بے سروساماں)

ے کیا خبر برق نشیمن پہ گرائی کس نے — ایک اک غنچۂ وگل شعلہ بداماں ہے ابھی
وہاں کے آدمیوں میں نہیں انسانیت، فرحتؔ — وہاں بس کشت وخوں معراج انساں ہے، جہاں میں ہوں

(خصوصاً دوران جنگ)

رجائیت:

ے پھر نئے پھولوں سے بھڑکے گی چمن میں نئی آگ — پھر نئے رنگ سے آرائش محفل ہوگی
پھر چٹک کر چمن ہند کی ادنیٰ سی کلی — صد بہارِ چمنِ خُلد کا حاصل ہوگی
جلد آنے کو ہے وہ دن کہ جب اے فرحتؔ — میری صہبا، مرا ساقی، مری محفل ہوگی

(نظم 'روشن مستقبل')

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ے میں ہی بدلوں گا یہ فرسودہ نظام ہستی ذرّے ذرّے کو ملے گا وہ پیام ہستی
صبح ہستی سے بدل جائے گی شام ہستی جو زمانے کو پلٹ دے گا، وہ انساں ہوں مَیں

(نظم 'شاعر')

ے غلامی کیا، غلامی کی یہ زنجیر گراں کیا ہے غلامی چند دن کی اور مہماں ہے جہاں میں ہوں

جہاں تک رباعیات کا سوال ہے۔فرحت کی رباعیاں فنی لوازمات کو پورا کرتی ہیں۔انہوں نے موضوعات اور عروض، دونوں کو روایتی احترام کے ساتھ برتا ہے۔بقول یحییٰ نشیط سید فرحت انوکھی لفظیات اور بامعنی تراکیب کو ڈھالنے اور رباعی کے مصارع میں ان کا برجستہ اور برموقع استعمال کرنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔چند رباعیاں یہاں پر نقل کرتا ہوں۔

ے انجام فنا کسی کو معلوم نہیں امکان بقا کسی کو معلوم نہیں
کم عقل ہے، ناقص ہے، خرد وہم تباہ اسرار خدا کسی کو معلوم نہیں

ے ترغیب حواس سے ہے مجبور گناہ امکان عمل بھی اب نہیں خاطر خواہ
جب ہوتی ہے قوت ارادی کمزور ہوتا ہے بشر اپنے ہی ہاتھوں سے تباہ

ے مندر میں بتوں کی سب فضلیت دیکھی مسجد میں خدا کی بھی حقیقت دیکھی
کتنے گم راہ ہیں برہمن اور شیخ میں نے دونوں ہی کی جہالت دیکھی

ے کوثر کی ہوس سے مے پرستی اچھی امید نعم سے فاقہ مستی اچھی
گر وصل نہ ہو تو ہجر سے بہتر موت نادیدہ خدا سے خود پرستی اچھی

ے انسان کو انسان نہ جینے دے گا حیوان کو حیوان نہ جینے دے گا
مزدور کو مزدور چبا ڈالے گا سلطان کو سلطان نہ جینے دے گا

ے پھر کفر کو ایمان نہ جینے دے گا پھر وید کو قرآن نہ جینے دے گا
پھر شرک کا اسلام پہ ہوگا حملہ مشرک کو مسلمان نہ جینے دے گا

اس رباعی میں عہد حاضر کی پیش گوئی کی گئی ہے۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

گنگا دھر ناتھ نگم کی شاعری کا جائزہ لینے کے بعد مجھے یہ احساس ہوا کہ اگر موصوف کا دیوان ان کی حیات ہی میں منظر عام پر آتا تو اُردو ادب کے لیے کتنا اچھا ہوتا تاہم دیر آید درست آید۔ مجھے پوری امید ہے کہ زیر نظر شعری مجموعے کی خوب پذیرائی ہوگی اور تنقید نگار فرحت کانپوری کی خدمت کا اعتراف دیر سویر ضرور کریں گے۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

چراغ پچھلے برس

ـــــ اعجاز احمد اعجاز

'چراغ پچھلے برس' کا پہلا ایڈیشن سن ۱۹۹۵ء میں منظر عام پر آیا تھا اور اب دوسرا ایڈیشن ۲۰۰۸ء میں شائع ہو چکا ہے جو اس کی مقبولیت کی سند ہے۔ اس سے پہلے بھی اعجاز احمد اعجاز کے کئی مجموعے، 'تری یاد کے بعد'، 'میں تجھے یاد کرتا ہوں'، اور 'رنگ ہوا کا' اُردو کی نئی اور پرانی بستیوں میں قارئین سے داد حاصل کر چکے ہیں۔

اعجاز کی شاعری کی معنویت، موضوعات کی رنگارنگی، ابہام کے بغیر خیالات کا اظہار اور دلکش طرزِ بیان ان کو اپنے ہم عصروں میں امتیاز بخشتا ہے۔ ان کے یہاں اعلیٰ پایہ کا سماجی و سیاسی شعور پایا جاتا ہے جو ان سے 'پاکستان کا مطلب کیا؟' جیسی نظمیں رقم کرواتا ہے۔ اعجاز کی شاعری ترقی پسندی کی آئینہ دار ہے کیونکہ وہ غریبوں، مزدوروں اور بے روزگاروں کے ہمنوا ہیں مگر اس کے باوجود وہ کبھی شعری لطافت کے پیمانوں سے نہیں بھٹکتے۔ ان کی نظمیں 'درد کا چوراہا'، 'کیڑوں کا گیت'، 'بن باس'، 'خواب' اور 'دانہ دانہ' اس طرح کی شاعری کی بہترین مثالیں ہیں۔

رشوت خوروں کی یہ دھرتی، ملک منافع خوروں کی
یہ جاگیر وڈیروں کی اور بن جنگل کے موروں کی
ملک ہے یہ کمزوروں کا، مجبوروں کا بدحالوں کا
سر پر مور کے پنکھ سجائے کھڑا ہے شہر غزالوں کا

ناشر: انتساب پبلی کیشنز، سرونج (ایم پی)۔ انڈیا
سن اشاعت: (طبع دوم) ۲۰۰۸ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

یہ اقبالؔ کا خواب تھا بیٹے قائد کا یہ سپنا ہے
جیسا بھی ہے، پیارے بیٹے، ملک تو آخر اپنا ہے"

(نظم 'پاکستان کا مطلب کیا؟')

ے کیسے سمجھاؤں میں اس جان بلب بچے کو — جن کی ماؤں کو میسر نہ ہو سوکھی روٹی
ان کے سینوں سے بھلا دودھ بھی نکلا ہے کہیں؟ — ان کے سینوں سے تو بس خون نکل آتا ہے

(نظم 'درد کا چوراہا')

ے مگر یہ کھوکھلی خوشیاں پیامِ رام نہیں — بہت سے گھر ہیں جہاں آج بھی اندھیرا ہے
بلک رہے ہیں جہاں طفل اک نوالے کو — ہو جس پہ فخر ہمیں، دور وہ سویرا ہے

(نظم 'بن باس')

ے ان حریصوں کے خونیں جبڑوں سے — چھین لو بڑھ کے اپنا حصہ تم
کون دیتا ہے اپنی مرضی سے — تم سے فاقہ کشوں کو جینے کا حق

(نظم 'دانہ دانہ')

ے دیکھا جب یہ منظر میں نے — سوچا پھر سوجانا اچھا
ظلم کہاں تک دیکھ سکوں گا؟ — سپنوں میں کھوجانا اچھا!

(نظم 'خواب')

ے جس شہر کے فٹ پاتھ پہ ماں جنتی ہے بچے — اس شہر خرابی میں مکان ڈھونڈ رہا ہوں

مندرجہ بالا اشعار سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اعجاز اپنے گردونواح میں رینگتے ہوئے کیڑوں کو نظر انداز نہیں کرتے مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ غم ذات کو اپنی شاعری کا حصہ بنانے سے گریز کرتے ہیں۔ ان کی نجی زندگی کی مشاہدات، عشق و محبت کی کامرانیاں اور ناکامیاں بھی ان کی شاعری کا اہم حصہ بن کر سامنے آتی ہیں۔

جہد زیست:

ے ایک چھوٹی سی عمر میں ہم نے کتنے موسم دیکھ لیے ہیں! — گرمی، سردی، آندھی طوفان، پت جھڑ، باراں، ژالہ دیکھا
ے یہ جسم، جہد مسلسل سے ٹوٹ ٹوٹ گیا — بنا تھا خاک سے آخر، مشین ہو نہ سکا

یادیں:

ے اب چراغ زیست کا باقی دھواں ہی رہ گیا — چند یادیں ہیں کسی کی اور اک تصویر ہے

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ے آج پھر ذہن میں یادوں کے دیے جلتے ہیں — آج پھر جانے ادا تیرا خیال آیا ہے
ے زندگی بھر کا اثاثہ، بس تری یادیں ہی تھیں — چھوڑ آیا ان کو پیچھے، عشق کی پرواز میں

رشک:

ے غیروں کی صحبتوں میں وہ کھلتے ہیں مثل گل — دیکھا ہمیں تو درد کی تصویر ہوگئے
ے کوچے میں تیرے قافلۂ عاشقاں نہیں — اب تُو حسیں نہیں رہا اور مَیں جواں نہیں

تجسُس:

ے وہ جس نے طور پہ موسیٰ کو بے قرار کیا — تڑپ رہی ہے نظر پھر اسی ادا کے لیے
ے مجھے بھی طور پر جانا پڑے گا ایک دن شاید — وہاں جلوہ نما آخر مرا دلدار ہی تو ہے

خوف:

ے لٹیروں کی نگری میں تیرا سفر ہے — ذرا اپنے سائے سے ہوشیار رہنا
ے مقتل دنیا میں ہم کرتے تو کس کا اعتبار — ہر کوئی ظالم تھا اس میں، ہر کوئی مظلوم تھا

خودداری:

ے جھکا نہ سر کسی فرعونِ وقت کے آگے — ہے فخر جب بھی چلے، اپنا سر اٹھا کے چلے

اُمید:

ے کوئی چراغ تو آندھی سے بچ ہی نکلے گا — جلا دیے ہیں بہت سے دیے ہوا کے لیے

جہاں تک غم کائنات کا تعلق ہے، اعجاز احمد اعجازؔ نے ہجرتوں کی کلفتیں جھیلی ہیں۔ بہت عرصہ پہلے فرقہ وارانہ فسادات نے ان کے گھر کو اجاڑ دیا تھا، اور اب دہشت گردی ان کے ماحول کو مکدر کر رہی ہے۔ ان کو اخلاقی قدروں کی گراوٹ کا غم بھی ستاتا ہے اور انسانیت کی بیخ کنی بھی۔ اسی لیے ان کا دل کراہتا ہے اور وہ اس ظلمت کے نوحے رقم کرتے ہیں۔

ے مکاں بیچے، چمن بیچ کر چلے آئے — وطن پرست وطن بیچ کر چلے آئے
ے وہ کیا زمین کے ٹکڑوں کو اہمیت دیتے — جو دلبروں کے کفن بیچ کر چلے آئے
ے ہجرتیں بخت ہوئیں، دشتِ نوردی قسمت — اب کہاں گھر ہیں؟ جو ہم کہہ دیں کہ گھر جائیں گے
ے ہم تیرے شہر میں آئے تھے جلا کر گھر کو — اب یہاں سے بھی نکالا تو کدھر جائیں گے
ے ہم نے مانا ہم مہاجر ہیں مگر مسلم تو ہیں — جن کا گھر سارا جہاں ہو، ان کا گھر ہوتا نہیں

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ے پہلا سا نہ ہندو ہے نہ پہلا سا مسلمان — مسلم کا خدا اور ہے ہندو کا صنم اور

ے اڑا دو ظالمو! ٹھوکر سے ہر اک نقش دوراں کو — تمہارے ہاتھ میں بس اختیارِ دار ہی تو ہے

بابری مسجد بامیان کے بتوں اور چرار شریف کی درگاہ کے پس منظر میں دیکھ لیں

ے سب کی آنکھوں میں اتر آیا ہے نفرت کا لہو — مٹ گیا دہر سے انسان کی عظمت کا نشاں

ے آدمی اب تو ستاروں کا سفر کرنے لگا — اس سفر میں ہم نے لیکن کھو دیا انسان کو

ے یہی جی چاہتا ہے اس غزل کو — اٹھا کر اس کے اتنے پرزے کردوں

ے کہ جتنے اَن گنت حسرت کے آنسو — کسی دکھیا کی آنکھوں سے ٹپک کر

ے مثالِ کربلا تپتی زمیں پر — کہانی وحشتوں کی لکھ گئے ہوں

(پچیسواں گھنٹہ)

زندگی کی تلخیوں کو دیکھ کر اعجاز نظام دہر سے بھی بدظن ہو جاتے ہیں اور کبھی خدا سے بھی سوال کر بیٹھتے ہیں۔ ان کی یہی تلخی طنز کے تیر بن کر چُبھ جاتی ہے اور وہ کہیں پر بھی اپنے خیالات پر کوئی روک ٹوک نہیں لگاتے۔

ے مرے سجدوں کو سمتوں کی کوئی حاجت ہی کیوں رہتی؟ — کہ میں جس سمت بھی منہ پھیر لیتا، تو ہی تو ہوتا

ے مسیحا جس کو مانا تھا، جسے دل میں بسایا تھا — اسے خود اپنے ہاتھوں ہم نے سولی پر چڑھایا تھا

ے سنا کرتے تھے ہم واعظ سے "ہر فرعونے راموسیٰ" — ہر ایک غاصب پہ رب نے محتسب تفویض فرمایا

ے ہمیں تو ہر طرف فرعون صف آرا نظر آئے — ہمیں تو آج تک موسیٰ نے جلوہ بھی نہ دکھلایا

ے قدم قدم پہ یہاں کربلا کا منظر ہے — کہاں سے ڈھونڈ کے لاتے رہیں حسینؓ نیا؟

ے شکایت اتنی ہے زاہد کی پارسائی سے — ذرا سا وقت پڑا اور سب اصول گئے

اعجاز احمد اعجاز کی شاعری پڑھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ علامہ اقبال کی شاعری نے انہیں بہت متاثر کیا ہے۔ تبھی تو ان کے قلم سے بھی 'شکوہ جواب شکوہ' جیسی نظمیں نکلی ہیں۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اعجاز کی شاعری میں اکیسویں صدی کی گونج صاف طور پر سنائی دیتی ہے۔ وہ شاعری کو اپنے فکر و خیال کا وسیلہ بناتے ہیں اور انسان کی عظمت کو بحال کرنے کا ذریعہ۔ آخر میں انہی کا ایک شعر پیش خدمت ہے۔

ے تمام عمر تعاقب میں ہم تھے لفظوں کے
مگر یہ لفظ تو مجھ کو تلاش کرتے رہے

❖ ❖ ❖

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

جنگلی پھول

ـــــ غزلوں کا مجموعہ

ـــــ منوّر رانا

غزل وہ صنف نازک ہے جسے اپنی رفاقت سے
وہ محبوبہ بنا لیتا ہے میں بیٹی بناتا ہوں

موجودہ ادبی منظر نامے میں منوّر رانا غزلیہ شاعری کی ایک معتبر آواز ہیں حالاں کہ وہ کبھی کبھی نثر میں بھی اپنا قلم آزماتے ہیں۔ اردو میں اب تک ان کی آٹھ تصانیف (نیم کے پھول ۱۹۹۳ء، کہو ظل الٰہی سے ۲۰۰۰ء، بغیر نقشے کا مکان ۲۰۰۱ء، سفید جنگلی کبوتر ۲۰۰۵ء، منوّر رانا کی سو غزلیں ۲۰۰۶ء، جنگلی پھول ۲۰۰۷ء، چہرے یاد رہتے ہیں ۲۰۰۷ء، اور ماں ۲۰۰۷ء) منصۂ شہود پر رونما ہو چکی ہیں جبکہ ہندی میں بھی ان کی دس کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ جادۂ شاعری پر لمبے سفر کے باوجود رانا نہ اپنے آپ کو دہراتے ہیں اور نہ ہی تھکاوٹ محسوس کرتے ہیں۔ ان کے اشعار میں ہر دم تازگی اور نیا پن پایا جاتا ہے۔

منوّر رانا روایتی شاعری کے پرستار ہیں۔ عشق، ہجر و وصال، تنہائی، زندگی اور موت کو انہوں نے متعدد اشعار کا موضوع بنایا ہے۔ انہوں نے رشتوں، خاص کر ماں، بہن اور بیوی کے رشتوں، کے تقدس پر کئی اچھوتے اشعار قلمبند کیے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

ناشر: مژگاں پبلی کیشنز، ۸۵، جے، توپسیا روڈ، کولکاتا۔ ۷۰۰۰۳۹ سن اشاعت: ۲۰۰۷ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ے پھر تری یادوں کو شبنم نے جگایا ہے مجھے
پھر غزل کہنے کا موسم شاعری کو مل گیا

ے ہمارے حال سے سب چاہنے والے ہیں ناواقف
مگر اک بے وفا ہے جو ہمارا غم سمجھتا ہے

ے اک تیرے نہ رہنے سے بدل جاتا ہے سب کچھ
کل دھوپ بھی دیوار پہ پوری نہیں اُتری

ے محبت میں پرکھنے جانچنے سے فائدہ کیا ہے
کمی تھوڑی بہت ہر ایک کے شجرے میں رہتی ہے

ے تنہائی کو آسیب کا ڈر کاٹ رہا ہے
اب لوٹ کے آجا مجھے گھر کاٹ رہا ہے

ے تمہارے عشق میں ہستی کو اپنی خاک کر ڈالا!
تمہارے ساتھ ہم نے مثلِ پروانا گزاری ہے

ے ایک ٹوٹی ہوئی کشتی پہ سفر کیا معنی
ہاں نگل جائے گا ایک روز سمندر مجھ کو

ے اے موت مجھے تو نے مصیبت سے نکالا
صیاد سمجھتا تھا، رِہا ہو نہیں سکتا

ے خود شاخِ گل کو ٹوٹتے دیکھا ہے آنکھ سے
کس درجہ حوصلہ ابھی بوڑھے شجر میں ہے

ے عمر کے ڈھلنے کا ان پر بھی اثر ہوتا ہے
آرزوئیں بھی ہماری طرح تھک جاتی ہیں

ے کھنڈر سے دل میں پھر کوئی تمنا گھر بناتی ہے
مرے کمرے میں ایک ننھی سی چڑیا گھر بناتی ہے

رشتوں کا تقدس:

ے میں نے روتے ہوئے پونچھے تھے کسی دن آنسو
مدتوں ماں نے نہیں دھویا دوپٹا اپنا

ے میری خواہش ہے کہ پھر سے میں فرشتہ ہو جاؤں
ماں سے اس طرح لپٹ جاؤں کہ بچہ ہو جاؤں

ے وہ تو لکھا کے لائی ہے قسمت میں جاگنا
ماں کیسے سو سکے گی کہ بیٹا سفر میں ہے

ے یہ ایسا قرض ہے جو میں ادا کر ہی نہیں سکتا
میں جب تک گھر نہ لوٹوں میری ماں سجدے میں رہتی ہے

ے گھر میں رہتے ہوئے غیروں کی طرح ہوتی ہیں
بیٹیاں دھان کے پودوں کی طرح ہوتی ہیں

ے جو دیکھنے میں بظاہر ہے گھر سنبھالے ہوئے
ہماری دنیا ہے وہ بے خبر سنبھالے ہوئے

انسانی سرشت منور رانا کا مخصوص دائرہ فکر رہا ہے۔ وہ دنیا کے بدلتے مناظر، انسان کی بے بسی، خود فریبی، قناعت، ایثار اور دیگر صفات پر غور و خوض کرتے ہیں جس کے سبب ان کی شاعری میں فلسفیانہ رنگ بھی نظر آتا ہے۔ ان کی یہ جستجو سطحی نہیں ہے بلکہ وہ سمندر کی گہرائیوں سے موتی نکال کر لاتے ہیں۔

عمق:

ے کسی دن اے سمندر جھانک میرے دل کے صحرا میں
نہ جانے کتنی ہی تہہ داریاں آرام کرتی ہیں

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ایثار:

ے کسی کا بوجھ اٹھاؤ تو جان جاؤ گے ذراسی مٹی ہے کیسے شجر سنبھالے ہوئے

قناعت:

ے فقیروں میں اٹھے بیٹھے ہیں، شاہانہ گزاری ہے ابھی تک جتنی گزری ہے فقیرانہ گزاری ہے

ے سمندر کی نظر پھیلاؤ پر مرکوز رہتی ہے میں دریا ہوں مجھے اپنے کنارے یاد رہتے ہیں

تبدیلی:

ے بلندی دیر تک کس شخص کے حصے میں رہتی ہے بہت اونچی عمارت ہر گھڑی خطرے میں رہتی ہے

کذب:

ے میں اپنے آپ کو سید تو لکھ نہیں سکتا اذان دینے سے کوئی بلال ہوتا ہے

خود فریبی:

ے تم نے اچھا کیا آئینے سے پرہیز کیا آئینہ دیکھ لیا ہوتا تو ڈر ہی جاتے

ے شگفتہ لوگ بھی ٹوٹے ہوئے ہوتے ہیں اندر سے بہت روتے ہیں وہ جن کو لطیفے یاد رہتے ہیں

بے بسی:

ے کچھ روز سے میں صرف یہی سوچ رہا ہوں اب مجھ کو کسی بات کا غم کیوں نہیں ہوتا

ے کسی دن پیاس کے بارے میں اس سے پوچھئے جس کی کنویں میں بالٹی رہتی ہے رسی ٹوٹ جاتی ہے

مجبوری:

ے ممکن ہے ہمیں گاؤں بھی پہچان نہ پائے بچپن میں ہی ہم گھر سے کمانے نکل آئے

ے سزا کتنی بڑی ہے گاؤں سے باہر نکلنے کی میں مٹی گوندھتا تھا اب ڈبل روٹی بناتا ہوں

ے مفلسی گھر میں ٹھہرنے نہیں دیتی مجھ کو اور پردیس میں بیٹا نہیں رہنے دیتا

ے تجھے اے زندگی اب قید خانے میں گذرنا ہے تجھے دکھ درد کا میں اس لیے عادی بناتا ہوں

منور رانا صرف ذات کی شاعری پر اکتفا نہیں کرتے البتہ اپنے معاشرے کی مثبت اور منفی تصویریں بھی قرطاس پر اتارتے ہیں۔ بقول رانا ''غزل میں آپ بیتی کو میں جگ بیتی بناتا ہوں''۔ ان کے اشعار میں ترقی پسندی کی جھلک تو ملتی ہے (ظاہر ہے بنگالی کتنا بھی چاہیں ترقی پسندی سے دامن نہیں چھڑا سکتے) مگر وہ باقاعدہ تحریک سے ہم قدم نہیں ہوتے۔ اس میں ان کی مذہب پرستی اور کمیونزم سے نفرت آڑے آتی

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ہے۔ سماجی شعور کی شاعری میں انہوں نے فرقہ واریت، سیاسی پینترے بازی، دہشت گردی، بے عملی اور مسلم فرقے کے کرب کو اپنے انفرادی اسلوب میں بڑی ہنرمندی سے پیش کیا ہے۔

نفرت:

- محبت تجھے کس خانے میں رکھا جائے
- یہاں پر نفرتوں نے کیسے کیسے گل کھلائے ہیں
- یہاں ویرانیوں کی ایک مُدّت سے حکومت ہے
- ایک آنگن کی طرح یہ شہر تھا کل تک مگر

شہر کا شہر تو نفرت سے بھرا ملتا ہے
لٹی عصمت بتادے گی دوپٹا بول سکتا ہے
یہاں سے نفرتیں گزری ہیں بربادی بتاتی ہے
نفرتوں میں ٹوٹ کر موتی کی مالا ہوگیا

فرقہ واریت:

- ہمارے ملک میں انسان اب گھر میں نہیں رہتے
- مذہبی مزدور سب بیٹھے ہیں ان کو کام دو
- حکومت کی توجہ چاہتی ہے یہ جلی بستی
- اگر دنگائیوں پر تیرا کوئی بس نہیں چلتا
- یہ دکھ شاید ہماری زندگی کے ساتھ جائے گا

کہیں ہندو کہیں مسلم کہیں عیسائی لکھا ہے
ایک عمارت شہر میں کافی پرانی اور ہے
عدالت پوچھنا چاہے تو ملبہ بول سکتا ہے
تو پھر سن لے حکومت ہم تجھے نامرد کہتے ہیں
کہ جو دل پر لگا ہے تیر اس پر بھائی لکھا ہے

دہشت گردی:

- جہاں پچھلے کئی برسوں سے کالے ناگ رہتے ہیں
- ہجرت کرنے والے کا غم

وہاں اک گھونسلا چڑیوں کا تھا، دادی بتاتی ہے
دروازے کا تالا جانے

حب وطنی:

- زمیں بنجر بھی ہوجائے تو چاہت کم نہیں ہوتی

کہیں کوئی وطن سے بھی محبت چھوڑ سکتا ہے

مسلم فرقے کا کرب:

- مدینے تک میں ہم نے ملک کی خاطر دعا مانگی
- سرپھرے لوگ ہمیں دشمن جاں کہتے ہیں
- بس اتنی بات پر اس نے ہمیں 'بلوائی' لکھا ہے

کسی سے پوچھ لے اس کو وطن کا درد کہتے ہیں
ہم جو اس ملک کی مٹی کو بھی ماں کہتے ہیں
ہمارے گھر کے اک برتن پہ 'آئی ایس آئی' لکھا ہے

سیاست:

- بہت سی کرسیاں اس ملک میں لاشوں پہ رکھی ہیں

یہ وہ سچ ہے جسے جھوٹے سے جھوٹا بول سکتا ہے

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ے لہو کیسے بہایا جائے یہ رہبر بتاتے ہیں لہو کا ذائقہ کیسا ہے یہ کھادی بتاتی ہے

امید:

ے آپ سے مل کے یہ امکان ہے باقی کہ ابھی اس سیاست میں بھی انسان کھرا ملتا ہے

ے یہ سچ ہے نفرتوں کی آگ نے سب کچھ جلا ڈالا مگر امید کی ٹھنڈی ہوائیں روز آتی ہیں

ے تمہارا کام ہنستی بستیاں ویران کرنا ہے ہمیں بنجر زمینوں کو حسیں کرنے کی عادت ہے

سچائی:

ے میں جھوٹ کے دربار میں سچ بول رہا ہوں حیرت ہے کہ سر میرا قلم کیوں نہیں ہوتا

دوغلا پن:

ے یہیں پہ امن کی تبلیغ روز ہوتی ہے یہی پہ روز کبوتر حلال ہوتا ہے

سرمایہ داری:

ے قیمت پیتل کے گھنگھرو کی شہر کا سارا سونا جانے

قہر خدا:

ے وہ جاتے جاتے آنکھوں سے ہر خواب لے گیا جتنے بھی پل بنائے تھے سیلاب لے گیا

ے بچپن میں جن کو سیپیاں چننے کا شوق تھا دریا انہیں بہا کے تہہ آب لے گیا

ادب کا تاجرانہ:

ے سنا ہے ان دنوں بازار میں ہر چیز ملتی ہے کسی نقاد سے کوئی مقالہ لے لیا جائے

مندرجہ بالا نمونۂ کلام سے صاف ظاہر ہے کہ منور رانا عام فہم الفاظ سے شعری گل بوٹے نقش کرتے ہیں۔ وہ نہ صرف انفرادی مصائب کو بیان کرتے ہیں بلکہ اجتماعی شعور کی عکاسی کرنے میں بھی کامیاب ہو چکے ہیں۔ اردو ادب میں انہوں نے اپنے لیے ایک مستقل مقام بنایا ہے جو ان کی اَن تھک محنت اور لگن کا ثمر ہے۔

❖ ❖ ❖

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

کارِ زیاں

عالم خورشید

موجودہ دور میں بہت کم شاعری ایسی ملتی ہے جس میں خارجیت اور مقصدیت شامل نہ ہو۔ حالانکہ جدیدیت کی تحریک نے ترقی پسند شاعری کو پس پشت ڈالنے کی کوشش کی تاہم پوری طرح کامیابی نہ مل سکی۔ بہرحال اردو شاعری میں چند ایک آوازیں ہر دور میں ابھرتی رہیں جو ان تحریکوں سے قطع نظر کر کے کلاسیکی اور روایتی قدروں کی آبیاری کرتی رہیں۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں عالم خورشید، جن کی شاعری ان کے درون کی آواز ہے، احساس کا نقش ہے اور بصیرت کی تصویر ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان کی شاعری محض گل و بلبل اور ہجر و وصال کی شاعری بن کر رہ گئی ہے بلکہ وہ زندگی کی گونا گونیت، انسانی جبلت، امید و بیم اور وجودِ حقیقی کا احاطہ بھی کرتی ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ زبان کی سلاست و بلاغت، اسلوب کی یکتائی اور علامتوں اور استعاروں کا برمحل استعمال ان کی شاعری کو ہم عصر تناظر میں امتیازی مقام عطا کرتا ہے۔ زیرِ نظر مجموعے 'کارِ زیاں' سے پہلے موصوف کے تین اردو شعری مجموعے (نئے موسم کی تلاش، زہر گل اور خیال آباد) اور ایک ہندی مجموعہ (ایک دریا خواب میں) شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے 'پرویز شاہدی۔ حیات اور کارنامے' بھی ترتیب دی ہے۔

پیار و محبت، خواب، تنہائی، ناسٹلجیا، انسانی فطرت کے مثبت و منفی پہلو اور ذات کی کھوج عالم خورشید

ناشر: مصنف، ۳۰۴، گلشن وہار، عالم گنج، پٹنہ (بہار) 800007 سن اشاعت: ۲۰۰۸ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

کے محبوب موضوعات ہیں۔ وہ جہد زیست، خود اعتمادی، حق پرستی اور امداد باہمی کو زندگی کی اعلیٰ قدروں سے تعبیر کرتے ہیں۔ نمونۂ کلام:

محبت:

ے کہیں پہ جسم کہیں پر خیال رہتا ہے — محبتوں میں کہاں اعتدال رہتا ہے
ے تمام ہوتا نہیں عشق ناتمام کبھی — کوئی بھی عمر ہو یہ لازوال رہتا ہے
ے عشق میں تہذیب کے ہیں اور ہی کچھ فلسفے — تجھ سے ہو کر ہم خفا خود سے خفا رہنے لگے
ے پھینکا تھا کبھی پھول کسی شعلے کی جانب — اب شعلے کا میں حسن عمل دیکھ رہا ہوں

حسن کامل:

ے تمام رنگ ادھورے لگے ترے آگے — سو تجھ کو لفظ میں تصویر کرتا رہتا ہوں

خواب:

ے میں نے بچپن میں ادھورا خواب دیکھا تھا کوئی — آج تک مصروف ہوں اس خواب کی تکمیل میں
ے دریا کی سیر کرتے گزری ہے عمر عالمؔ — خشکی پہ بھی چلوں تو گرداب دیکھتا ہوں

اشتیاق:

ے مری آنکھوں کی ویرانی میں اتروگے تو جانوگے — کہ ہر صحرا کسی دریائے امکانی سے ملتا ہے
ے بہت شدت سے ڈھونڈوگے تو وہ کھو جائے گا عالمؔ — جسے ڈھونڈا نہیں جاتا وہ آسانی سے ملتا ہے

انتظار:

ے دیار شب میں اجالا بہت ضروری ہے — کہیں چراغ کہیں دل جلائے جاتے ہیں

تنہائی:

ے تنہائی کا زہر تو وہ بھی پیتے ہیں — جن لوگوں کے ساتھ زمانہ ہوتا ہے

یادیں:

ے ہمیں خبر ہے کبھی لوٹ کر نہ آئیں گے — گئے دنوں کو مگر ہم بلاتے رہتے ہیں
ے دیار غیر میں رہتا ہوں میں مگر عالمؔ — ہر ایک لمحہ مرا گھر بلا رہا ہے مجھے

فطرت انسانی:

ے جی کرتا ہے بھالو، بندر نام رکھیں — کون سی وحشت ہم انسان نہیں کرتے

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ے طوفانوں کی مدح سرائی، نکتہ چینی شعوں کی — عقل خرد کا طبقہ بھی اب پاگل ہوتا جاتا ہے
ے جو میں ہوں اس کو چھپاتا ہوں سارے عالم سے — جو میں نہیں ہوں وہ تشہیر کرتا رہتا ہوں

جہد زندگانی:

ے مجھے بھی شوق ہے دنیا کو زیر کرنے کا — میں اپنے آپ کو تسخیر کرتا رہتا ہوں
ے کچھ رستے مشکل ہی اچھے لگتے ہیں — کچھ رستوں کو ہم آسان نہیں کرتے
ے ہر ایک راہ گزر پر نظر جماتے ہوئے — میں چل رہا ہوں نیا راستہ بناتے ہوئے

حق پرستی:

ے قلم ہونے کا خطرہ ہے اگر میں سر اٹھاتا ہوں — جو گردن کو جھکاؤں تو مری دستار گرتی ہے
ے ہمیں محتاط ہو کر آج تک چلنا نہیں آیا — وہ ٹھوکر آگہی کی تھی یہ لغزش گمرہی کی ہے

استعداد:

ے پتھر چلائے سب نے بھلے کام جب کئے — لیکن برا کیا تو پذیرائی کی مری
ے اہل ہنر کو آنکھوں میں کیوں چبھتا رہتا ہوں — میں تو اپنی بے ہنری پر ناز نہیں کرتا

مغلوبیت:

ے زباں تراش لی ہونٹوں کو سی لیا ہم نے — اب اور کیسے زمانے سے التجا کرتے

زندگی کی بے ثباتی، جوہرِ وجود، اعتقاد اور نور الٰہی شاعر کو میدانِ تصوف کی صحرا نوردی کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں جس کے سبب مندرجہ ذیل اشعار رقم ہوتے ہیں۔

بے ثباتی:

ے دائم تو یہاں کچھ بھی نہیں ہے مگر اب کے — میں شام ابد، صبح ازل دیکھ رہا ہوں
ے حساب سود وزیاں سے غرض نہیں مجھ کو — کہ میں حیات کو مثل حباب دیکھتا ہوں

وقت:

ے وقت بدن کے زخم تو بھر دیتا ہے لیکن — دل کے اندر کچھ تبدیلی ہو جاتی ہے

روشنی:

ے دُعا کرتا ہوں اب سورج سوا نیزے پہ آجائے — چراغوں کو جلانے سے اندھیرا کم نہیں ہوتا

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

اعتقاد:

ے وہم کے ایک ہی جھونکے سے لرز اٹھتی ہے — کتنی مخدوش یہ دیوار یقین ہوگئی ہے

مشیّت:

ے ہم دور ہوئے جاتے ہیں ہر لمحہ خدا سے — کس راہ پہ اب خلق خدا چلنے لگی ہے

ے خطائیں کرتے جائیں گے خدا محفوظ رکھے گا — یہی بنیاد اب شاید ہماری بندگی کی ہے

یہ سچ ہے کہ عالم خورشید اکثر ذات کو ہی اپنی شاعری کا محور بناتے ہیں مگر جب ذاتی کرب ان کے ماحول کا حصہ بن جاتا ہے تو شاعر کے اندر زندگی کی صعوبتوں، سیاسی کارستانیوں، دہشت گردی کی تباہ کاریوں اور امن کی خواہشوں کا احساس جگاتا ہے۔ اس نہج کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

شہری زندگی:

ے اے شہر بدحواس! میں تنہا نہیں اداس — یاں چین اور قرار تو سب کے نہیں رہے

ے عیش وطرب کی شرط پہ زندہ ہیں رابطے — رشتے کہیں بھی درد وتعب کے نہیں رہے

سیاست:

ے کیسی ہیں تعزیریں اپنی، کیا اپنے منصوبے ہیں — رفتہ رفتہ شہر ہمارا جنگل ہوتا جاتا ہے

ے سازش ہوتی رہتی ہے دیوار ودر میں — گھر سے اچھا اب مجھ کو باہر لگتا ہے

ے فلک پر آشیاں تعمیر کرنا چاہتے ہیں ہم — زمین تاراج کرنے کا ہمیں کچھ غم نہیں ہوتا

ے بجھا دیئے ہیں اسی نے کئی چراغ مرے — جو ایک شمع جلا کر بلا رہا ہے مجھے

ے ایک ہونے نہیں دیتی ہے سیاست لیکن — ہم بھی دیوار پہ دیوار اٹھائے ہوئے ہیں

بدنظامی:

وسائل سب میسر ہیں تو ہر شئے کی کمی کیا سبب آخر — جہاں دریا ہی دریا ہوں وہاں تشنہ لبی کا کیا سبب آخر

وہ قلم کرتے رہیں گے شاخ گل، شاخ ثمر — اور ہمیں فرمان یہ ہے ہم شجر کاری کریں

میں رشوت کے مصلّے پر نمازیں پڑھ نہ پایا — بدی کے ساتھ مجھ سے بندگی ہوتی نہیں ہے

دہشت گردی:

ے وہ امرت کے جو جھرنے تھے ہوئے ہیں خشک کیوں عالم — اب اس پربت کی چوٹی سے لہو کی دھار گرتی ہے

ے دروازے پر دستک دیتے ڈر لگتا ہے — سہما سہما سا اب میرا گھر لگتا ہے

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

چاروں طرف ہیں شعلے، ہمسائے جل رہے ہیں میں گھر میں بیٹھا بیٹھا بس ہاتھ مل رہا ہوں

تشنگی ڈھونڈ کہیں اور ٹھکانہ اپنا اب تو سیراب لہو سے یہ زمیں ہوگئی ہے

امن:

؎ یہ دنیا بھی تو جنت کی کوئی تصویر ہوجاتی اگر حرص وہوس میں مبتلا آدم نہیں ہوتا

اُمید:

؎ زندہ رہنے کی خاطر ان آنکھوں میں کوئی نہ کوئی خواب سجانا ہوتا ہے

آخر میں عالم خورشید کی شاعری پر ظفر گورکھپوری کے تاثرات پیش کرتا ہوں:۔

''آپ کے یہاں بڑی قابل قدر بات یہ ہے کہ عصری موضوعات کو نظم کرتے وقت آپ فن کی جمالیاتی قدروں کو فراموش نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے یہاں گمبھیر تجربات کے اظہار میں بھی شاعری کا لطف کم نہیں ہوتا۔''

❖ ❖ ❖

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

شعری مجموعہ

گلاب زخموں کے

گلشن کھنہ

اُردو کی نئی بستیوں میں گلشن کھنہ کا نام نمایاں ہے۔ ہجرت کا مارا، ۷۴ سالہ شاعر، افسانہ گار، محقق اور نقاد حافظ آباد پاکستان میں پیدا ہوا، تقسیم ہند کے بعد امرتسر چلا آیا اور پھر تلاش روزگار کی خاطر جرمنی ہوتا ہوا انگلستان پہنچ گیا۔ اسی جہد زندگانی کی بھٹی میں سونا تپ کر کندن ہو گیا۔ اردو میں ان کے تین افسانوی مجموعے (بارش میں ایک آدمی، درد جو آنکھوں سے بہا، اور، کھوئی ہوئی جنت)، تین شعری مجموعے (بکھرے بکھرے خواب، چراغ آرزو اور سوچ کی خوشبو) اور انگریزی میں پانچ تصانیف اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ ایک ناول بعنوان 'نادان' اور ایک خودنوشت سوانح عمری 'یادوں کے جگنو' طباعت کے مراحل سے گذر رہے ہیں۔

فکر و فن کے لحاظ سے گلشن کھنہ کی آزاد خیالی، راست گوئی اور شگفتہ بیانی انہیں اپنے ہم عصروں میں اعلیٰ مقام عطا کرتی ہے۔ ان کے مشاہدے کا کینواس بہت وسیع ہے اور ان کی زندگی جہد مسلسل کی آئینہ دار ہے۔ چنانچہ خود ہی ایک شعر میں فرماتے ہیں۔

روشن ہے امید کی مشعل ہستی کے غم خانوں میں
ہم نے جینا سیکھ لیا ہے دنیا کے ویرانوں میں

ناشر: انتساب پبلی کیشنز، سرونج (ایم پی) سن اشاعت: ۲۰۰۹ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

گلشن کھنہ نے ماقبل آزادی کی رواداری اور تقسیم کے بعد کی خونریزی دیکھی ہے۔ ہجرت کا کرب انہوں نے کئی بار جھیلا ہے اور پھر مشرقی و مغربی تہذیبوں کا تصادم اور اقدار کی شکست و ریخت کے شاہد بھی رہے ہیں۔ اس کے باجود ان کی سوچ کبھی مکدر نہیں ہوئی۔ مذہبی اور نسلی بھید بھاؤ سے ان کا دل بارہا کراہ اٹھا جبکہ ان کو اپنی دھرتی کی بو باس ہمیشہ تڑپاتی رہی۔

ے پیار کی خوشبو آتی تھی انسانوں کے کرداروں سے — اب نفرت کی بو آتی ہے گلیوں سے بازاروں سے

ے ہر ترقی لے گئی ہم کو تباہی کے قریب — اب مقدر میں ہمارے چین کی دولت کہاں

شاعر کے یہاں غم جاناں اور غم دوراں دونوں ملتے ہیں۔ ذاتی غم کو انہوں نے یوں اپنے شعروں میں ڈھالا ہے۔

ے زندگی اور کیا دے سکتی مجھے — ایک دُکھ تھا جو کہ اپنا ہوگیا

ے کتاب زیست میں خوشیوں کے بھی حوالے ہیں — مگر جلی نظر آتے ہیں باب زخموں کے

ے ملا جو وقت تو سود وزیاں کی سوچیں گے — ابھی تو پیش نظر ہیں حساب زخموں کے

ے کس کو گلشن میں ہر اک زخم دکھائیں اپنا — ہم نے تو سینۂ گل میں بھی ہیں خنجر دیکھے

ے کیسے کہوں کہ اپنے بھی اپنے نہ ہوسکے — کس کس کو دل کا درد سناتا رہا ہوں میں

ے میں اسے پاکر بھی تنہا ہوگیا — ڈوب کر دریا میں پیاسا ہوگیا

ے بھولی بسری کتنی باتیں یاد آتی ہیں نہ پوچھ — دل مچل جاتا ہے تصویریں پرانی دیکھ کر

ے نیچے نہ آگرے کہیں اونچی اڑان سے — باہر نکل کے دیکھ انا کے مکان سے

انسان کی خصلت اور بہروپ کے بارے میں شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

ے یارب یہ کیسا آج کا انسان ہوگیا — تخلیق کرکے تو بھی پشیمان ہوگیا

ے ہر اک قدم پہ لوٹنے والے کو دیکھیے — باتیں بنا رہا ہے وہ غم خوار کی طرح

ے حرص و ہوس کی اس دنیا میں لوگوں کے بہروپ تو دیکھ — صبح کا نور لبوں پر، من میں لیے اندھیرے پھرتے ہیں

ے جو قیدی رہے عمر بھر وہ پرندے — خدا جانے کیوں اپنے پر ڈھونڈتے ہیں

گلشن کھنہ کے یہاں سماجی اور سیاسی شعور بھی اعلیٰ درجے کا ملتا ہے۔ وہ اپنے معاشرے کا بغور جائزہ لیتے ہیں اور منتھن کرکے اس سمندر سے مندرجہ ذیل اشعار نکال لاتے ہیں۔

ے قاتل ہے کہ ہاتھ میں اک خوں بھرا خنجر — منصف ہے کہ انصاف کا رستا نہیں ملتا

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ے لوٹا ہے جس نے شہر کے صبر وقرار کو — وہ شخص میرے شہر کا پردھان ہوگیا
ے گلشن ہمارے باغ میں کیسی لگی یہ آگ — پھولوں کے ساتھ ساتھ دل وجان جل گئے
ے پتہ پتہ بوٹا بوٹا گھرا ہوا ہے شعلوں میں — آگ لگادی کس نے یہ گلشن اب میرے گلزاروں میں
ے آؤ گلشن ہم بھی آنکھوں سے بہائیں سیلِ غم — ذرّہ ذرّہ رو رہا ہے وادیٔ کشمیر کا
ے پرندے ہم کو پیڑوں پر دکھائی کیوں نہیں دیتے — کسی بھی شاخ پر اب گھر دکھائی کیوں نہیں دیتے
ے جو پیڑ کاٹ دیے ، خشک گھاس رہنے دو — بدن پہ دھرتی کے کوئی لباس رہنے دو

ان خونچکاں مناظر کو دیکھنے کے باوجود شاعر رجائیت کو اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ انہیں یقین ہے کہ مستقبل روشنیاں بکھیرتا ہوا چلا آئے گا۔

ے سنواریں اک نئے جذبے سے پھر سے سارے گلشن کو
کہیں بھی اب کوئی عکس خزاں باقی نہ رہ جائے

نظموں میں بھی گلشن کھنہ کے فکر کا تسلسل اپنے جوہر دکھاتا ہے۔ کبھی وہ اپنے مادر وطن کو یاد کرتے ہیں (ہندوستان کی خوشبو)، کبھی اپنی بے وطنی کا اظہار 'سوکھے پتے' کے توسط سے کرتے ہیں، کبھی 'عورت' کی کسمپرسی کا نوحہ رقم کرتے ہیں، کبھی 'سیاہ گلاب' کو نسلی امتیاز کا استعارہ بناتے ہیں اور کبھی گاندھی جی کی طرح بے پولیس ملک (Policeless state) کی کلپنا کرتے ہیں۔ (ایک خواب)۔ اسی طرح گیتوں میں بھی شاعر کا لہجہ نکھر آتا ہے۔ برسات کے کالے گھنیرے بادل، برہا کی اگنی اور ملن کی آس سبھی شاعر کو مضطرب کردیتے ہیں۔ ایک گیت میں انہوں نے اپنے مہان بھارت دیش کی دُردشا منظوم پیرائے میں پیش کی ہے جس میں طنز کی کاٹ بھی ہے اور مزاح کی چاشنی بھی۔

زیر نظر مجموعے میں کئی ماہیئے بھی شامل ہیں جن میں گلشن کھنہ، جو پنجاب سے تعلق رکھتے ہیں، کی روح بولتی ہے۔ چند ماہیے ملاحظہ ہوں۔

ے اک جھلک دکھا جاتو / کاجل بن کر ہی / آنکھوں میں سما جاتو
ے یہ دنیا نکھرتی ہے / پہرے ہوں لاکھ مگر / خوشبو تو بکھرتی ہے
ے خود کو بہلاتے ہیں / لوگ جلائیں دیئے / ہم دل کو جلاتے ہیں
ے پھولوں میں کانٹے ہیں / مذہب والوں نے / انسان بھی بانٹے ہیں

آخر میں پروفیسر مختار شمیم کے مضمون کا ایک اقتباس پیش کرتا ہوں جو گلشن کھنہ کی شاعری کی

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

خصوصیات کو چند الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

''گلشن کھنہ کی شاعری بھی زندگی کا وہی سچ ہے، جسے آپ ہم عصری حسیت کا نام دیتے ہیں، ان کی عصری حسیت رومانوی لہروں میں بار پاتی ہے اور مسائل کی دھوپ میں نیا عرفان حاصل کر لیتی ہے۔''

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

خیال موسم

ـــــ جاوید ندیمؔ

جاوید ندیمؔ اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو ترقی پسندی اور جدیدیت دونوں کو رد کر چکی ہے اور اس کے بدلے میں معنویت، تیقن اور اعتدال پسندی کو اپنا شعار بنا چکی ہے۔ ان کے یہاں ادب کا اصل موضوع انسان ہے، وہ انسان جو باطن میں اپنے ظاہر سے مختلف ہے۔ ندیمؔ کا ماننا ہے کہ اصل میں آدمی وہ نہیں جو نظر آتا ہے بلکہ وہ ہے جو نظر نہیں آتا۔ بقول جاوید ندیم ''شعر و ادب محض زندگی کا عکاس نہیں بلکہ عظیم صداقت کی تفہیم، تعبیر اور اس تک رسائی کا وسیلہ بھی ہے۔'' وہ ادب کو زندگی کے بہیمی اور اسفل جذبات کی عکاسی نہیں مانتا بلکہ حق اور صداقت کی کھوج کا وسیلہ گردانتا ہے۔ شاعر جہاں معقولیت اور مقصدیت کو ادب کا جزو سمجھتا ہے وہیں اسے شرط ماننے کو تیار نہیں۔ زندگی کی اصلیت کو سمجھنے کی یہ جستجو ایک جانب انہیں علامہ اقبال کے قریب تر کرنے میں مدد کرتی ہے اور دوسری طرف ان کی شاعری میں تصوف کے جوہر کو نمایاں کر دیتی ہے۔ اس ضمن میں چند اشعار درج ذیل ہیں۔

ـ ابتدا اور انتہا کے بیچ حائل کون؟ میں!
حال، ماضی اور فردا مجھ میں سب اَدوار گُم

ـ میرے وجود سے تھا تماشہ یہاں ندیمؔ
میں کیا گیا کہ ساتھ سبھی خیر و شر گیا

ـ لمحے میں زندگی کا سمٹنا نہ پوچھیے
کتنے سمندروں کو ہے قطرہ لیے ہوئے

ناشر: تکمیل پبلی کیشنز، ممبئی / بھیونڈی
سن اشاعت: اپریل ۲۰۰۷ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ے بزم کی رونق مجھ سے ہے — محفل محفل تنہا میں

ے میں تو خوشبو ہوں، ہوا کے ساتھ جانا ہے مجھے — روک پاؤ گے مجھے کب، بن کے یوں دیوار تم

ے زیست کیا شئے ہے؟ یہ جاوید سمجھنا مشکل — کبھی ذرّہ، کبھی قطرہ، کبھی دریا ہو جاؤں

ے پوچھا جو میں نے اس سے بتا زندگی ہے کیا؟ — بولا کہ ہر قدم پہ نیا امتحان دیکھ

ے تم مجھ سے زندگی کے معنی نہ پوچھنا — پھولوں کے خواب، ٹاٹ کا بستر مجھے ملا

ے یاد کچھ آتا نہیں، ہم نے اسے دیکھا کہاں — کیا خبر وہ خود بھی ہو، تصویر کا چہرہ بھی ہو

ے صرف ایقان ہی ایمان رہا ہے اپنا — ہم نے پہلے بھی خدا کو بھلا دیکھا کب تھا

ے گلوں میں باس ہے پتوں میں سبزۂ خوش رنگ — وجہ تو ہوگی کوئی اس حسین منظر کی

ے سمجھ میں آئیں گے تری رموزِ کائنات سب — پسِ فصیلِ ذات بھی، کبھی تو اعتکاف کر

ے صدا نہ روشنی یہاں، ہوا نہ کوئی باس ہے — فصیل جاں کو توڑ یا فصیل شگاف کر

صنف غزل کے حوالے سے جاوید ندیم کے استاد نشتر خانقاہی فرماتے ہیں کہ ''جاوید ندیم ان نوجوان شاعروں کی صف میں ہیں جنہوں نے غزل میں روایتی انداز کی قافیہ پیمائی نہیں کی بلکہ قوافی کو اپنے خیال، ضرورت یا تجربے کے اظہار کی ضرورت کے مطابق برتا۔'' اک اور جگہ لکھتے ہیں کہ ''جاوید ندیم کا یہ شعری مجموعہ (خیال موسم) جو اس وقت میرے سامنے ہے وہ ان کے پہلے مجموعوں کی غزلیات کے مقابلے میں کہیں زیادہ صاف ستھرا اور جاندار ہے۔ اس میں ان کے فن پر اور زیادہ نکھار آیا ہے اور ان کے یہاں کا شعری اظہار اور زیادہ پختہ ہوا ہے۔''

حالانکہ ندیم صاحب کو موضوعاتی شاعری اچھی نہیں لگتی تاہم انہوں نے روایتی موضوعات پر کئی شعر کہے ہیں۔ ان کے اشعار میں جذبۂ شوق، احساس جمال، یکسوئی، انتظار، یاد، ہجر، محبوب کی بے اعتنائی، تنہائی وغیرہ دیکھنے کو ملتے ہیں۔

ے جذبۂ شوق جگاتا تھا تغافل اس کا — یہ وفا تھی کہ ادا تھی یا جفا تھی، کیا تھی

ے تو زباں میری بنے میں ترا لہجہ ہو جاؤں — تجھ سے شہرت ہو مری، میں ترا چرچا ہو جاؤں

ے گیلی مٹی ہوں میں کنارے کی — اور بہتا ہوا وہ اک دریا

ے دستک کوئی نہ در پہ ہو، لیکن لگن رہے — ہر لمحہ انتظار کسی کا لگا رہے

ے میں تیری یاد سے ہر لحظہ روشناس رہا — تو دور ہو کے بھی ہر وقت میرے پاس رہا

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ے تمہارے دم سے تھی موسم کی تازگی یعنی
تمہارے بعد یہ موسم بہت اداس رہا

ے جانتا خوب ہوں میں طرفہ طریقہ اس کا
زخم دے کر مجھے جینے کی دعا بھی دے گا

ے آنکھوں سے رنگ، پھول سے خوشبو جدا رہے
روٹھی رہے حیات وہ جب تک خفا رہے

ے رہتا ہے عجلتوں میں کہ آیا، چلا گیا
بیٹھے کبھی تو اس سے کہوں دل کا حال میں

ے گھر کی تنہائی میں ایام گذشتہ رکھ دے
ناؤ کاغذ کی بہا، دھوپ میں شیشہ رکھ دے

ے پھر دن میں میرے ساتھ کوئی حادثہ نہ ہو
دل ہے کہ ساری رات یہی سوچتا رہے

ے جھیل ہو تم تو سکوں اوڑھ کے سو سکتے ہو
میں تو دریا ہوں، مرا بخت سفر میں رہنا

جاوید ندیمؔ کا اصلی نام عبدالخالق انصاری ہے۔ بجنور، اتر پردیش میں ۱۱/اکتوبر ۱۹۵۸ء کو پیدا ہوئے اور اب پنویل نوی ممبئی میں اقامت پذیر ہیں۔ تین کتابیں پہلے ہی شائع ہو چکی ہیں۔ (۱) پنچھی رخصت ہوئے (اردو نظمیں اور غزلیں ۱۹۹۳ء)، (۲) ایک اور شنکھر (ہندی شاعری ۱۹۹۹ء)، ۳۔ موجِ خیال (فکر پارے۔ اُردو ۲۰۰۲ء)۔ علاوہ ازیں سات کتابیں ہندی اور اردو میں طباعت کے مرحلوں سے گزر رہی ہیں۔ شاعری کے بارے میں ندیم کا خیال ہے کہ ''شاعری ایجاز و اختصار کا نام ہے۔ اور شعر میں یہ ایجاز و اختصار اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے اور یہ ایجاز ہی شعر کا اصل کمال ہے اور اس کا حسن بھی..... شعر پڑھتے ہی طبیعت میں انبساط و انشراح پیدا ہو۔ دوسری یہ کہ قاری یا سامع کے احساسات خفتہ میں بیداری آئے۔ تیسری یہ کہ وہ ذہنی سطح پر فکری ارتعاش کا سبب بنے۔'' خود اپنی شاعری کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں۔ ''میں شاعری کے ساتھ جبر نہیں کرتا۔ شعر نہیں ہوتے تو مہینوں نہیں ہوتے اور جب طبیعت موزوں ہوتی ہے تو روز ہی غزلیں ہوتی ہیں اور یہ سلسلہ کئی دنوں چلتا ہے۔ جہاں تک زمینوں کا معاملہ ہے میں دوسروں کو زمینوں میں ہل چلا کر فصل اگانے کا قائل نہیں ہوں۔'' جاوید ندیم شاعری کو خدا کی دین مانتے ہیں حالانکہ کبھی کبھی موجودہ حالات کو دیکھ کر اسے بدظن بھی ہو جاتے ہیں۔

ے کسب کا حاصل کہاں یہ، فضل رب کا جانیے
پہلے کب شعروں میں تھی ایسی روانی دیکھیے

ے شعر افسانے، مضامین، ان سے کیا حاصل ہوا؟
کاغذوں کو لکھ کے کیوں کرتے رہے بے کار تم

ے کاغذ سیاہ تم نے عبث ہی کیے ندیمؔ
حل شاعری سے کوئی بھی کیا مسئلہ ہوا؟

غم ذات کے ساتھ ساتھ شاعر کو غم دوراں کا بھی احساس ہے۔ وہ آس پاس کے ماحول سے نگاہ نہیں پھیرتے۔ انہیں اپنے معاشرے میں ہو رہی بدعنوانیوں، دہشت گردی، ماحول کی کثافت،

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

مسابقت، بڑھتی صارفیت اور تجارتیانے وغیرہ کا پورا احساس ہے۔ ان احساسات کو وہ مندرجہ ذیل اشعار میں قلمبند کرتے ہیں:

گاؤں/ شہر:

ے شہری تعلقات ضرورت کی دین ہیں — میرے قریب گاؤں کی پہچان بن کے آ
ے تم کو لبھا رہی ہیں یہ شہروں کی رونقیں — شہروں سے لوگ کتنے ہیں بے زار دیکھنا

بچپن کی یاد:

ے صبح اسکول کو جاتے ہوئے بچے دیکھوں — زندگی! تو بھی مرے شانوں پہ بستہ رکھ دے

دہشت گردی:

ے دیوار و در گھروں کے ہیں وحشت زدہ سبھی — لیکن سجے ہیں کوچہ و بازار دیکھنا
ے لوٹو، جلاؤ، قتل کرو، اذنِ عام ہے — حاکم نے ڈھیلی چھوڑ دی سب کی زمام ہے
ے رات کرفیو بھی تھا اور دھماکے ہوئے — خوف دِل پہ رہا اپنے طاری بہت
ے شہروں کی بے حسی تو سنی تھی مگر یہ کیا — جو جل رہا تھا گاؤں میں، میرا مکان تھا
ے دو پل کو بھی سکون سے جینا محال ہے — اب زندگی گزرتی ہے خوف و ہراس میں
ے ہلتے ہیں برگ و شاخ تو لگتا ہے کوئی ہے — ہر شخص اپنے آپ میں سہما ہوا لگا
ے قتل ہونے پر اچنبھا آنکھ کو ہوتا نہ تھا — شہر میں ایسا سماں پہلے کبھی دیکھا نہ تھا
ے زندگی لگے ایسے، جیسے ہوں کھنڈر میں ہم — لمحہ لمحہ وحشت ہے، جی رہے ہیں ڈر میں ہم

دوست نما دشمن:

ے خنجر چھپا کے لائے تھے جو آستین میں — سمجھا کیے تھا اُن کو جہاں کا امین میں

ہوس:

ے وہ اپنے آپ میں خود بھی تو ایک دریا تھا — بہا کے لے گئی چاہت مگر سمندر کی

اَنا:

ے کیسے کرتے بتا سر کو خم ہم بھلا — بوجھ اپنی اَنا کا تھا بھاری بہت

غربت:

ے دیکھ کر دیوار و دَر کی خستگی — چھت پہ میری آ کے بادل رو پڑا

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

تجارتیانہ:

ے پیروفقیر سارے ہیں تاجر بنے ہوئے — بے دام اب کسی کا بھی ہوگا نہیں بھلا

طفیلیت:

ے میں شجر ہوں تو امربیل ہیں رشتے سارے — میرا ہوکر بھی وہ اک شخص کہ میرا کب تھا

راھزنی:

ے جو رہ نما تھے میرے، کہاں ہیں وہ نقش پا — منزل پہ چھوڑتا تھا جو رستہ کدھر گیا

لذتِ گناہ:

ے راغب بھلا کیوں ہوتا نہیں خیر کی طرف — محسوس دِل کو ہوتی ہے لذّت گناہ میں

مسابقت:

ے کرلو کچھ وصف اضافی ذرا پیداخود میں — اتنا آساں نہیں پتھر کے نگر میں رہنا

مشینی دور:

ے پھر یوں ہوا کہ لوگ مشینوں میں ڈھل گئے — وہ دوست لب پہ لے کے دِلاسہ کدھر گیا

ے ہیں روز وشب حیات کے یکسانیت بھرے — جاوید بن کے رہ گیا زندہ مشین میں

ماحول کی کثافت:

ے راستے تو ہوگئے کتنے کشادہ دیکھیے — راستوں کے بازوؤں سے ہوگئے اشجار گم

ے شہر آخر کھا گیا قدرت کی سب رنگینیاں — پیڑ، پودے، جھیل، میداں، گھاٹیاں کہسار گم

کہیں کہیں جاوید ندیم طنز ومزاح سے کام لے کر بڑے غور وفکر کی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ ملاحظہ ہو چند اشعار:

ے کام کچھ نہ آئے تو آسان ہے — یا تو ٹیچر بنو یا امامت کرو

ے ڈھائی غزلیں ہی جن کا اثاثہ ہیں کل — دیکھیے ان کا نام ونشاں دُور تک

ے اب سیاست دلالت سے مملو ہے — اور معزز حجامت کا پیشہ ہوا

سب سے بڑی بات جو جاوید ندیم کی شاعری میں دیکھنے کو ملتی ہے وہ ہے مثبت سوچ وفکر۔ یہی وہ رجحان ہے جو انہیں خدا کے وجود کا احساس دلاتا ہے۔ اور اسی احساس کے تحت وہ فرماتے ہیں۔

ے کچھ نہ کچھ رختِ سفر پاس بچا کر رکھنا — اکِ سفر اور پس ختم سفر بھی ہوگا

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

مسابقت، بڑھتی صارفیت اور تجارتیانے وغیرہ کا پورا احساس ہے۔ ان احساسات کو وہ مندرجہ ذیل اشعار میں قلمبند کرتے ہیں:

گاؤں/ شہر:

ے شہری تعلقات ضرورت کی دین ہیں — میرے قریب گاؤں کی پہچان بن کے آ
ے تم کو لبھا رہی ہیں یہ شہروں کی رونقیں — شہروں سے لوگ کتنے ہیں بے زار دیکھنا

بچپن کی یاد:

ے صبح اسکول کو جاتے ہوئے بچے دیکھوں — زندگی! تو بھی مرے شانوں پہ بستہ رکھ دے

دہشت گردی:

ے دیوار و در گھروں کے ہیں وحشت زدہ سبھی — لیکن سجے ہیں کوچہ و بازار دیکھنا
ے لوٹو، جلاؤ، قتل کرو، اذنِ عام ہے — حاکم نے ڈھیلی چھوڑ دی سب کی زمام ہے
ے رات کرفیو بھی تھا اور دھماکے ہوئے — خوف دِل پہ رہا اپنے طاری بہت
ے شہروں کی بے حسی تو سنی تھی مگر یہ کیا — جو جل رہا تھا گاؤں میں، میرا مکان تھا
ے دو پل کو بھی سکون سے جینا محال ہے — اب زندگی گزرتی ہے خوف و ہراس میں
ے ہلتے ہیں برگ و شاخ تو لگتا ہے کوئی ہے — ہر شخص اپنے آپ میں سہما ہوا لگا
ے قتل ہونے پر اچنبھا آنکھ کو ہوتا نہ تھا — شہر میں ایسا سماں پہلے کبھی دیکھا نہ تھا
ے زندگی لگے ایسے، جیسے ہوں کھنڈر میں ہم — لمحہ لمحہ وحشت ہے، جی رہے ہیں ڈر میں ہم

دوست نما دشمن:

ے خنجر چھپا کے لائے تھے جو آستین میں — سمجھا کیے تھا اُن کو جہاں کا امین میں

ہوس:

ے وہ اپنے آپ میں خود بھی تو ایک دریا تھا — بہا کے لے گئی چاہت مگر سمندر کی

اَنا:

ے کیسے کرتے بتا سر کو خم ہم بھلا — بوجھ اپنی اَنا کا تھا بھاری بہت

غربت:

ے دیکھ کر دیوار و دَر کی خستگی — چھت پہ میری آ کے بادل رو پڑا

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

تجارتیانہ:

ے پیروفقیر سارے ہیں تاجر بنے ہوئے — بے دام اب کسی کا بھی ہوگا نہیں بھلا

طفیلیت:

ے میں شجر ہوں تو امربیل ہیں رشتے سارے — میرا ہوکر بھی وہ اک شخص کہ میرا کب تھا

راھزنی:

ے جو رہ نما تھے میرے، کہاں ہیں وہ نقش پا — منزل پہ چھوڑتا تھا جو رستہ کدھر گیا

لذت گناہ:

ے راغب بھلا کیوں ہوتا نہیں خیر کی طرف — محسوس دِل کو ہوتی ہے لذّت گناہ میں

مسابقت:

ے کرلو کچھ وصف اضافی ذرا پیداخود میں — اتنا آساں نہیں پتھر کے نگر میں رہنا

مشینی دور:

ے پھر یوں ہوا کہ لوگ مشینوں میں ڈھل گئے — وہ دوست لب پہ لے کے دِلاسہ کدھر گیا

ے ہیں روز وشب حیات کے یکسانیت بھرے — جاوید بن کے رہ گیا زندہ مشین میں

ماحول کی کثافت:

ے راستے تو ہوگئے کتنے کشادہ دیکھیے — راستوں کے بازوؤں سے ہوگئے اشجار گم

ے شہر آخر کھا گیا قدرت کی سب رنگینیاں — پیڑ، پودے، جھیل، میداں، گھاٹیاں کہسار گم

کہیں کہیں جاوید ندیم طنز ومزاح سے کام لے کر بڑے غور وفکر کی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ ملاحظہ ہو چند اشعار:

ے کام کچھ نہ آئے تو آسان ہے — یا تو ٹیچر بنو یا امامت کرو

ے ڈھائی غزلیں ہی جن کا اثاثہ ہیں کل — دیکھیے ان کا نام ونشاں دُور تک

ے اب سیاست دلالت سے مملو ہے — اور معزز حجامت کا پیشہ ہوا

سب سے بڑی بات جو جاوید ندیم کی شاعری میں دیکھنے کو ملتی ہے وہ ہے مثبت سوچ وفکر۔ یہی وہ رجحان ہے جو انہیں خدا کے وجود کا احساس دلاتا ہے۔ اور اسی احساس کے تحت وہ فرماتے ہیں۔

ے کچھ نہ کچھ رختِ سفر پاس بچا کر رکھنا — اکِ سفر اور پس ختم سفر بھی ہوگا

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

بہر حال اسی مثبت سوچ کے سبب جاوید ندیم کے یہاں رجائیت، امید اور عزم کی فروانی نظر آتی ہے۔ چند اشعار:

ہر پَل پکارتا ہے نیا آسمان دیکھ ۔ مہمیز مجھ کو جذبۂ پرواز ہے مرا

مشکل بہت ہے راہ جوشوقِ سفر گیا ۔ جانو کہ زندگی کی بقا آرزو سے ہے

یہ بھی نہیں کہ آج میں اچھا نہیں کوئی ۔ ایسا نہیں کہ کل میں برائی کوئی نہ تھی

جاوید ندیم کی شاعری میں نہایت لطیف اور اثیری احساس ملتا ہے۔ وہ نہ تو ہجر کے غم میں سینہ کوبی کرتے ہیں اور نہ ہی معاشرے کی تطہیر کے واسطے بلند بانگ نعرے لگاتے ہیں۔ وہ دھیمے دھیمے لہجے میں دل کی پنہائیوں میں اتر جاتے ہیں۔ ندیم انسان اور انسانی خوشحالی کی ہر دم تمنا کرتے ہیں۔ ان کی شاعری کا مقصد ہی انسانی عظمت اور برتری کی بازیافت ہے۔

❖ ❖ ❖

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

خواب پارہ

ـــــ خالد بشیر احمد

وادیٔ کشمیر سے تعلق رکھنے والے شاعر اور نثر نگار خالد بشیر احمد کا شعری مجموعہ 'خواب پارہ' حال ہی میں منظر عام پر آچکا ہے۔ اس سے پہلے ان کا شعری مجموعہ 'صدائے نیم شب' اور جہلم و کشمیر کی تاریخ اور ثقافت سے وابستہ کتاب 'دیدۂ آب رواں' شائع ہو چکی ہے۔ علاوہ ازیں انہوں نے انگریزی میں بھی 'Jhelum-The River through My Backyard' قلمبند کی ہے موصوف نے ۱۹۷۹ء میں صحافت کے میدان میں قدم رکھا، ماہنامہ 'تعمیر' سرینگر کی ادارت ایک دہائی تک سنبھالی اور پھر اسی میدان میں کئی اہم مرحلے طے کیے۔

گذشتہ تیس برس سے کشمیر کی فضا جن حالات کے سبب مکدر رہی ہے ان سے نہ تو یہاں کا مصور اپنے آپ کو بچا پایا ہے اور نہ ہی شاعر۔ ایک جانب مؤقلم لہو رنگ ہو چکا ہے اور دوسری جانب خامۂ شاعر لہو لہو پکار رہا ہے۔ خالد بشیر احمد نے نہایت ہی دردمندانہ اور پرسوز لہجے میں اس کرب کی عکاسی کی ہے۔ ملاحظہ ہو چند اشعار:۔

ـــ کہانی کار! میرے شہر کے حوالے سے — نظر اٹھاتے شفق منظروں سے آگے بھی
ـــ لہو لہو تھے مناظر گھروں سے آگے بھی — لُٹا چکے تھے بہت کچھ سروں سے آگے بھی

ناشر: بک مین پبلشرز، ۲۹۴، نرسنگھ گڑھ سرینگر۔ کشمیر۔ ۱۹۰۰۰۱ — سن اشاعت: ۲۰۰۸ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ے یہ لوگ اپنے بیٹوں کو قبروں میں ڈال کر ہوتے ہیں حادثات سے اب دلِ ملول کم
ے خوابوں نے تو پہلے ہی سے کھولی تھی طنابیں اس شہر میں سہمی ہوئی آتی ہے ہوا بھی
ے پھولوں نے بھی خوشبوئیں چھپالی ہیں تہوں میں اب خال ہی آتی ہے پرندوں کی صدا بھی

بہر حال خالد بشیر احمد کو پورا یقین ہے کہ پت جھڑ کا موسم تو عبوری ہوتا ہے اور وادیٔ گلپوش میں جلد ہی پھر سے بہار آنے والی ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

ے اب اس زمین پر خوشبو کا رقص ہونا ہے گلاب ہونٹوں پر یہ سسکیاں نہیں ہوں گی
ے اب اس طویل حبس کا کچھ دن کا ساتھ ہے اس شہر سے گذرنے کا وعدہ ہوا کا ہے

عشق مجازی بھی خالد بشیر احمد کی شاعری کا موضوع رہا ہے۔ ہجر کی صعوبتیں، انتظار کا موسم، معشوق کی بے نیازی، یادوں کے زخم اور مسلسل تشنگی ان کی شاعری میں جابہ جا ملتے ہیں۔ خالد کا فکر اور اسلوب منفرد ہے اور زبان بھی آسان اور رواں ہے۔ چند اشعار یہاں پر نقل کرتا ہوں:

ے رات ہوا نے مجھ سے پوچھا تیرا نام میں نے ریت کے ڈھیر پہ لکھا 'ایک سراب'
ے یہ راستے کہ نہیں یونہی اس طرح روشن کسی نے ان میں جلا رکھے ہیں لہو کے چراغ
ے ہم ترکِ تعلق سے گزر آئے ہیں لیکن آگے کا سفر برسرِ تلوار ہے گویا
ے آہٹ بھی ہے، دروازے کی زنجیر بھی ہلی اور یہ بھی جانتا ہوں کہ باہر نہیں کوئی
ے دستک نہیں کسی کی، یہ جھونکا ہوا کا ہے زنجیر در کے ساتھ پھر دھوکا ہوا کا ہے
ے بجتی رہی ہیں رات بھر کمرے کی کھڑکیاں احساس ہجر یار جگا کر گئی ہوا
ے میں اختلاف بھی کرتا تو کیا ہوا ہوتا یہ فیصلہ تو وہ محفوظ رکھ کے آیا تھا
ے مہاجر پرندے، ہوا، خوشبوئیں کبھی روکنے سے رُکا ہے کوئی
ے ذرا سی بات پر کیا دل کو آبدیدہ کریں یہ بے وفائی تو اس شہر کے چلن میں ہے
ے وہ کہ گردابِ سخن تھا کہ نظر کا جادو میں بڑی دیر کھڑا یونہی رہا بے معنی
ے میں خشکیوں پہ تھا لیکن حصارِ آب میں تھا بڑا عجیب سا نشہ تیری شراب میں تھا
ے گلوں سے رسم و رہِ گفتگو بھی اچھی ہے مگر کبھی تو یہ چبھتے ہیں خار کی حد تک
ے پیاس بھی ہے اور کچھ تسکیں بھی ہاتھ میں دنیا بھی ہے اور دین بھی
ے جنگل، بارش، بھینی خوشبو، گھاس ہری ایسا منظر اور آنکھوں کی پیاس ہری

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

خالد بشیر احمد نے موجودہ دور کی میکانکیت ، انسانی رشتوں اور عصری تقاضوں کو بھی اپنی شاعری کا حصہ بنالیا ہے اور اچھوتے انداز میں انہیں پیش کیا ہے۔

ے یہ زخم وہ ہے کہیں مُندمل نہیں ہوتا — کبھی جہاں میں خدایا کسی کی ماں نہ مرے

ے دھوپ کے شہر میں امید شجر کیا معنی — گھر سے نکلے ہیں تو پھر زادِ سفر کیا معنی

ے آٹھ برس کا گھر سے نکلا کیا سمجھے — دروازے پر بوڑھی ماں کی آس ہری

ے مفلسی کھو دیتی ہے سب آدمی کا اعتبار — لفظ کو بے صوت کردے، حرف بے معنی کرے

ے آیا ، گیا وہ مثلِ شرر تھوڑی دیر میں — لیکن جہاں میں اس کا ہنر دیر تک رہا

کہیں کہیں شاعر طنز کا بھی بڑی خوبی سے استعمال کرتے ہیں اور استحصال کرنے والے عناصر کو اپنے تیروں کا ہدف بناتے ہیں۔اس ضمن میں ان کی غزل 'ادبی منظر نامہ' فکر انگیز ہے۔چند اشعار:

ے یہ ادب کے گوشت خورے، یہ تمدن کے قصاب — ہے انہوں نے خود زباں کی لاش تک کھائی ہوئی

ے میر مجلس بھی کرایہ پر میسر ہیں کہ جو — یہ سمجھتے ہیں ادب کی ان سے سینچائی ہوئی

ے شہر میں اب نانبائی کر رہے ہیں بک ریلیز — مرحبا، اردو زباں کی عزت افزائی ہوئی

مجموعی طور پر خواب پارہ نے بہت ساری امیدیں جگائی ہیں۔صحافت شاعری کے لیے معاون بن سکتی ہے مگر شاعری میں صحافتی رنگ چڑھ جائے تو بے ثمر ہو جاتی ہے۔خوش قسمتی کی بات یہ ہے کہ خالد بشیر احمد نے شاعری اور صحافت کو آپس میں خلط ملط نہیں ہونے دیا۔ان کی شاعری حساس دل اور فکر مند دماغ کی پیداوار ہے جو بذاتِ خود ان کے درخشاں مستقبل کی ضامن ہے۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

اسفار

ـــــ اقبال خسروؔ قادری

اقبال خسروؔ قادری، ایم اے (انگریزی، اُردو) پی ایچ ڈی، پیشے سے مدرس ہیں اور نو کتابوں کے خالق بھی۔ کتابوں کی تفصیل یوں ہے۔ منہاج، مدرکہ، اعیان، سیمیا، اورنگ اور اسفار (شعری مجموعے)، شناخت، مناہل اور تنویر (تحقیق و ترتیب)۔ خسروؔ نے نہ صرف کلاسیکی شاعری کا گہرا مطالعہ کیا ہے بلکہ عربی اور فارسی لٹریچر سے بھی انہیں لگاؤ رہا ہے۔ اس کے باوجود ان کی شاعری پر جدیدیت کا اثر نمایاں ہے۔ وہ چاہے ترکیبات ہوں، لفظیات ہوں یا پھر ردیف و قافیہ کا استعمال ہو۔ ہر جگہ وہ روایت سے بغاوت کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے یہاں غمِ ذات اور غمِ کائنات دونوں برابر ملتے ہیں۔ انفرادی نوعیت کی شاعری میں بھی خسروؔ نے نئے اُفق ڈھونڈ نکالے ہیں اور اپنے خیالات کو نئے پیراہن پہنائے ہیں۔ ملاحظہ ہو اس ضمن میں چند اشعار:۔

ـ رگوں میں زہر خموشی اتر گیا کیسے؟ — پتہ ہے، ربط ہمارا کہاں سے ٹوٹا تھا؟

ـ کسی ہمدرد کو رسوا کیے — بہت دن ہوگئے ایسا کیے

ـ گھر پہ بھی کون راہ تکتا تھا؟ — راہ میں بھی قدم نہیں ٹھہرے

ـ اوس میں گم جنگلوں کی آگ میرے ساتھ ہے — میں جہاں جاؤں مرا بیراگ میرے ساتھ ہے

ناشر: طاہر پبلی کیشنز، ۱۹/۶۳۷ ہاوز سٹریٹ کڈپا، آندھرا پردیش
سن اشاعت: ۲۰۰۹ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ے روح سنسان ہوئی دہشت سے — خوف یوں زینہ بہ زینہ اترا

ے دعویٰ تھا کہ بھر آئے ہیں یادوں کے سبھی زخم — ایمان کی کہیے، تو ہرا تھا یہی ناچیز

ے کوئی نفرت بھی ہے جینے کا بہانہ خسرؔو — کسی ناخواستہ ایثار پہ موقوف نہیں

ے ہونٹوں پہ پریم کے کبوتر — آنکھوں میں گِدھ پالتا ہوں

ے جس موڑ پہ خود آپ کا قابو نہیں ممکن — اس موڑ پہ دم سادھے کھڑا تھا یہی ناچیز

خسرؔو کے یہاں اپنے درون اور گردونواح کو کھنگالنے کا عالم بھی دلِ سوز ہے۔

ے مجھ پہ روشن مرے عیوب و ہنر — شیخ روشن ضمیر ہیں، تو پھر

ے نصف عالم دل نے دیکھا ارد گرد — اک سے اک جاہل پڑا تھا ارد گرد

ے کھلونے ٹوٹے، تو یاد آیا بوڑھی آنکھوں کو — یہی وہ بات تھی! میں جس پہ جاں سے ٹوٹا تھا؟

ے رگ رگ سے تھکن نچوڑتی ہے — بستر پہ بچھی شکن شکن رات

شاعر نے اپنے ماحول، شہر کے شور وغل اور گاؤں کی زندگی کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے ملاحظہ ہوں چند اشعار:۔

ے صبا بدوش، مگن، مسکراتی، تیز قدم — گھروں کو لوٹتے ریوڑ کی گھنٹیوں میں شام

ے سفر تمام ہوا پھر سے اک کٹرے دن کا — سوار ہوتی ہوئی مختلف بسوں میں شام

ے کہیں سبو، کہیں چائے کی پیالیوں میں شام — کہیں دبی ہوئی بوسیدہ فائیلوں میں شام

ے گھر کے اندر چیختی سوچوں کا غول — گھر سے باہر شور وغوغا ارد گرد

ے عرق ہونے پر تلی پاکیزہ روح — جسم کا پر شور دریا ارد گرد

مندرجہ ذیل شعر میں خسرؔو اپنی قوم سے یوں خطاب کرتے ہیں:

ے اور ہیں فخر وتشفی کے وسائل موجود
صرف اجداد کی تلوار پہ موقوف نہیں

زیر نظر مجموعے میں غزلوں کے علاوہ رباعیات بھی شامل کی گئی ہیں جن میں سے دو رباعیات یہاں پر نقل کر رہا ہوں۔

ے لاگو اپنے اصول کرتی ہے روح — تب جا کے بدن قبول کرتی ہے روح
تن پھرتا رہتا ہے سانسوں کا قرض — ایک ایک نفس وصول کرتی ہے روح

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ے مل جائے کسی روز مجھے اپنا سراغ تب تیری طرف آؤں؟ کہ دے اپنا سراغ!
لیکن تیرے ہوتے مجھے گم ہونے کی فکر نابود ہی ہوجائے بھلے اپنا سراغ

کتاب کا ٹائٹل 'اسفار' بذات خود ایک استعارہ بن کر ابھرتا ہے۔ خسرؔو نے استعاروں اور کنایوں کا خوب استعمال کیا ہے اور کہیں کہیں فلسفیانہ انداز میں بھی زندگی کو دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ مجموعی طور پر خسرؔو کا کلام قاری کی سوچ وفکر کو انگیز کرتا ہے۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

سوانیزے پہ سورج

ـــــ شیخ خالد کرار

'سوانیزے پہ سورج' شیخ خالد کرار کا پہلا شعری مجموعہ ہے جس میں غزلیں اور نظمیں شامل ہیں۔ کرار دورِ جدید کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں، اس لیے ان کی شاعری میں نہ تو روایتی اسلوب ملتا ہے اور نہ ہی کلاسیکی انداز۔ اس کے برعکس وہ استعاروں، تشبیہوں اور تلمیحات سے خوب کام لیتے ہیں۔ پیشہ ورانہ اور مقصدی شاعری سے وہ گریز کرتے ہیں۔ چنانچہ 'حرف سادہ' میں خود ہی رقم طراز ہیں۔ ''یہ شاعری میرے تجربات ومشاہدات کی دنیا میں ہونے والی اتھل پتھل، میری داخلی شکست وریخت اور خارجی سطح پر ہونے والے کئی طرح کے بدلاؤ کی مظہر ہے۔''

شیخ خالد کرار کی شاعری عصری حسیت کی عکاس ہے۔ وہ جہد زیست، بے ثباتی، خالی پن، ہجرت اور ٹوٹ پھوٹ کی باتیں کرتے ہیں اس کے علاوہ ذاتی کرب کو اجتماعی کرب کا آئینہ بھی بناتے ہیں۔

جہد زیست:

ـ یہ رات جیت کے ہر روز ہار جاتی ہے — میں روز یونہی شفق آئینے میں جلتا ہوں

ـ تمام روز یونہی ہمکلام رہتے ہیں — یہ میری بھوک، وہ میرا خدا، بدن میرا

ناشر: الحمرا پبلی کیشنز، جموں توی سن اشاعت: ۲۰۰۷ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ے دریائے ہست وبود کے اس پار لے گیا — میرا نصیب مجھ کو سرِ دار لے گیا

خالی پن:

ے خلد سے میرا رشتہ ہے پرانا — میرے باہر، میرے اندر خلا ہے
ے اگرچہ پیش منظر خوب تر ہے — مگر منظر کا پس منظر خلا ہے
ے سینے میں اک خلا کا مسلسل سکوت ہے — ظاہر میں ایک دشت مرے آر پار ریت

شناخت:

ے وہ رنگ وچہرہ ونام ونسب کی بستی میں — عجیب فتنۂ پہچان سے گزارے گا

سفر/ہجرت:

ے ہر ایک سمت میری بھی غبار آلودہ — کہ منزلوں سے جدا ہوں، سفر سے آگے ہوں
ے ہجرتیں تو مرا مقدر تھیں — کیوں ہوئی ساتھ دربدر مٹی
ے مستقل سفر میرا، مستقل مری ہجرت — میں زمیں نہیں رکھتا، انتقال رکھتا ہوں

ٹوٹ پھوٹ:

ے ہرایک سمت وہی کرچیاں وہی چہرے — ہرایک چہرہ شکستہ دکھائی دیتا ہے

تواریخ، سوسائٹی، انسانی فطرت، تجسس اور علم کو موضوع بنا کر کرآر نے کئی خوبصورت شعر کہے ہیں۔ ان کی یہی جستجو انہیں وجود کے اسرار سمجھنے اور خدا کی تلاش کرنے کے لیے اکساتی ہے۔ 'اے خدا' اور 'تلاش' نظمیں اسی موضوع پر رقم کی گئی ہیں۔

تواریخ:

ے پھر ایک بوند نے مانگا حساب صدیوں کا — پھر ایک دن، کہ ہوا میرے روبرو پانی
ے وقت قابیل کا کردار دکھاتا ہے مجھے — لو میرا بھائی بھی تلوار دکھاتا ہے مجھے
ے کون مقتول، یا قاتل، کہ سبھی کتبوں سے — رات ہی رات یہ عنوان بدل جاتے ہیں

جبر وتشدد:

ے وہ جس قدر بھی قفس تنگ کر کے رکھے گا — مرا وجود نئے بال و پر نکالے گا
ے پھر ایک پل میں کوئی شور سا اٹھا جیسے — پھر ایک پل، میری بستی میں کوبہ کو پانی

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

سچائی:

ایک بے نام ونسب سچ، مرے اظہار میں ہے — ورنہ الفاظ میں وہ سیل معانی بھی نہیں
سارے کردار ہیں انگشت بدنداں لیکن — اب تو کہنے کو مرے پاس کہانی بھی نہیں
مکاں اور لامکاں کی قید ٹوٹی — جہاں پہنچا نہ دل، ایمان پہنچا

تجسس:

میرے وجود میں بادل کی چاہ زندہ ہے — جوان رکھتی ہے ہرآن پیاس صحرا میں
وہ چاہتا تھا کہ دریا کا رُخ بدل جائے — مجھے یہ شوق، کہ دریا کو پار کرنا ہے

علم:

نواز دے گا وہ بحر خود آگہی سے مجھے — پھر ایک عالم انجان سے گزارے گا

فلاح عام:

میں خانقاہ میں جلتا ہوا چراغ نہیں — اندھیرے موڑ پہ ہوں، راستے میں جلتا ہوں

اسرار وجود:

خود اپنی ذات کی تفسیر میں رہا مشغول — میں اپنے گھر میں رہا اور گھر نہیں دیکھا
جسم خاکی میاں، یہ سر مٹی — دور تک منزلیں، سفر مٹی
لہو، صلیب پہ رکھا رہا بدن میرا — نفس، فصیل پہ دست دُعا بدن میرا

کرار نے ہیئت کے بھی کئی تجربے کیے ہیں خاص کر حرف حرف معنی کے توسل سے انہوں نے اپنی شاعری میں نیا آہنگ پیدا کیا ہے۔ وہ چھوٹی بحروں کو پسند کرتے ہیں تا کہ شاعری میں غنایت اور ترنم قائم رہے۔ اُن کی لفظیات بھی روایتی شاعری سے مختلف ہے۔

مرا سخن، میرے معنی کی قید سے بالا — کھلیں گے حرف مرے تازہ لفظیات کے بعد
مکان، قبریں، مینارے، یادگاریں — در و دیوار، چھت، جزدان، پتھر
میزائل ، جنگ، سرحد، خوف، توپیں — لہو، لاشیں، زمیں، شمشان، پتھر
سفینے بارشیں، طوفان، موسم — جزیرے، کشتیاں، سیلاب، صحرا
زاہد و واعظ و گرجا و صلیب — بُت، کلیسا و خدا، سناٹا

شیخ خالد کرار کی نظموں میں بھی فکر کی بالیدگی اور مشاہدے کی عمق نظر آتی ہے۔ دوسرا رُخ، ایک

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

متحرک تجریدی پینٹنگ، سیدھی بات، انتہا اور ایمان بہت ہی اثر انگیز نظمیں ہیں۔ امریکہ کے حوالے سے لکھی گئی 'سفید گنبد کی عفریت' بھی عصری سچائی کی غماز ہے۔ نظم 'ایمان' ملاحظہ ہو:

مسجدیں، مسجدیں، ہی ہر جانب/ مسجدیں، ہر گلی محلے میں/ چوک ونکڑ میں گنبد و محراب/
مسجدیں اور مسجدوں میں بھیڑ/ خوب قد کاٹھ کے نمازی بھی/ لمبے جبّے، اونچی دستاریں/
خوبرو چہرے، تابناک آنکھیں/ مسجدیں، ہر گلی محلے میں/ چوک ونکڑ میں گنبد و محراب/
اور خوف خدا کہیں بھی نہیں۔

مجموعی طور پر مجھے یہ تحریر کرنے میں کوئی تحمل نہیں کہ شیخ خالد کرارؔ اگر سوچ سمندر کو کھنگالتا رہے گا اور ادبی کینواس پر نت نئے رنگ پھیلاتا رہے گا تو انہیں اپنی منزل پانے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔

❖ ❖ ❖

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

1 شعری مجموعہ

تیلگو نظموں کا ترجمہ

جیب میں سورج

سسی سری

تیلگو کے شاعر، افسانہ نگار، صحافی اور مقرر ایس بی رحمت اللہ سسی سری کی کتاب 'جیبو لوسوریوڈو' (Jebo lo suryudu) کا منظوم اردو ترجمہ ڈاکٹر ساغر جیدی اور اقبال خسرو قادری کی محنت کا ثمر ہے۔ سسی سری 'سدھوٹ' کے تاریخی مقام پر پیدا ہوئے لیکن بعد میں شہر کڈپا کو مسکن و مستقر بنالیا۔ انہوں نے اب تک ایک سو کہانیاں، دو سو تنقیدی مضامین، ساٹھ ترانے، پچاس انٹرویوز اور بے شمار شعری تخلیقات قلمبند کی ہیں۔ ان کے چار شعری مجموعے پلوی (۱۹۷۸ء)، شبدانی کا سواگتم (۱۹۸۷ء)، سیما گتم (۱۹۹۳ء) اور جیبو لوسوریوڈو (۲۰۰۶ء) منظر عام پر آچکے ہیں۔

آندھرا پردیش کا انٹلکچول طبقہ سالہا سال سے مارکسی نقطۂ نظر سے متاثر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سسی سری کی نظموں میں غربت، افلاس اور مفلوک الحالی کا بیان ملتا ہے، قحط اور بھوک مری کے مناظر نظر آتے ہیں اور استحصال و استیصال کے جاں لیوا فسانے گونجتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ شاعری کے حسن بیان اور جمالیات کو ٹھیس نہیں پہنچاتے۔ بقول اقبال خسرو قادری ''سسی سری کے لیے شاعری فن کے اظہار کا نہیں بلکہ اندرون کے اظہار کا ذریعہ ہے۔'' سسی سری نے اظہار کے لیے جدید شعری اصناف جیسے آزاد نظم

ترجمہ نگار: ساغر جیّدی اور اقبال خسرؔو قادری

ناشر: نیتھرم پبلی کیشنز، ۱۔۲۲۸ (۲ اے) دوار کانگر، کڈپا۔ آندھرا پردیش ۵۱۶۰۰۴ سن اشاعت: نومبر ۲۰۰۶ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

اور نثری نظم کا سہارا لیا ہے۔ ان کے یہاں نادر علامتیں اور استعار ملتے ہیں جو ادبی سرمایے میں اضافہ کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ اُردو زبان سے رغبت کا اندازہ ان کے اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے۔ ''اُردو شاعری سنتے ہوئے مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اردو زبان کرۂ زمین پر غالباً شاعری ہی کے لیے پیدا ہوئی ہے۔''

کسی سری قحط کو پرامسری بانڈ' سے مشابہت کرتے ہیں کہ یہ دہقان کو فردا کا غلام بناتا ہے (آزادیاں)۔ انہیں کروڑوں انسانوں کی تھرتھراتی زندگیاں دیوالی کے چراغوں کی مانند لگ رہی ہیں کہ بھوک سے تڑپ رہی ایک مفلس عورت انہیں لرزتے چراغوں کی طرح کسی غیر مرد کے کمرے میں ہانپتے کانپتے گھس جاتی ہے۔ محض اپنے جسم کو زندہ رکھنے کے لیے کیونکہ روح تو کب کی مر چکی ہے۔

بھوکے گھر کے لیے/ پہلی بار غیر مرد کے کمرے میں داخل ہونے والی/ لڑکی کے
تھراتے پیروں کی طرح/ سلگ رہے ہیں کئی دیوالی کے دیپ۔ (لرزیدہ چراغ)

ان کے خیال میں جس شاعر کا قلم ضمیر کی آواز نہیں سنتا وہ مردہ ہے (روشن شاعر)۔ ایک اور نظم 'جھوٹ میری فطرت نہیں' میں بھی وہ ظاہر و باطن کی سچائی پر زور دیتے ہیں۔ نظم 'پھر اہوشیار' میں جمہوری نظام میں ایک جانب قحط ہے، بھوک مری ہے اور دوسری جانب ووٹوں کے لیے نوٹوں کی بارش ہو رہی ہے جبکہ 'حفاظت' میں دیش کی ندیوں میں بہہ رہے خون سے وہ پریشاں ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کی ہمت کم نہیں ہوتی انہیں یقین ہے کہ مستقبل میں یہی خون چمن میں بہار لانے کا موجب بن جائے گا۔ (نظم اور بھی)۔ جمہوریت کے تاریک چہرے کو ایک اور نظم 'رپورٹر' میں یوں پیش کیا گیا ہے۔

۔ کل رات/ مینجمنٹ، کے ہاں/ مزدوروں کی طرفداری میں گیا ہوا رہنما/ چورستے پر، دستی
بم کا شکار ہو گیا/ بہ بانگ دہل کہہ نہیں پایا کہ کس 'مین ریسیور سے' یہ ہدایت ملی/ رپورٹر
کا فون بج اٹھا/ اُس حادثے کو دوسرا روپ دو!/ حسب ہدایت ہی مرقوم ہوا لفظ لفظ/ کالا
کبوتر وہی خبر چاروں طرف لے اُڑا/ دل کے زخم پر پھر ایک چوٹ/ دل اور بھی مرجھا
گیا۔

(رپورٹر)

تقسیم ملک کے بعد جو مسلمان ہندوستان میں ڈٹے رہے ان کی قومیت پر چند عناصر مسلسل سوال

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

اٹھاتے رہے ہیں۔ان کے جواب میں شاعر کہتے ہیں:۔

ہم پھول ہیں/ پھولوں جیسا رہنے دو..... پھول بن کر جینے دو/ جھوٹ پر جھوٹ کہتے ہو/ چوری سینہ روزی؟/ ہمیں بے خوشبو پھول کہتے ہوئے/ زمین پر مت الزام لگاؤ/ مٹی میں کوئی خرابی نہیں/ خرابی ہے تو بس پھولوں میں/ جو کیڑے مکوڑوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہیں/ (خرابی مٹی میں نہیں)

یہی میرا وطن ہے!/ یہیں مجھے دفن ہونا ہے!/ یہی میرا قبرستان ہے!/ کتنی بار تجھ سے کہوں/ الٹ کر دیکھ/ مسلمان کو/ تیری لگائی ہوئی بدنامی کے دھبے/ تجھ سے چسپاں کی ہوئی غلط تاریخ/ آج پھر تیرے چہرے پر تھوکتے ہوئے کہتا ہوں/ یہی میرا حقیقی سفید وجود اعظم ہے۔ (حقیقی سفید وجود)

کشمیر میں ہو رہی دہشت گردی کا نقشہ شاعر نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ 'قطر آبی' میں کھینچا ہے۔

شام میں پہلے، بہت پہلے/ کسی بے رحم گولی کا نشانہ بننے والے/ اک سپاہی کی کھلی بے نور آنکھوں میں/ کوئی تصویر اب بھی مسکراتی ہے۔ (قطر آبی)

سسی سری جہاں ایک جانب ماں اور کاشتکار کی عورت پر نوحہ کناں ہیں وہیں ایک معصوم مزدور کی بیٹی کے جسم کو تھوک دان بنتے دیکھ کر تڑپتے ہیں، بلبلاتے ہیں، عورت کی حالتِ بیزار پر انہوں نے کئی خوبصورت نظمیں رقم کی ہیں جیسے 'صرف عورت؟' جس کا اقتباس حاضر خدمت ہے:

صرف عورت بچی ہے/ صفحۂ دہر سے ماں کہاں کھو گئی؟...../ ممتا، شیر مادر، سبھی/ کرایہ کی آیا کے ہاتھوں میں/ دودھ کے ایک ڈبہ کی صورت بن کے/ اب رہ گئے ہیں/ سب تقاضے، مسائل، وہی دیکھتی ہے/ آہ! کیا اب یہی سب کچھ نہیں ہے۔ (صرف عورت؟)

نظم 'انکر' کو سسی سری نے ایک نئے استعارے کے روپ میں پیش کیا ہے جو اپنی نشو ونما پا کر اپنے محسن کو بھول جاتا ہے۔ واضح رہے کہ آج کل کے بچے بھی ولایت جا کر خود عیش و آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں مگر اپنے والدین کو بے سہارا چھوڑ جاتے ہیں۔ سسی سری نے زندگی کے فلسفے کی بنیادیں تجربے اور مشاہدے دونوں

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

پر کھڑی کی ہیں۔ شجر کی شناسائی کا ایک اقتباس زندگی کی حقیقت کو یوں بیان کرتا ہے۔

سر ہلاتا ہوا، جھومتا ہوا/ سنجیدگی سے/ زندگی بسر کرتا ہے شجر/ درد و غم برداشت ہی نہیں کرتا/ انہیں محسوس بھی کرتا ہے/ شجر اچھی طرح جانتا ہے کہ/ ''پھل سے لدے پیڑ پر ہی پتھر چلتے ہیں۔''

(شجر کی شناسائی)

اسی طرح 'وقت ایک پیمانہ'، 'چہار دیواری اور چھت' وغیرہ میں بھی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو فلسفی کی نظر سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سسی سری کے ہاں صرف بے بسی اور لاچاری ہی نہیں بلکہ انہیں یقین ہے کہ اجتماعی مساعی سے یہ حالت بدل بھی سکتی ہے۔ ان کی رجائیت نظم 'سواگت کرو' میں صاف جھلکتی ہے۔

محبت ہمیشہ نہیں ہارتی / جیت بھی سکتی ہے اور یہ جیت/ آئندہ صدیوں تک ایک تابندہ اور/ زندہ احساس بن کر باقی رہے گی/

(سواگت کرو)

مجھے یہ تحریر کرنے میں کوئی باک نہیں کہ ساغر جیدی اور اقبال خسرو قادری نے شاعر کی روح تک رسائی حاصل کر کے ان کی نظموں کا ترجمہ کیا ہے جس کے لیے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

❖ ❖ ❖

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

اکتساب

ـــــ احمد امامؔ بالاپوری

احمد امام نے بچوں کی نظموں کا مجموعہ 'شاخِ گل' سن ۲۰۰۷ء میں شائع کیا تھا اور اب دو سال کے بعد ہی ان کا شعری مجموعہ 'اکتساب' بھی منصۂ شہود پر آ چکا ہے۔

سید احمد علی ابن سید امام (قلمی نام احمد امامؔ) ۳۰ر جون ۱۹۵۸ء کو بالا پور، اکولہ، مہاراشٹر میں ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جنہیں ادب کے ساتھ دور کا واسطہ بھی نہ تھا۔ ۱۹۸۱ء سے وہ درس و تدریس کے ساتھ جڑے رہے جس کا ثمر 'شاخ گل' کی صورت میں نمودار ہوا۔ 'شاخ گل' ادبِ اطفال میں ایک بیش بہا اضافہ ہے جس میں احمد امامؔ نے نہ صرف بچوں کی نفسیات کا خاص خیال رکھا ہے بلکہ اپنی نظموں کے ذریعے بچوں کو زندگی کے اونچ نیچ، مناظر قدرت تحصیل علم کی خوبیوں، موڈرن سائنسی ایجادات، حب الوطنی، تفریقِ نیکی و بدی اور صحیح قدروں کی پہچان کا درس بھی دیا ہے۔ کہیں کہیں پر انہوں نے پہیلیوں کے ذریعے بچوں کے ذہنوں کو تحریک دینے کی کوشش بھی کی ہے۔ ان نظموں میں امامؔ نے لفظیات، سلاست اور روانی کا خاص خیال رکھا ہے تاکہ بچے انہماک سے نظمیں پڑھیں اور انبساط حاصل کریں۔ کلام کے چند نمونے:

بات بزرگوں کی مت ٹالو کوئی گرتا ہے تو سنبھالو

(میٹھی باتیں)

ناشر: مصنف، چوڑی محل، بالاپور، اکولہ، مہاراشٹر۔ 444302 سن اشاعت: ۲۰۰۹ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ے پیار کرو بھائی بہنوں سے نفرت دور کرو ذہنوں سے

(پیار بچو)

ے کتابوں سے جو فیض کرتے ہیں حاصل وہ حق کہتے ہیں حق کو ، باطل کو باطل

(علم کا خزانہ)

ے ڈھال بھی ہے اور قلم تلوار بھی ناو بھی ہے اور قلم پتوار بھی

(قلم)

ے درختوں کو جو ناحق کاٹتے ہیں وہ ناداں ہیں تباہی بانٹتے ہیں

(درخت)

اپنی شاعری کے بارے میں احمد امام یوں رقمطراز ہیں۔ ''اصناف سخن میں غزل میری پسندیدہ صنف رہی ہے۔لہٰذا میری شاعری کی ابتدا بھی غزل سے ہوئی لیکن ابتدائی دور میں ہی ادبِ اطفال کی تخلیق کا بھی شوق پیدا ہوا اور اسی زمانے میں جوش ہما بالاپوری کے نام سے ہزلیات پر بھی طبع آزمائی کرنے لگا۔''

'اکتساب' میں مشمول غزلوں سے صاف ظاہر ہے کہ احمد امام نے نہ صرف قلبی واردات کو موضوع بنایا ہے بلکہ معاشرے میں ہو رہی اتھل پتھل کو بھی قلم کے سپرد کر دیا ہے۔ان کا حساس دل اور فکر مند دماغ انہیں قومی، ملی اور انسانی مسائل پر خامہ فرسائی کرنے کے لئے مجبور کرتے ہیں۔کہیں کہیں پر ان کی تدریسی میلانِ طبع بھی شعروں میں جھلکتی ہے۔بقول ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، ''احمد امام نے سچی شاعری کی ہے۔اسی لیے ان کے یہاں احساسات کی تیز دھمک ملتی ہے اور آراستگی خیال اور عصری حسیت کی فنکارانہ عکاسی بھرپور طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔''

زیر نظر شعری مجموعے میں غزلوں کے علاوہ قطعات، نظمیں، گیت اور متفرق اشعار بھی شامل ہیں۔ نظموں میں 'فیصلہ' اور 'ادھورا نقشہ' اور گیتوں میں 'اک پل اک صدی لگتا ہے' قاری کے دل و دماغ پر دیرپا نقش چھوڑ جاتے ہیں۔

نظم:

قبول کرنے سے پہلے مجھ کو/ مری نئی منزلوں کے ساتھی/ ہر ایک پہلو سے مجھ کو دیکھو/ تمہیں یہ حق ہے/ تم/ اپنے فیصلے سے پہلے/ جدھر سے چاہو/ جہاں سے چاہو/ ورق ورق/ لفظ لفظ کو پڑھ لو/ کھلی ہوئی اک کتاب ہوں میں۔

(فیصلہ)

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

گیت:

ے آنگن سونا سونا لگتا ہے، گھر سونا سونا ہے — ایک تمہارے نہ ہونے سے منظر سونا سونا ہے
ے اک پل ایک صدی لگتا ہے — سارا جگ بیری لگتا ہے

قطعات:

ے پل دو پل میں دھوپ پڑے گی بادل کتنی دیر کا ہے — آنکھوں میں یہ غم کا منظر پاگل کتنی دیر کا ہے
عزم ہمارے زندہ ہیں تو رستہ بھی مل جائے گا — یہ سنگین مسائل والا جنگل کتنی دیر کا ہے

ے وعدوں سے جھوٹی باتوں سے تحریروں سے کیا ہوتا ہے — کام تو کرنے سے ہوتے ہیں تقریروں سے کیا ہوتا ہے
دشمن پر غلبے کی خاطر ہمت ہوتی ہے درکار — ہمت سے سب کچھ ہوتا ہے شمشیروں سے کیا ہوتا ہے

احمد امام کی غزلوں میں جہاں ذات کی خوشی وغم، ہجر ووصل، محرومیت، خودداری اور قناعت کی تصویریں ملتی ہیں وہیں وہ شہری اور دیہی زندگی کا موازنہ بھی بڑی خوبی سے کرتے ہیں۔ نفرت، محبت، خطا، نمائش، بے راہ روی اور سماجی ناانصافی پر بھی انہوں نے بڑے اچھے اشعار کہے ہیں۔ ان کی شاعری روایتی ہے مگر موضوعات عصری ہیں۔ وہ نہ تو نا قابل فہم استعارات کا استعمال کرتے ہیں اور نہ ہی غیر ضروری علامتوں کا۔ ان کی شاعری عام فہم اور سیدھے دل میں اترتی ہے۔ نمونۂ کلام:۔

محرومیت:

ے اب سوچتا ہوں لے کے تیرا پیار کیا کروں — جلنے کے بعد سایۂ دیوار کیا روں

محبت:

ے مرے حصے کی ساری دھوپ خود ہی جھیل لیتے ہیں — مرے بچے مجھے سوکھا شجر کرنا نہیں چاہتے
ے اُسے دیکھ کر ہی میرے شب وروز کٹ رہے ہیں — تری فرقتوں میں البم مرے کام آرہا ہے

نفرت:

ے ابھی سے آگئے پتھر تمہارے ہاتھوں میں — ابھی تو بات ہماری میاں ادھوری ہے

خطا:

ے خطا کس سے نہیں ہوتی، خطا ہر اک سے ہوتی ہے — کوئی پردے سے باہر اور کوئی پردے میں رہتا ہے

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

قناعت:

ے امیری شوق فرماتی ہے اور اونچے گھر بنانے کا
غریبی چار بانسوں پر ہی چھپر باندھ دیتی ہے

خود داری:

ے لب دریا کھڑا ہوں تشنگی حصے میں آئی ہے
بڑی خودداریوں کی زندگی حصے میں آئی ہے

ے موسم نوازشوں کا ہے، مسند بھی ہے قریب
لیکن مرا مزاج ہے خوددار کیا کروں

شرافت:

ے شرافت سے گزر اوقات اچھی بات ہے لیکن
شرافت ہو زیادہ بھی تو بستر باندھ دیتی ہے

بے سائیگی:

ے سڑک کے پیڑ بھی تو آج کل سایہ نہیں دیتے
بڑی ناساز حالت ہے مسافر اب کہاں ٹھہرے

موازنہ شہر و گاؤں:

ے گھٹن سی ہو رہی ہے شہر میں آئے ہیں جس دن سے
تھے جب تک گاؤں میں تازہ ہوا مل جایا کرتی تھی

ے شہروں سے اٹھ رہے ہیں جنازے خلوص کے
لیکن خلوص آج بھی زندہ ہے گاؤں میں

نمائش:

ے یہ شور و غل، یہ مستی، یہ چراغاں، یہ ریاکاری
یہ کیا ہے اک نمائش ہے، اسے شادی نہیں کہتے

رہبری/راہزنی:

ے ہمارا کارواں بے سمت چلتا ہے کہ اس میں بھی
ہمارے رہبروں کی رہبری کا ہاتھ شامل ہے

ے جنہیں عادت پڑی ہے خوف کے سائے میں جینے کی
وہ میدانوں میں غنڈوں کو علم بردار کرتے ہیں

خوف:

ے قہقہوں پہ خوف طاری ہے ہنسی سہمی ہوئی
بے تکلف دوستوں کی انجمن ہوتے ہوئے

ناانصافی:

ے عدالت اس کے حق میں فیصلہ اپنا سناتی ہے
اگر منصف کو مجرم مال و زر میں تول سکتا ہے

بیوروکریسی:

ے وگر نہ بیچ کھاتے یہ اپنی مادر گیتی
مگر ہندوستانی افسروں کا بس نہیں چلتا

آخر میں علیم صبا نویدی کا تحریر کیا ہوا یہ اقتباس پیش کرتا ہوں جو احمد امام کی شاعری کا مجموعی طور پر

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

احاطہ کرتا ہے۔

''ان کی شاعری میں روحانی اور مادی وسائل کی بھی جہاں خوشحال اور محرومی کی جھلکیاں موجود ہیں وہیں سرشاری کیفیت اور اشکباری کی منظر کشی بھی خوب ہوئی ہے۔ بعض مقامات میں ان کے ہاں اپنے ہم عصر شعراء کی تخلیقی تحریکی بازگشت بھی سنائی دیتی ہے جو ان کے غائر مطالعہ کی واضح شناخت ہے۔''

❖ ❖ ❖

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

دل سے اُٹھا دھواں

ـــــ ہری کرشن رازدان راز

ہری کرشن رازدان رازؔ کا پہلا شعری مجموعہ 'ہر لمحہ اور' بقول نقش لائل پوری زیر نظر مجموعے کی اشاعت سے تین سال قبل منظر عام پر آچکا ہے۔ اس طرح یہ مجموعہ اس کا دوسرا شعری مجموعہ ٹھہرا مگر 'دل سے اٹھا دھواں' اور 'ہر لمحہ اور' کا سن اشاعت اول بالترتیب مارچ ۲۰۰۹ء اور اکتوبر ۲۰۰۹ء دکھایا گیا ہے جس کے مطابق زیر نظر مجموعہ شاعر کا پہلا مجموعہ ہے۔ البتہ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ 'ہر لمحہ اور' کی غزلوں میں 'دل سے اٹھا دھواں' کے مقابلے میں فکر کی بالیدگی اور خیال کی پختگی نظر آتی ہے۔

رازدان رازؔ کشمیری نژاد ہیں اور بقول ممتاز راشد ''بے حد نفیس، ملنسار اور وضعدار شخصیت کے حامل رازدان صاحب ایک انتہائی کامیاب بزنس مین بھی ہیں اور اس کے ساتھ ہی خدا نے انہیں تخلیق شعر کی دولت سے بھی جی بھر کے نوازا ہے۔'' رازؔ غزلوں کے شاعر ہیں اور ان کے کلام میں بلا کی روانی، سلاست اور نغمگی پائی جاتی ہے۔ زیر نظر مجموعے میں چند قطعات اور متفرق اشعار بھی درج ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ 'ازموں' کے موجودہ دور میں بھی وہ اپنی روایت سے جڑے ہوئے ہیں اور اپنی رومانی دھن میں مست ہیں۔ ان کی شاعری میں کلاسیکی دور کی بازگشت ملتی ہے۔ عشق و رومان، مے نوشی و ساقی، گل و بلبل، ہجر و وصال، درد و نشاط اور زندگی اور موت کا ذکر ان کی غزلوں میں ہر جگہ ملتا ہے البتہ شاعر نے

ناشر: تکمیل پبلی کیشنز، ممبئی / بھیونڈی

عصری تقاضے — سن اشاعت: مارچ ۲۰۰۹ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

اپنے عمیق مشاہدے سے ان تصورات میں نئے رنگ بھر دیے ہیں۔ موصوف کے اشعار میں بگڑتے رشتوں اور تنہائی کا ذکر بھی کہیں کہیں ملتا ہے۔ ملاحظہ ہو نمونۂ کلام:۔

عشق:

ے عشق ایک احساس ہے، رشتہ نہیں — جتنا باندھو گے بکھرتا جائے گا
ے محبت زندگی کی ابتدا ہے — محبت رنج و غم کی انتہا ہے
ے دل آیا اور جسم ملے، پھر رشتے بنے ضرورت کے — جسموں کے تو رشتے ہیں، روح کا رشتہ کوئی نہیں

یاد:

ے خالی خالی سا جہاں لگتا ہے — جب تصور تیرا نہیں ہوتا
ے جب کسی بھیڑ میں کھو جائے تصور تیرا — شب ہجراں کو ستاروں سے سجا دیتے ہیں
ے یاد تو تم یوں بھی آتے تھے آج مگر کیا جانے کیوں — دل بھر آیا، آنکھ بھر آئی، یاد مجھے جب آئے تم

بے وفائی:

ے راز وہی دے کر جاتے ہیں چوٹیں ہم کو — ہم جن کے غم اپنے اشکوں سے دھوتے ہیں
ے ہوئے ہیں آج جو ہم بے صدا سے — محبت تھی ہمیں اک بے وفا سے
ے ذہن کے داغ تو دھل جائیں گے مئے سے لیکن — روح پر داغ لگے ہیں جو، مٹائیں کیسے

اندھیرے:

ے زندگی بھر ہم اندھیروں میں جیے — روشنی میں اب بکھر جائیں گے ہم

ہجر:

ے تھے تم تو غم تھے، امیدیں تھیں آنسو تھے دعائیں تھیں — تمہارے بعد تو یہ زندگی کچھ خشک سی گزری

تنہائی:

ے ہم سفر کتنے تھے، منزل پر لگا ہم کو پتہ — ساتھ اپنے تو وہاں اپنے سوا کوئی نہ تھا

بے اعتنائی:

ے اب جو بچھڑیں بھی محبت والے — کوئی دامن کو بھگوتا ہے کہاں

غیرت:

ے اشک آنکھوں تک تو آیا تھا اسے کیا ہو گیا — آتش غیرت کہ خود داری میں جل کر کھو گیا

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

خود احتسابی:

ے سب کو جانچا، سب کو پرکھا، خود کو پرکھنا بھول گیا
ساری دنیا سمجھ لی میں نے، خود کو سمجھنا بھول گیا

بے سمتی:

ے اٹھ کے چل دیتا ہوں، جانے میں کدھر کیا معلوم
جا کے پھر دور کہیں، خود کو صدا دیتا ہوں

بے ثباتی:

ے تم سے مل کر میں نے سوچا، زندگی مل جائے گی
زندگی سے کیا ملے گا، یہ مگر سوچا نہیں

منزل:

ے چلو اس راہ پر جس میں کوئی منزل نہیں ہوتی
مزہ تو تب ہے منزل ڈھونڈتی آئے مسافر کو

دولت:

ے مکاں ملتا ہے، دولت سے، گھر نہیں ملتا
خریدنے سے سخن کا ہنر نہیں ملتا

سکوں:

ے یہاں روحیں ہیں پیاسی اور دریا ہیں سرابوں کے
سکوں تو رازؔ اب انسان کے اندر نہ باہر ہے

رازدان رازؔ نے زندگی اور موت کے بارے میں کئی اچھوتے اشعار کہے ہیں۔ زندگی کی بے ثباتی کو دیکھ کر وہ خدا کی حقیقت کے طلبگار بھی ہیں۔

ے بہت سوچا، پر نہیں سمجھا کہ کیا ہے زندگی
درد ہے، غم ہے خوشی ہے یا سزا ہے

ے موت کا درد ایک لمحہ ہے
زندگی درد عمر بھر کا ہے

ے جگمگاتی محفلیں، رنگینیاں، رعنائیاں
موت ہے جس کی سحر، وہ شام ہے یہ زندگی

ے غموں کی بھیڑ سے ہنس ہنس کے گزر جاتا ہوں
پر کہیں زندگی مل جائے تو مر جاتا ہوں

ے خدا کا کیا، خدا کے واسطے دریا بھی قطرہ ہے
مگر انسان کی آنکھوں کا ہر قطرہ سمندر ہے

ے سب کچھ کروا کر کہتا ہے، کرم کا پھل مت سوچا کر
کام ہی پھر کیوں کرواتا ہے، جو دینا تھا دے دیتا

ے آسماں بھی، میں زمیں بھی ہوں، میں پاتال بھی ہوں
رب بھی میں نے ہی تراشا ہے، میری ذات ہے یہ

یہ بات تو سچ ہے کہ رازؔ نے اپنی ذات کو ہی شاعری کا محور بنایا ہے۔ پھر بھی چند ایک شعر ہمارے موجودہ معاشرے سے متعلق ہیں۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

جھیز:

ے آگ دیکھی تو کیوں لگا ایسا　　کوئی دلہن کہیں سجی ہوگی

مشینی زندگی:

ے اب لوگوں کو پہچاننے نکلی ہیں مشینیں　　انسان سے انسان کی پہچان نہیں ہے

علاوہ ازیں چند قطعات بھی پیش خدمت ہیں:

ے میں زندگی کو تیرے بعد سوچتا کیسے　　کسی خوشی کو تیرے بعد سوچتا کیسے
تو عبادت میں مری اس طرح سے شامل تھا　　میں بندگی کو تیرے بعد سوچتا کیسے

ے کون ہے اپنا ، پرایا کون ہے　　بھیڑ میں ہے کس کا سایہ کون ہے
ساتھ اپنے کیسے جائے کوئی راز　　یہ تو سوچو، ساتھ آیا کون ہے

دیکھا جائے 'دل سے اٹھا دھواں' شاعر کے دل کی آواز ہی تو ہے جس میں ان کے بچپن کی غیر یقینیت، عشق کی ناکامیاں، اپنوں سے بچھڑنے کا غم اور سب کچھ ہو کر بھی نہ ہونے کا احساس مضمر ہے۔ مجموعی طور پر یہ شعری مجموعہ قاری کے دل پر گہرا تاثر چھوڑ جاتا ہے۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ہر لمحہ اور

ـــــ ہری کرشن رازدان راز

ہری کرشن رازدان رازؔ کا دوسرا شعری مجموعہ 'ہر لمحہ اور' حال ہی میں منظر عام پر آچکا ہے جس پر سن اشاعت اول اکتوبر ۲۰۰۹ء درج ہے۔ حالاں کہ پہلے مجموعے (دل سے اٹھا دھواں) کے دیباچے میں تحریر ہے کہ 'دل سے اٹھا دھواں' سے پہلے بھی ایک مجموعہ 'ہر لمحہ اور' چھپ چکا ہے مگر وہ مجموعہ میری نظر سے نہیں گزرا ہے۔

رازدان رازؔ کو بچپن ہی سے غموں اور فریبوں سے واسطہ پڑا ہے۔ ماں، جو فن موسیقی سے آشنا تھی اور جس کی بدولت رازؔ نے اُردو سیکھی، اور باپ جس نے رازؔ کو بے حد پیار اور شفقت سے نوازا، دونوں بچپن ہی میں رازدان رازؔ کو اس مکر و فریب کی دنیا میں تنہا چھوڑ گئے۔ بقول شاعر ''نہ غریبی میں چین ملا اور نہ خوشی میں سکون۔'' یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں غم ذات اور اپنوں سے بچھڑنے کا غم نمایاں ہے۔ موت، زندگی، تنہائی، غم، اندھیرے، خوف، دہشت، تھکاوٹ جیسے الفاظ زیر نظر مجموعے میں کثرت سے ملتے ہیں۔ بہر حال رازؔ کی شاعری سے یہ ظاہر ہے کہ نہ وہ ترقی پسند تحریک کی جنونیت میں بہہ گئے اور نہ ہی جدیدیت کے طلسمی جال میں پھنس گئے۔ وہ دل کی بات برملا کہتے ہیں اور اپنی روایت سے منہ نہیں موڑتے۔ ان کی زبان برجستہ، عام فہم اور سلیس ہے جو سیدھے دل میں اترتی ہے۔ بقول ابراہیم اشکؔ: وہ شاعر بھی ہیں

ناشر: تکمیل پبلی کیشنز، ممبئی / بھیونڈی

سن اشاعت: اکتوبر ۲۰۰۹ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

اور شاعر نواز بھی، دوست بھی ہیں اور ٹوٹ کر دوستوں کو چاہنے والے بھی۔ سچے فن کی اچھی قدر ان کی محفل میں اس طرح ہوتی ہے کہ فن کار نہال ہو جاتا ہے۔

رازؔ کی شاعری کے دو مجموعے چھ مہینوں کے درمیان ہی چھپ کر آ چکے ہیں جس سے ان کی بسیار گوئی ثابت ہوتی ہے۔ اس بارے میں گنیش بہاری طرزؔ لکھنوی رقم طراز ہیں۔ ''کوئی دو سال پہلے جب قسمت نے ان سے ملاقات کا شرف عطا کیا تو وہ غزل سمجھنے، اس کی گہرائی و معنی کو سمجھنے میں زیادہ منہمک دکھے۔ شروع میں تو انہوں نے یہ بھی نہیں بتایا کہ وہ خود ہی شعر بھی کہتے ہیں اور سنانے پر آئے تو روز ایک غزل حاضر ہے۔ لگتا تھا کوئی درد اور مشاہدات کا لاوا اندر سے پھوٹ نکلنے کو بے چین تھا۔'' تازہ مجموعے میں زیادہ تر غزلیں ہی شامل ہیں مگر دو ایک نظمیں اور چند قطعات و متفرقہ اشعار بھی شامل ہیں۔ غزل کے بارے میں شاعر فرماتے ہیں:۔

الفاظ میں ڈھل جاتی ہے جب بھی کوئی غزل
میں سوچتا رہ جاتا ہوں یہ کس نے کہی ہے

رازدان راز کی زندگی ایک مسلسل سفر ہے۔ وہ منزل کی تلاش میں سرگرداں ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کی اصلی منزل، یعنی پرماتما سے آتما کا ملن، قریب ہو۔ چند اشعار:۔

تلاش منزل:

میرے اندر میرا ایک ہمسفر ہے — وہ میری منزلوں سے بے خبر ہے
تمام رشتے یہاں پیروں کی زنجیریں ہیں — یہ توڑ پائیں تو ہم قافلوں کی بات کریں
وفا کی راہ میں ہیں درد و رنج و غم کے ہجوم — چھٹے یہ بھیڑ تو ہم منزلوں کی بات کریں

خدا:

تو جسے ڈھونڈ رہا ہے وہ تیرے اندر ہے — خود سے ملوانے تجھے کون بھلا لے جائے
کب تو گزرے گا اِدھر سے اے خدا — میں ہوں صدیوں سے کھڑا کہنے کو کچھ
جہاں میں اپنی ہستی صرف ایک ذرّے کے جیسی ہے — یہ کس کا نور ہے جو میرے اندر جگمگاتا ہے
وہ سامنے تھا تو کیوں دیکھ نہ پائے اس کو — کوئی پردہ بھی کہیں اپنے درمیاں نہ ملا

تخلیق کائنات:

یہ کائنات ہے کیا، دشت کیا، مکاں کیا ہے — بس ایک جذبۂ تخلیق ہے جہاں کیا ہے

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

جہاں تک غم ذات کا سوال ہے، رازؔ کے یہاں زندگی اور موت کا تصادم بھی ہے، غم اور خوشی بھی ہے، ہجر و وصال بھی ہے، سزا و جزا بھی ہے، خاموشی اور تکلم کا تضاد بھی ہے، امید و بیم بھی ہے اور خوف و دہشت بھی ہے۔ کہیں پر یوں لگتا ہے کہ وہ زندگی سے اُکتا بھی گئے ہیں۔ پیش ہے چند چنندہ اشعار:

زندگی/موت:

- زندگی دنیا میں بس لا کے چھوڑ دیتی ہے — موت پل پل کے گزر کا حساب رکھتی ہے
- ڈرتے ڈرتے کاٹ دی یہ زندگی — موت سے ہر لمحہ گھبرائے ہوئے
- یہ کیسا آگ کا دریا ہے یارب — کہ جس میں ڈوبنا ہی زندگی ہے

غم/خوشی:

- کیا ہے رشتہ غموں سے خوشیوں کا — ہر خوشی غم شناس سی کیوں ہے
- غم ہزاروں چھپا کے دامن میں — زندگی خوش لباس سی کیوں ہے

ہجر و وصال:

- اس سے ملے بغیر بھی بے چین تھے مگر — اب چین اس سے مل کے بھی آتا نہیں ہمیں
- نظریں بچا کے ہم سے کوئی دور چل دیا — ہم نے اسی کے نام سے دامن بھگو لیے

سزا و جزا:

- کر رہا تھا میں توقع اس سے رحمت کی مگر — وہ بڑھاتا ہی گیا میری سزا ہر لمحہ اور
- ہو تو سکتی ہے خدا سے دیر کچھ انصاف میں — کون ہے لیکن جو کرنی کی سزا پایا نہیں
- جو بھی دکھا اداس گلے سے لگا لیا — رویا ذرا سا کوئی تو ہم اس کے ہو لیے

اُمید:

- دل کو تو اب یقین ہے ملے گا نہ وہ کبھی — امید اس کو اب بھی مگر ڈھونڈ رہی ہے

خاموشی:

- وہ آنکھ سے کہتے ہیں، ہم دل سے سمجھتے ہیں — نظروں سے جو ہوں باتیں، الفاظ ہیں خاموشی
- بات کب عشق کی ہونٹوں سے بیاں ہوتی ہے — عشق ہوتا ہے تو آنکھوں میں زباں ہوتی ہے

انتظار:

- آج کی شام ان سے ملنا ہے — آج جلدی سے شام ہو جائے

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

تنہائی:

ساتھ کب تک نبھائے تنہائی — وہ نہ آئے، نہ موت ہی آئی

تھے ساتھ ساتھ مگر سارے ہمسفر تنہا — قدم ملا کے چلے، دل رہے مگر تنہا

خوف/دہشت:

عمر بھی اپنی ہی دہشت میں گرفتار رہے — جی نہ پائے کبھی اس ڈر سے کہ مرجائیں گے

نفرت:

نفرت کی آگ چاہے جلا دے میری زمین — انسانیت کے بیج مگر بوتا رہوں گا میں

چند اشعار خار جی احساسات کے حوالے سے:

ماں:

بچوں کی بھوک جن کو جگائے تمام رات — آنکھوں میں ایسی ماؤں کے کیسے نہ ہو تھکن

گاؤں/شہر:

چھوڑ کے آئے دودھ کی ندیاں، چلے تھے ہم جس گاؤں سے — اب تو شہروں میں رہنا ہے، چھین جھپٹ کر کھانا ہے

رہنمائے نو:

خود بھٹکتے تھے جو ہرجائی زمانے بھر کے — آج وہ رسم وفا ہم کو سکھانے نکلے

موصوف کی شاعری کا اگر مجموعی طور پر جائزہ لیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ان کے ہاں آورد سے زیادہ آمد ہے۔ ان کا دل وہ چشمہ ہے جس میں سے شیریں اشعار پھوٹتے رہتے ہیں البتہ یہاں پر میں سمجھتا ہوں کہ راز کو خود احتسابی سے گزرنا پڑے گا کیوں کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ مقدار سے زیادہ معیار کی طرف دھیان دیں اور تنگنائے ذات سے نکل کر کائنات کا احاطہ کریں تا کہ ان کے اشعار میں وسعت اور آفاقیت پیدا ہو۔

❖ ❖ ❖

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

نئے سفر کا آغاز

ـــــ آغاز بلڈانوی

ڈاکٹر گنیش گائیکواڑ آغاز بلڈانوی اردو ادب کے لیے نئے ضرور ہیں مگر ہندی میں پہلے ہی ان کے چار شعری مجموعے؛ آغاز، چاند کا سفر، منظر بدل نہ جائے اور آزادی ریٹائر ہو رہی ہے، شائع ہو کر قارئین سے داد و تحسین پا چکے ہیں۔ چونکہ ان کی طبیعت کا میلان غزل کی جانب رہا ہے اس لیے انہوں نے ڈاکٹر محبوب راہی سے باقائدہ اردو شاعری سیکھ لی اور بہت ہی کم عرصے میں زیرِ نظر مجموعہ شائع کر کے سرخرو ہوئے۔ ان کے بارے میں راہی صاحب فرماتے ہیں؛ ''آغاز بلڈانوی ایک صاف ستھری اعلیٰ تعلیم اور تربیت یافتہ سجی سنوری شخصیت کے مالک ہیں۔ جس کی روشنی ان کے خیالات سے چھن چھن کر ان کے اشعار کی تہوں سے جھلکتی اور چمکتی دمکتی محسوس ہوتی ہے۔'' اردو زبان کی آفاقیت، مٹھاس اور اہمیت کا اندازہ آغاز کو زبان سیکھنے کے بعد ہی ہوا چنانچہ لکھتے ہیں ''مجھے ایک محرومی کا احساس ہوا کہ میں اتنے برسوں تک ایک بہت ہی خوبصورت، دل پذیر اور قومی یکجہتی کی علمبردار زبان سے اور اس کے سرمائے سے محروم رہا۔''

آغاز بلڈانوی کی شاعری میں سوز و سازِ عشق کی کیفیت اسی شدت سے ملتی ہے جتنی خارجی دنیا کی بے سروسامانی کی تصویر۔ وہ اپنے محبوب کی سنگدلی اور بے اعتنائی پر اسی طرح آنسو بہاتے ہیں جس طرح اپنے معاشرے کی بے ضابطگیوں کا رونا روتے ہیں۔ آغاز جب زندگی کے سفر کے انجام پر غور کرتے ہیں

ناشر: اسباق پبلی کیشنز، لوہ گاؤں روڈ، پونے۔ ۳۲
سن اشاعت: نومبر ۲۰۱۰ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

تو انہیں اس کی لاسمتی کا احساس ہوتا ہے۔ انہوں نے معاصر سماجی مسئلوں جیسے دہشت گردی، فرقہ پرستی اور سیاسی استحصال پر اپنے خیالات کا بے ٹوک اظہار کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے چند غور طلب اشعار:

سوزِ عشق:

ے اب نیند لگی، اب آنکھ کھلی، اب درد ہوا، اب چین ملا — تھا عشق تو ایسی حالت تھی میں ہنستے ہنستے روتا تھا

ے دل والوں کی باتیں بھی تو دل والے ہی سمجھے ہیں — دل شیشہ بھی، دل پارس بھی، دل ہی پتھر ہوتا ہے

ے کوئی دستک ہوئی تو ہے مگر در پر نہیں کوئی — ہوا کی یہ شرارت ہے نہیں باہر نہیں کوئی

ے جو میرا ہم سفر بھی، راہ بھی منزل بھی تھا آغاز — مرا ہو کر مرا اپنا کہاں تھا وہ پرایا تھا

بے رُخی:

ے ہو سنگ صفت لاکھ، بدل جاؤ گے اک دن — احساس کی گرمی سے پگھل جاؤ گے اک دن

بے گناہی:

ے میں اپنی بے گناہی پہ خود اپنے آپ میں — رہتا ہوں شرم سار گنہگار کی طرح

لاسمت سفر:

ے چھوٹی چھوٹی چاہتوں کی آتی جاتی بھیڑ میں — اونچی اونچی خواہشوں کے حادثے ہی رہ گئے

ے منزلوں کی خبر نہیں کچھ بھی — راستوں سے گذر رہے ہیں سب

ے کچھ ایسے مشاغل میں گزارے ہیں شب و روز — جن کا کوئی مقصد کوئی حاصل بھی نہیں تھا

بے حسی:

ے اجالوں کے لیے ایسی حماقت کون کرتا ہے — جلا کر گھر اندھیروں سے بغاوت کون کرتا ہے

ے ہم پڑوسی سے اپنے رہے بے خبر — ساری دنیا کی ہم کو خبر چاہیے

ناانصافی:

ے ازل سے ہے معلق قتل و خوں کے فیصلے آغاز — کبھی قاتل نہیں ملتا، کبھی خنجر نہیں ملتا

(حالیہ جیسکا لال اور آروشی قتل کیس کے پس منظر میں ملاحظہ کریں)

تخریب کاری:

ے اب عام ہو گئے ہیں دہشت بھرے نظارے — جذبات کو سبھی نے تلوار کر دیا ہے

ے میرے بھائی بتا مجھ کو تجھے کیا اس سے مل جاتا — مری بستی اگر جلتی ترا گھر بھی جلا ہوتا

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ے سناتا تھا مزے لے لے کے جو قصے فسادوں کے — اسے بھی ہم نے اک دن پھر لہو میں تر بہ تر دیکھا

ے جو آگ بستیوں میں لگا کر چلے گئے — ہم لوگ ان کے پتلے جلاتے ہی رہ گئے

انسانیت:

ے تم جو کہتے ہو کہ دنیا کو خریدو گے مگر — بک نہیں سکتا جو انسان ابھی باقی ہے

ے اب اندھیروں میں چراغوں کی جگہ — ہم قلم کاروں کو جلنا چاہیے

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ 'نئے سفر کا آغاز' اردو لٹریچر میں ایک اہم اضافہ ہے حالانکہ آغاز کو ابھی بھی بہت سے مرحلے طے کرنا باقی ہیں اور مجھے امید ہے کہ وہ اسی جانفشانی اور لگن سے اپنے دل کی آواز لوگوں تک پہنچاتے رہیں گے۔ کتاب میں چند گرامر کی غلطیاں رہ گئی ہیں جنہیں دوسرے ایڈیشن میں دور کرنے کی ضرورت ہے۔ مجھے پوری امید ہے کہ زیرِ نظر شعری مجموعے کی خوب پذیرائی ہوگی۔

❖ ❖ ❖

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

طلسم

ـــــ اویس جمال شمسی

ایک سو اشعار پر مشتمل کتابچہ 'طلسم' دیکھ کر کچھ حیرانی ضرور ہوئی کہ اس سے بہتر تھا کہ ان اشعار (مع دیگر غزلیات کے) کو کتابی صورت میں پیش کیا جاتا کیونکہ کتابچہ ادیبوں میں تقسیم تو ہوسکتا ہے مگر لائبریری کی زینت بن کر آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ نہیں ہوسکتا۔ آذر اکیڈمی کی کوششوں کو دیکھ کر مجھے امید ہے کہ وہ میری اس تجویز پر آئندہ غور فرمائیں گے تاکہ ادیبوں کی محنت رائیگاں نہ ہو۔

اویس جمال شمسی کی شاعری علی گڑھ کے ادبی ماحول میں پروان چڑھی ہے۔ میکش بدایونی سے انہوں نے کسب فیض حاصل کیا ہے۔ اس لیے ان کی شاعری میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو روایتی شاعری میں ہونی چاہئیں۔ تاہم وہ ہم عصر حالات سے بھی منہ نہیں موڑتے اور ان حالات کی کرب ناکیوں کو بھی اپنی شاعری کا حصہ بنا لیتے ہیں۔ شاعری کا آہنگ، زبان کی سلاست اور فکر کی رفعت اویس جمال شمسی کے کلام کو انفرادیت بخشتی ہے۔ کتابچے میں سے چند اشعار یہاں پر نقل کر رہا ہوں تاکہ قاری خود ان کی معنویت کا اندازہ لگا سکیں۔

جمالیات:

تمہاری زلف کا رخ پر بکھر جانا ہی اچھا ہے ؎ اندھیروں سے بھی اکثر آنکھ کو تسکین ہوتی ہے

ناشر: آذر اکیڈمی، علی گڑھ — سن اشاعت: ۲۰۰۹ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ے اس کے ہونٹوں سے رس ٹپکتا ہے
کس کے لب چھو کے آرہی ہے صبا

اندیشہ:

ے تیرے انفاس کی خوشبو سے میسر لیکن
پھر بھی اے دوست مجھے خوفِ جدائی کیوں ہے

ہجر:

ے آنکھ تک آکے پلٹ جاتے ہیں دل میں آنسو
اتنی مہلت ہی کہاں ہم کو کہ رولیں صاحب

ے مدت کے بعد کمرے کو دیکھا جو غور سے
آنسو نکل پڑے تری تصویر دیکھ کر

تنہائی:

ے اگرچہ چار طرف زندگی کا میلہ تھا
میں آج بھی ہوں اکیلا میں کل بھی تنہا تھا

تلاش:

ے میں اپنے آپ کو ڈھونڈوں تو کس طرح ڈھونڈوں
تیرا سراغ بھی آوارہ خوشبوؤں سے ملا

فریب ذات:

ے تو بھی فریبِ ذات سے باہر نہ آسکا
مجھ میں بھی اعتماد کی طاقت نہیں رہی

سچائی:

ے سچائیوں کی راہ پہ چلنے کا فیض ہے
اپنے کہیں کسی سے مراسم نہیں رہے

رجائیت:

ے خود پہ مایوسیاں طاری ہی نہ ہونے دیجیے
یہ اندھیرا ہی سویرا نہیں ہونے دیتا

غربت:

ے بارش کے ساتھ برسیں گی یہ بے اماں چھتیں
برسات میں غریب کا گھر ٹوٹ جائے گا

ناکامی:

ے نامکمل فائلیں دسیوں پڑی ہیں میز پر
اور دفتر بند ہونے کا سمے نزدیک ہے

موجودہ تعلیم:

ے کن منزلوں کی سمت رواں ہے یہ نسلِ نو
ان کالجوں میں ان کے نصابوں میں دیکھیے

گاؤں/شہر:

ے خامشی گاؤں کا مقدر ہے
ایک محشر بپا ہے شہروں میں

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

دوغلہ پن:

؎ بنا ہے آج وہ امن و اماں کا دعویدار جو پچھلے دور میں برپا فساد کرتا رہا

مجموعی طور پر 'طلسم' کا ہر شعر قاری کے دل پر اثر انداز ہوتا ہے مگر پھر بھی تشنگی کا احساس برقرار رہتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اویس جمال شمسی آئندہ متاع زیست اُردو کے سپرد ضرور کرلیں گے۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

شعری مجموعہ

بچوں کی نظمیں

چندا کے دیس میں

احمد کلیم فیض پوری

ادبِ اطفال ایسا میدان ہے جس میں ہر نئی تصنیف، جو بچوں کی دلچسپی اور علم کو بڑھائے، کا خیر مقدم ہونا چاہیے۔ احمد کلیم فیض پوری کی کتاب بعنوان 'چندا کے دیس میں' اسی سلسلے کی ایک اور کڑی ہے۔ اس کتاب میں موضوعات کی رنگا رنگی بھی ہے، علم کی توسیع کے امکانات بھی ہیں جیسے نظم 'فن لینڈ'، 'چاند پر پریاں' اور در پردہ نصیحتیں بھی ہیں جیسے نظم 'میں نظم لکھ کر رہا ہوں'، 'پھولوں کا جلسہ'، 'لمبی سڑک اور راستہ چھوڑ دو' میں چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:۔

حالی کا ان سے پوچھو غالب بتا رہے ہیں

یہ جانتا ہوں میں بھی پڑھتا کوئی نہیں ہے
ذکر کتاب بھی اب کرتا کوئی نہیں ہے
لیکن ہے یہ ضروری اہل کتاب ہونا
ہم عصر کیا کہیں گے اس کا جواب ہونا

میں نظم لکھ رہا ہوں

ناشر: مصنف۔ ۲۲۵۲، املی پورہ، بھساول مہاراشٹر۔ ۴۲۵۲۰۱
سن اشاعت: فروری ۲۰۱۰ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ے میرے بچے راج دلارے کیا رکھا ہے کانٹوں میں
دو دِنوں کا جینا ہے پھول بچھانا راہوں میں

پھول بچھانا راھوں میں

ے تیوہاروں کا کیا ہے بھائی سب ہیں ہم کو ایک سمان پونگل ہو یا عید دِوالی دینا سب کو ہے سمان

ھولی کاتھوار

'چندا کے دیس میں' میں مظاہر قدرت کی نعمتوں کا بیاں بھی ہے (نظمیں۔سورج، پھولوں کا جلسہ، سردی، فن لینڈ، موسم گرمی کا، مولا پانی دے، چاند اور برکھارانی)، انسانی ایجادات واختراعات کے کرشمے بھی ہیں (نظمیں موبائیل، کمپوٹر، بجلی مائی کہاں گئی)، حب الوطنی کے گیت بھی ہیں (۲۶رجنوری، دیس ہمارا)، موجودہ دور میں روزگار کی مجبوریاں بھی ہیں (ایک خط ابو کے نام) اور عید وہولی کے نغموں کی بازگشت بھی ہے۔ (عید آئی ہے، ہولی کا تہوار)۔ نظم 'چاند' نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا کیونکہ اس میں لے بھی ہے نغمگی بھی ہے اور پھر دل کو چھو بھی لیتی ہے۔

کچھ تجاویز بھی رقم کر رہا ہوں۔ چنانچہ آج کل پرنٹنگ بہت ترقی کر چکی ہے، اس لیے بہتر یہ ہوتا کہ ہر نظم کو باتصویر اور رنگیں بنایا جاتا تاکہ چھوٹے بچوں کے لیے سماعی اور بصری طور پر مزید دلکشی بڑھ جاتی۔ نظم ۲۶رجنوری میں شاعر نے 'یوم جمہوریہ' کی اہمیت کو کہیں پر بھی بیاں نہیں کیا ہے جو مذکورہ نظم کے لیے بہت ضروری تھا۔ نظم 'کیا خوب تھی قوالی' میں اشعار کا مطلب صاف طور پر نہیں نکلتا ہے۔ یا شاید مجھے سمجھنے میں کوئی کمی رہ گئی ہو۔ بہتر یہ ہوتا کہ شعر کچھ اس طرح ہوتے۔

ے معلوم اگر ہوتا جاتے نہ ہم میلے میں جی بھر کے مٹھائی کھاتے نہ ہم میلے میں
ہوتی جو بشارت یہ، مہنگائی خبر لے گی گھر سے نہ نکلتے اور جاتے نہ ہم میلے میں

علاوہ ازیں میں یہ سمجھتا ہوں کہ 'پھول بچھانا راہوں میں' گرچہ بہت اچھی نظم ہے مگر بچوں کے اذہان پر اس کے منفی اثرات پڑ سکتے ہیں۔ ویسے بھی ٹی وی چینلوں نے کونسی کسر چھوڑ رکھی ہے۔

مجموعی طور پر 'چندا کے دیس میں' کی نظمیں دل کو چھو جاتی ہیں اور مجھے امید ہے کہ اس مجموعے کی خوب پذیرائی ہوگی۔

❖ ❖ ❖

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

نیا منظر نامہ

مظہر سلیم

مظہر سلیم کے پندرہ افسانوں کا انتخاب 'نیا منظر نامہ' ممبئی اور اُس کے مضافات کا آئینہ بن کر ہمارے سامنے آیا ہے۔ یہ وہی علاقہ ہے جہاں ہندوستان کی مختلف ریاستوں سے لوگ روزی روٹی کی تلاش میں جوق در جوق چلے آتے ہیں کیونکہ ان کی آبائی زمینیں ان کا بوجھ نہیں اٹھا پاتیں۔ بہر حال یہاں بھی ان لوگوں کو اکثریتی فرقے کی بدظنی و بدگمانی کا شکار ہونا پڑتا ہے، پولیس کی یاتنائیں جھیلنی پڑتی ہیں اور تحت الانسانی زندگی بسر کرنی پڑتی ہے۔ اس حساب سے دیکھا جائے تو مظہر سلیم کی کہانیاں مقصدی ادب میں ایک گراں مایہ اضافہ ہیں۔

مظہر سلیم کی تخلیقات پر جدیدیت کا اثر صاف طور پر دکھائی دیتا ہے۔ وہ علامتوں اور استعاروں کا استعمال جابجا کرتے ہیں۔ پھر بھی ان کے افسانوں میں نہ تو 'کہانی پن' کی کمی محسوس ہوتی ہے اور نہ ترسیل کی، نہ کردار غائب ہیں اور نہ پلاٹ میں بکھراو ہے۔ وہ اپنے معاشرے کے تنزل پر بھی فکرمند ہیں اور ہندوستان کے مسلمانوں کی زبوں حالی پر بھی۔ آزادی کے بعد اس قوم کو جن مرحلوں اور مصیبتوں سے گزرنا پڑا اس کا بیان مظہر سلیم نے بڑی چابکدستی سے علامتی انداز میں کیا ہے۔ انہیں اس بات کا بھی غم ہے کہ اس قوم نے آسمانی صحیفے کو بالکل نظر انداز کیا ہے اور اسے نہ منزل کا پتہ ہے اور نہ راستے کا علم ہے حتیٰ کہ ابھی تک یہ قوم 'میر کارواں' کی تلاش میں بھٹک رہی ہے۔

ناشر: تکمیل پبلی کیشنز، ممبئی / بھیونڈی

سن اشاعت: اپریل، ۲۰۰۷ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

افسانہ 'اندر کا آدمی' میں موجودہ دور کے شریف النفس انسان کی بے بسی اور بٹی ہوئی شخصیت (Split personlity)، 'دشک' میں ڈھلتی عمر، غیر محفوظیت اور نادیدہ خوف کا احساس، 'تعاقب' میں بے روزگاری اور زندگی کے دیگر مصائب سے ہار کر فرار کی راہ لینا اور 'واگھ مارے نے خودکشی کیوں کی؟' میں پولیس کی زیادتیوں کے سامنے نہتے انسان کی لاچاری پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ 'وامن راؤ کی واپسی' ایک ایسے انسان کی کہانی ہے جو بے لوث اور صاحب ایثار ہے اور جس کا وجود ساری کالونی کے لیے خوش کن ہے۔ مسلمان اسے اپنانا چاہتے ہیں جبکہ اس کا ہندو سرپرست اسے بدفعلیاں کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے باوجود وامن راؤ کی لاوارث لاش کا حقدار ہندو سرپرست ہی قرار دیا جاتا ہے۔ تزویج محرمات Incest پر لکھا گیا افسانہ 'سائباں' میں جنسی طلب انگیز ہونے پر ایک بیوہ اپنے محرم (سسر) کو ہی اپنا سائباں بنا لیتی ہے جبکہ 'نیا منظر نامہ' میں موجودہ زمانے کے رکھوالے (گڈریا) کے بدلے ہوئے تیور نظر آتے ہیں اور جن کی وہ رکھوالی کرتا ہے وہ آج بھی غفلت کی نیند سو رہے ہیں۔

'درندہ' اذیت پسندی masochism پر لکھا گیا خوبصورت افسانہ ہے جس میں گھریلو تشدد ہولناکی کے باوجود جنسی سیری (Sexual Satisfaction) کا کام کرتی ہے۔ 'بیر بار' صفدر ہاشمی کی زندگی سے تحریک شدہ کہانی ہے جس میں آزادی، مساوات اور حقوق کی تلفی پر بحث کی گئی ہے۔ 'الاؤ اور ایک بوڑھا شخص' میں اجتماعی غفلت کے آگے انفرادی بیداری کی بے وقعتی اور 'اپنے حصے کی دھوپ' میں دھوپ سے زندگی بھر پریشاں ہو کر چھاؤں کی تلاش کو موضوع بنایا گیا ہے۔ 'آدم ہاؤسنگ سوسائٹی' میں مردوں کے ہوتے ہوئے ایک نامرد اکیلے ہی ہندو فرقہ پرستوں سے لڑ کر سرخرو جا ہوتا ہے لیکن پولیس اس کا کام تمام کر دیتی ہے۔ 'نصیبن بوا' ایک قسمت کی ماری مسلمان عورت کی دلسوز کہانی ہے جو ایک ہندو کے گھر میں پناہ لے کر اسی گھر کا فرد بن جاتی ہے۔ اسے گھر میں ماں کا درجہ مل جاتا ہے مگر ملک کی تقسیم کی طرح دو بھائیوں کے الگ ہونے پر نصیبن بوا کے بٹوارے کا مسئلہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ حالانکہ وہ چھوٹے لڑکے کو بے حد پیار کرتی ہے لیکن بڑے لڑکے کے ساتھ اس لیے جاتی ہے کہ اس کی بیوی ٹی بی کی مریض ہوتی ہے۔ یہ کہانی مہاتما گاندھی کی اس کارروائی کی یاد دلاتی ہے جب انہوں نے پاکستان بننے پر اُن کو مالی استحکام بخشنے کے لیے ہندوستانی حکومت سے امداد کی اپیل کی تھی۔ 'دیمک' موجودہ مسلم معاشرے میں قرآن اور سچے دین کی ان دیکھی اور 'سفر دھواں اور کہانی' اسی سماج کی بے سمتی اور رہنمائی کے فقدان کی داستان ہیں۔

مظہر سلیم کی کہانیوں میں پلاٹس کا تنوع صاف نظر آتا ہے تاہم ان کے یہاں مدنی تناظر، مسلمانوں

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

اور دلتوں کی پامالی، فرقہ وارانہ فسادات، پولیس کا ظلم و جبر، ادنیٰ اور متوسط طبقے کی نفسیاتی الجھنیں، گھریلو تشدد اور بابری مسجد سانحے کی بازگشت نمایاں موضوع بن کر ابھرتے ہیں۔ انسان اور انسانی فلاح ان کی کہانیوں کا محور ہے۔ اسی مظلوم انسان کے بارے میں 'واگھ مارے نے خودکشی کیوں کی؟' میں رقم طراز ہیں۔ ''وہ کبھی بھنڈی بازار میں مارا گیا تو کبھی ناگپاڑہ پر، کبھی محمد علی روڈ پر تو کبھی مسافر خانہ پر قتل کیا گیا، بڑی بے دردی سے! اس کی موت ایک المیہ ہے۔'' حالانکہ وہ کرداروں پر خصوصی طور پر فوکس کرنے سے گریز کرتے ہیں، اس کے باوجود انہوں نے نصیبن بوا اور وامن راؤ جیسے مثبت کردار اردو ادب کو دیے ہیں۔ نصیبن بوا بٹوارے کا مثبت استعارہ بن کر ہمارے سامنے نمودار ہوتی ہے، وامن راؤ بے نفسی اور نوح پرستی کی مثال بن کر ابھرتا ہے جبکہ آدم خود کفیلی اور خود اعتمادی کا علامیہ بن کر ہمیں جھنجھوڑتا ہے۔

مظہر سلیم سلیس اور عام فہم زبان استعمال کرتے ہیں۔ ان کے مکالمے کردار کی انفرادی اور اجتماعی شخصیت کی عکاسی کرتے ہیں۔ وہ سچ کہنے سے نہیں ڈرتے ہیں مگر گاہے بگاہے اپنی بات طنزیہ پرائے میں کہہ جاتے ہیں۔ ملاحظہ ہو چند اقتباسات۔

- ''نہیں! شیطان تو خود اپنی اصلیت کھوتا جا رہا ہے۔ اس کا سارا رنگ تو ہم انسانوں نے اپنے آپ پر چڑھا لیا ہے۔ (دیمک)
- کبھی مجھے یاد آجاتا ہے کہ مسلمانوں کے یہاں زیادہ بچے پیدا کرنے کا چلن ہے اور یہ لوگ بس بچے ہی پیدا کرتے ہیں۔ (نصیبن بوا)
- شاید یہ چیخ گاندھی نگر کی اور سے آئی ہے کیونکہ جب سے وہاں پر گاندھی جی کے مجسمے کی آنکھیں غائب ہوئی ہیں تب سے اس نگر میں اندھیرا چھا گیا ہے۔ (نیا منظر نامہ)
- میں نے والد صاحب کو گاؤں سے یہاں اپنے پاس بلا لیا تھا تاکہ گھر کی حفاظت، چھوٹے موٹے کاموں میں صلاح و معاونت مل سکے۔ (وامن راؤ کی واپسی)
- پولیس میں رپورٹ لکھوانا بے وقوفی تھی، غنڈے اور پولیس دونوں ایک ہی سکے کے دو رُخ تھے۔ (اندر کا آدمی)
- اگر اپنے مذہب کے خلاف کوئی دوسرا زہر اگلے تو ان سے برداشت نہیں ہوتا تھا مگر وہ اپنے مذہب کو برا بھلا ضرور کہتے تھے۔ (واگھ مارے نے خودکشی کیوں کی؟)
- غنڈے گھر گھر جا کر چندہ وصول کرتے۔ یہ لوگ محرم میں کھچڑے اور غوث الاعظم

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

کی نیاز کا اہتمام بھی اسی انداز سے کرتے اور کالونی کے مکینوں کو عام دعوت دی جاتی۔
اس مذہبی کام کے لیے چندہ بھی دل کھول کر دیا جاتا۔ (اندر کا آدمی)

آخر میں افسانہ نگار کے فن پر ابراہیم اشک کے مندرجہ ذیل تاثرات پیش کرتا ہوں جو ان کے فکر وفن کا مکمل احاطہ کرتے ہیں:

''مظہر سلیم نے نئی نسل کے افسانہ نگاروں میں موضوعات، بیانیہ اور کردار نگاری کے بل پر اپنا منفرد مقام بنایا ہے۔ ان کے افسانوں میں موجودہ سماج کے کرداروں کی کسک، وطن کی مٹی کی مہک، نئے نئے جملوں کی چمک اور موضوعات کی دھنک بکھری ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ بیدار بھی ہیں اور تازہ کار بھی، ان کے یہاں جوش بھی ہے اور ہوش بھی، وہ ہنر مند بھی ہیں اور کہانی کی عظیم روایت کے پابند بھی۔ یہی خوبیاں انہیں اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں میں ممتاز اور منفرد بناتی ہیں۔''

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

رام جی کا دُکھ

ـــــ ابراھیم اشک

اور

ابراہیم اشک ـــ افسانے اور تجزیے

ـــــ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

دو کتابوں پر ایک ساتھ تبصرہ کرنا میری مجبوری ہے کیونکہ پہلی کتاب میں ابراہیم اشک کے تیرہ افسانے ہیں جبکہ دوسری کتاب میں بھی وہی تیرہ افسانے ہیں لیکن ان پر تجزیہ نگاروں کے تجزیے بھی شامل ہیں۔ اس طرح دوسری کتاب کو امدادی و تکمیلی (Complementary) حیثیت حاصل ہے۔ شاعر، صحافی وفلم رائٹر ابراہیم اشک نے اس افسانوی مجموعے کے ساتھ افسانہ نگاری کے میدان میں پہلا قدم رکھا ہے اور سرخروئی سے بھی ہمکنار ہوئے ہیں۔ دوسری جانب ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نامور تحقیق وتنقید نگار ہیں بے شمار تصانیف وتالیفات کے خالق ہیں۔ انہوں نے بڑی ذمے داری اور ہنرمندی کے ساتھ دوسری کتاب کی تدوین وتالیف سرانجام دی ہے۔

ناشر: تکمیل پبلی کیشنز۔ ممبئی / بھیونڈی۔ سن اشاعت: ۲۰۰۶ء

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دھلی ٦ سن اشاعت: مارچ ۲۰۰۹ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

افسانوں کا مجموعہ 'رام جی کا دکھ' معاشرے کا درپن بن کر ہمارے سامنے آیا ہے۔ سماجی ناانصافیاں، بدعتیں، سیاسی ہتھکنڈے، اقلیتوں پر ظلم وستم، مذہبی عقیدوں سے بے اعتنائی اور تہذیبی تسلط ان افسانوں کے موضوعات ہیں۔ جیسا کہ ظاہر ہے یہ موضوعات مسائل حاضرہ پر مبنی ہیں اس لیے قاری کے ذہن میں تجسس اور تفحص کی چنگاریاں پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ ابراہیم اشک سیاسی، سماجی اور معاشی مساوات، روایتی اقدار اور عالمی امن کے خواہاں ہیں اس لیے ان کے اکثر افسانے مقصدی اور نصیحت آموز ہوتے ہیں حالانکہ چند ایک کہانیاں تبلیغ کی حدوں کو تجاوز کر گئی ہیں۔ چونکہ ابراہیم اشک نے ہندی میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی ہے، ان کی زبان میں اپنی دھرتی کی بو باس ملتی ہے۔ وہ اکثر مقامی علامتوں اور استعاروں کا استعمال کرتے ہیں۔ ان کی زبان میں سلاست بھی ہے، فصاحت بھی اور بلاغت بھی۔ انہوں نے بیانیہ انداز تحریر کو اپنایا ہے تاکہ ترسیل میں کہیں کوئی دشواری پیدا نہ ہو۔ علاوہ ازیں وہ گاہے بہ گاہے طنز کا بھی استعمال کرتے ہیں جو قاری کے دل میں نشتر کی طرح اتر جاتا ہے۔ تاہم اشک کے افسانوں کا مطالعہ کرنے سے جو رجحان سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ اشک پہلے ہی سے کسی مسئلے کے بارے میں سوچ کر رکھتے ہیں (Preconceived Notions) اور اس کو اپنے منطقی انجام تک پہنچنے نہ دیتے۔ کئی افسانوں میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ آستھا، پیس یا کیوٹی وی پر لیکچر دے رہے ہیں اور پابست سامعین (Captive audience) کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ ایشور کا وجود مسلم ومثبت ہے اور مذہبی احکام کی پابندی ضروری ہے۔ وہ قارئین سے صرف یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ اثبات میں سر ہلاتے رہیں۔ اس زمرے میں ان کے افسانے سانپ، ماں، خدا کی قسم وغیرہ شامل کیے جاسکتے ہیں۔ اپنی بات منوانے کے لیے وہ قدرتی انصاف Divine Justice کا اکثر سہارا لیتے ہیں۔ کئی افسانوں میں افسانہ نگار نے مذہبی رواداری کی عکاسی کرنے کے لیے دو فرقوں کے کردار عمداً لا کھڑا کیے ہیں (زندہ تصویر وغیرہ) ملاحظہ کیجیے اس حوالے سے چند اقتباسات:

- ''لیکن آخر جیت سچ کی ہی ہوگی کیونکہ جو حق ہے، وہی شریعت ہے، وہی خدا کا قانون ہے۔ وہی خدا ہے اور خدا سے بڑا نہ تو دنیا کا کوئی ہائی کورٹ ہے نہ ہی سپریم کورٹ۔''

(افسانہ شاہ بیگم صفحہ 115)

- ایک ناستک پوری طرح پنڈت بن گیا تھا جس کی آتما پر ماتما سے مل گئی تھی۔''

(افسانہ سانپ صفحہ 120)

ابراہیم اشک کے کئی افسانوں میں ممبئی کی فلم نگری کا نمایاں اثر بھی نظر آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

انہوں نے جو افسانے اپنے ممبئی کے بلوریں محل سے باہر جھانک کر تحریر کیے ہیں ان میں مصنوعی پن اور بناوٹ عود کر آئی ہے جبکہ وہ افسانے، جن میں افسانہ نگار کے ماضی کی بازگشت سنائی دیتی ہے، زمینی حقیقت کے بالکل قریب ہیں اور ان کا اثر قاری کے دل و دماغ پر دیر پا رہتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اول الذکر نوع کے افسانے قاری کے جذبات کو شتابی انگیز کرتے ہوں مگر ان کی درازیٔ عمر کی کوئی گارنٹی نہیں ہوتی۔

افسانہ 'جیون دان' خود کہانی کی سرگزشت ہے جو ایک صدی سے ہزاروں قلم کاروں کی محبوبہ بن چکی ہے۔ رومانیوں اور ترقی پسندوں نے اسے رومانیت اور حقیقت پسندی سے روشناس کرایا جبکہ جدیدیوں نے اس کی موت کا اعلان کیا۔ آج وہی کہانی افسانہ نگار کے پاس آکر اسے پناہ مانگ رہی ہے۔ اس کہانی میں خود 'کہانی' استعارہ بن چکی ہے۔

'زندہ تصویر' میں انسانی جذبات کی دلکش مصوری کی گئی ہے۔ مصور علی اپنی تصویریں بیچ بیچ کر ایک لاوارث اور دکھی بچے اشوک کی پرورش کرتا ہے اور اسے بی اے کراتا ہے۔ شومئی قسمت حادثے کے سبب علی کو آپریشن کی ضرورت پڑتی ہے اور اشوک سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس کی تیمارداری میں جٹ جاتا ہے۔ انجام کی پرواہ کیے بغیر اشوک علی کی محبوبہ کی وہ تصویر بیچ ڈالتا ہے جس کو علی نے سنبھال کر رکھا ہوتا ہے۔ اس تصویر سے ملی آمدنی کی بدولت علی کا آپریشن ممکن ہوجاتا ہے۔ صحت یاب ہوکر علی اشوک پر خفا ہونے کے بجائے اس کے جذبات کی قدر کرتا ہے۔ یہی جذبات نگاری افسانہ 'ماں' میں بھی ملتی ہے۔ اس افسانے میں منتوں سے مانگا ہوا بیٹا دیو آشیش اپنی مزدور ماں، جس نے اس کو اپنے خون پسینے سے پالا ہوتا ہے، پر اتنے ظلم ڈھاتا ہے کہ وہ موت کے آغوش میں پناہ لیتی ہے۔ انجام کار قدرت کے قہر سے دیو آشیش کی گرہستی پراگندہ ہوجاتی ہے اور وہ خود گلے کے کینسر میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ اس افسانے کے بارے میں تجزیہ نگار ڈاکٹر فراز حامدی نے کئی اہم سوال اٹھائے ہیں جو جواب طلب ہیں۔ میرے ذہن میں بھی ایک سوال پیدا ہوا ہے وہ ہے کہ اجمیر شریف خواجہ غریب نوازؒ سے منتیں مانگ کر اگر ایسا ہی ناخلف بیٹا پانا تھا تو کاش تلسی وہاں گئی ہی نہ ہوتی! افسانہ 'سرحد' پیار اور ایثار کی خوبصورت کہانی ہے جس میں کویتا فوجی شہاب کی گمشدگی کے دوران اس کی بیوی نجمہ کو ڈھارس بندھاتی رہتی ہے جب تک شہاب واپس گھر نہیں آتا۔ 'ملاپ' افسانہ ہے جاگیردارانہ نظام اور عورتوں کی بے بسی کا جہاں رئیس خاں اپنی بیوی کی خوبصورتی کو نظر انداز کرکے، اپنی نوکرانی سجنی سے اختلاط کرتا ہے جس کے سبب سجنی اس کے بیٹے کو جنم دیتی ہے۔ نتیجتاً رئیس خاں کی زندگی پراگندہ ہوجاتی ہے جبکہ سجنی بدنام ہوجاتی ہے۔ بہت سال بعد وہی لڑکا رئیس خاں کو اتفاق سے سڑک

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

پر ملتا ہے اور وہ اسے گلے لگاتا ہے کیونکہ اس وقت اس کی زندگی میں پیدا ہوئے خلیج کو پاٹنے کے لیے اور کوئی وسیلہ نہیں ہوتا ہے۔

افسانہ 'دھندہ' میں دو نکمے (میری نظر میں عیار) آدمی اپنی برادری کو بیوقوف بنا کر ترقی کے زینے طے کر لیتے ہیں۔ ہندوستانی تہذیب وتمدن میں آرہی گراوٹ اور بدلاو پر مبنی کہانی 'تہذیب' میں افسانہ نگار نے نغمہ کے کوٹھے پر چھارہی تاریکی کو بیان کیا ہے جو خود نغمہ کے مندرجہ ذیل الفاظ سے عیاں ہے۔

'یہ کوٹھا ہے حرام زادو' جہاں پر شہنشاہوں، نوابوں اور ان کے اولادوں نے محفلوں میں بیٹھنے کے آداب سیکھے ہیں۔ زبان وادب سیکھا ہے۔ زندگی کا سلیقہ سیکھا ہے۔ یہ کوئی سستا ہوٹل، کلب یا عیاشی کا اڈا نہیں جہاں تم جیسے نو دولتیئے بھونڈی انگریزی ڈانس کرنے والی لڑکیوں کو دولت کے بل پر اپنے اشاروں پر نچا سکیں۔ یہ غیرت مند نغمہ کا کوٹھا ہے جس کے کردار سے رقص اور موسیقی اپنے معیار اپنی معراج کو پہنچ جاتے ہیں۔''

غور سے دیکھا جائے تو اس تہذیبی تسلط کے لیے سب سے زیادہ ذمے دار فلمیں اور ٹی وی ہیں (جن کے ساتھ خود ابراہیم اشک بھی وابستہ ہیں) ان دونوں اداروں نے ہر گھر میں عریانی، بغاوت اور سازش کے جھنڈے گاڑ دیے ہیں۔ رخسار کی رقص سے مراجعت ایموشنل اتیاچار (جذباتی جبر) ہوسکتا ہے، مگر عقلیتی فیصلہ نہیں ہوسکتا۔ انگریز فلم بنا کر واپس چلا جائے گا جبکہ رخسار کوٹھے والی ہی رہے گی جس کو موجودہ دور کے غنڈے بدمعاش رنڈی، کے نام ہی سے پکاریں گے۔ مجموعے کا ایک اور خوبصورت افسانہ 'بخشش' ہے جس میں ایک کمیونسٹ شاعر اور انٹلکچول کے نظریے اور اس کے عمل کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ غریبوں کا یہ ہمدرد اپنے نوکر 'شرفو' کی نصف تنخواہ پورے پانچ سال سے ہڑپ کر رہا ہے۔ اس افسانہ میں کمیونسٹ صاحب علی کی جس طرح سے کردار نگاری کی گئی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

افسانہ 'بیکری' بڑودہ میں ہوئے بیکری کانڈ کا راست نتیجہ ہے جس کو افسانہ نگار نے تصور اور تصرف کی مدد سے افسانوی روپ دیا ہے۔ یہ افسانہ ملک کے سیاست دانوں اور ان کی کارستانیوں کی دلگداز داستاں ہے کہ ان کے سامنے انصاف بھی داشتہ بن کر رہ گیا ہے۔ اسی افسانے کی دوسری کڑی ہے 'شاہ بیگم' جو شاہ بانو کا افسانوی نام ہے۔ اس افسانے میں شاہ بیگم کا کردار پستیوں کو چھوتا ہوا اور اس کے شوہر کا کردار بلندیوں کو چھوتا ہوا در شایا گیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ 'شاہ بانو' کیس میں سیاسی جماعتوں، غیر حکومتی اداروں (NGO's) اور دیگر مذہبی پیشواؤں نے اپنا اپنا کردار نبھایا اور رائی کا پہاڑ بنا دیا۔ مسئلہ صرف یہ ہے کہ کیا مسلمان مطلقہ

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

عورتوں کو ہر مہینے نان ونفقہ (Maintenance) مل جانا چاہیے یا نہیں؟ کیا وعدہ کیا گیا مہر (بقول افسانہ نگار اس افسانے میں تین ہزار روپے) اس کو موجودہ مہنگائی کے زمانے میں اپنے بچوں کے ہمراہ باقی بچی ہوئی زندگی بسر کرنے کے لیے کافی ہے؟ بڑی سادگی سے بچی کھچی زندگی بسر کرنے کے لیے اسے جتنی رقم درکار ہوگی کیا اس کا خاوند یکمشت ادا کر سکتا ہے؟ کیا مسلم معاشرے میں طلاق شدہ عورتوں کی بہبودی کے لیے کوئی سماجی تنظیم آگے آکر ان کو سوشل سیکورٹی دیتی ہے؟ کیا زکوٰۃ سے اکٹھی کی گئی رقم غریب بے سہارا بیواؤں اور طلاق شدہ عورتوں کے لیے صرف ہوتی ہے یا اینٹ گارے کی مسجدیں بنانے میں کیونکہ پیغمبر اسلامؐ نے یتیموں اور بے بس عورتوں کی دیکھ بھال سچے مسلمان کے لیے اہم فریضہ قرار دیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان مسئلوں پر نرینہ عصبیت (Male Chauvainsm) اور مذہبی جذباتیت کا کافی عمل دخل رہتا ہے۔ البتہ افسانہ نگار سے یہ توقع ہوتی ہے کہ وہ ٹھنڈے دل و دماغ سے ایسے مسئلے پر غور و خوض کریں اور قارئین کو صحیح راستہ سجھائیں۔ اس مسئلے پر میں نے بھی ایک کہانی 'اداس لمحوں کا کرب' (مجموعہ زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی) قلم بند کی ہے۔ جہاں تک شاہ بیگم اور اس کے خاوند کے کردار کا تعلق ہے، ان کی تحقیق میں کتنا ریسرچ ہوا ہے وہ افسانہ نگار کو ہی معلوم ہوگا۔ تواریخی کرداروں کو پیش کرنے میں مغربی رائٹرز ضرورت کے حساب سے ماحول اور کرداروں کی تحقیق کرتے ہیں۔ اس بارے میں میں صرف یہ جانتا ہوں کہ طلاق سے تباہ ہوئی بہت ساری غریب لڑکیاں یا تو ریڈ لائٹ ایریاز کی زینت بن جاتی ہیں یا پھر جان لیوا امراض خصوصاً پاگل پن میں مبتلا ہو جاتی ہیں مگر ان کی آواز سیاسی اور مذہبی اجارہ داروں کے شور و غل کے نیچے دب کر رہ جاتی ہے۔ مسلم تو مسلم، ایسی کتنی غریب ہندو طلاق شدہ عورتیں ہیں جو عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے کے قابل ہوتی ہیں۔ ساری عمر لوگوں کے پھینکے ہوئے ٹکڑوں پر پلتی رہتی ہیں۔

'رام جی کا دکھ' جو مجموعے کا عنوان بھی ہے، بابری مسجد کے انہدام پر لکھی گئی کہانی ہے جس میں رام جی ہنومان کو لے کر سورگ سے نکلتا ہے اور 'مرتیولوک' کا جائزہ لیتا ہے۔ (موازنہ کریں ڈیوائن کامیڈی، انفرنو۔ مصنف دانتے) تکنیکی طور پر اس افسانے میں غلطیاں در آئی ہیں۔ ایک یہ کہ ہنومان بھگوان بدھ کے چنا کی مانند رام جی کا کوچوان رتھ بان نہیں ہے بلکہ اس نے رام اور لکشمن کو اپنے کندھوں پر اٹھا کر لنکا سے ایودھیا لایا تھا۔ دوسری غلطی یہ ہے کہ 'مرتیولوک' اور 'پرتھوی لوک' میں بڑا فرق ہے۔ افسانے میں جن حالات کا ذکر ہوا ہے وہ پرتھوی لوک پر وقوع پذیر ہوئے ہیں نہ کہ 'مرتیولوک' پر۔ ایودھیا تو پرتھوی پر واقع ہے شہر خموشاں کے نقشے پر نہیں ہے۔ ان غلطیوں سے قطع نظر افسانے کا انداز بیاں باقی افسانوں سے ہٹ کر ہے

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

اور دلچسپ بھی۔ اس افسانے میں رام جی ایودھیا کانڈ سے وابستہ اپنے اور ہنومان کے نام پر ہو رہے تانڈو سے سخت خفا ہو جاتے ہیں اور اپنی ناراضگی کا برملا اظہار کر کے واپس سورگ کی طرف کوچ کرتے ہیں۔

افسانہ 'سانپ' قدرتی انصاف (Divine Justice) یا ڈرامائی انصاف (Dramatic Justice) کی کہانی ہے جس میں شیو پجاری کا بیٹا سینکڑوں سانپوں کو مارتا ہے اور آخر کار خود ایک سانپ کے کاٹنے سے چھٹپٹاتا ہے۔ نتیجتاً وہ سانپوں کو مارنا بند کر دیتا ہے اور ناستک سے آستک بن جاتا ہے۔ اگر یہ کہانی 'ماحولیات' کے بارے میں لکھی گئی ہوتی تو بات سمجھ میں آتی ورنہ سینکڑوں سانپوں کا برآمد ہونا اور ان کو مارنا بعید از قیاس ہے۔ اتنے سانپوں کی کھال بیچ کر تو وہ بڑا رئیس بن چکا ہوتا۔ بہر حال دنیا میں کئی ایسے ممالک ہیں جہاں سانپوں کو مار کر خوراک کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ دیکھا جائے تو سانپوں اور دوسرے جانوروں میں کیا فرق ہے۔ پھر دوسرے جانوروں کو مارتے وقت بھگوان ناراض کیوں نہیں ہوتے؟ خود شنکر جی کے نیچے شیر کی کھال بچھی ہوتی ہے اور رام جی اور اس کے ساتھی ہرن کی کھال پہنے گھومتے پھرتے ہیں۔ کیا ان جانوروں کو مارتے وقت بھگوان ناراض نہیں ہوئے؟ بنیادی طور پر اس کہانی میں افسانہ نگار ایشور کے استوہستی اور اسکی عظمت کا ڈنکا پیٹنا چاہتے ہیں۔ اسی طرح مذہبی اعتقاد کو مضبوط کرنے کے لیے ایک اور افسانہ 'خدا کی قسم' کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔ اس افسانے میں حشمت خاں (سود لینا یا دینا جس کے مذہب میں منع ہے!) ایک ساہوکار ماما پنجابی کی بیس ہزار کی رقم ہڑپ کر لیتا ہے۔ ماما پنجابی اس کو گواہوں کے سامنے 'خدا کی قسم' کھانے کو کہتا ہے جس کی تعمیل میں حشمت خاں قسم کھا لیتا ہے اور چھوٹ جاتا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو ماما پنجابی اعتقاد کی وجہ سے خدا کی قسم کا سہارا نہیں لیتا ہے بلکہ روپیہ دیتے وقت وہ مجبور ہوتا ہے۔ ایک طرف رات کے اندھیرے میں عدالتی کارروائی ممکن نہیں ہوتی اور دوسری طرف حرص وطمع اسے سوچنے نہیں دیتی۔ حشمت خاں اسی کا فائدہ اٹھاتا ہے جبکہ ماما پنجابی کے پاس اب 'خدا کی قسم' کے بغیر اور کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ مجھے نہیں معلوم کہ خدا ماما پنجابی ایسے ساہوکاروں سے خیانت کرنے والوں پر ایسے قہر نازل کرتا ہے یا نہیں البتہ حشمت خاں کے بیٹے کو سانپ ڈس لیتا ہے، بیوی ٹی بی میں مبتلا ہو کر مر جاتی ہے دوسرا بیٹا اور داماد قتل کے معاملے میں پھنس جاتے ہیں، فصلیں چوپٹ ہو جاتی ہیں اور کھیت نیلام ہو جاتے ہیں۔ الغرض بیس ہزار کی رقم کے عوض خدا بیلنس شیٹ برابر کر لیتا ہے جبکہ بڑے بڑے صنعت کار آئے دن فرضی کمپنیاں کھولتے ہیں اور دوسرے دن رفو چکر ہوتے ہیں۔ وہ کروڑوں لوگوں کو لوٹ کر دن بدن پھلتے اور پھولتے ہیں اور ان کا بال بھی بیکا نہیں ہوتا۔ قدرتی انصاف کے یہ مشورے شاید بیسویں صدی

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

کے اوائل میں قارئین کو متاثر کرتے رہے ہوں مگر اب ان کو ہضم کرنا قدرے مشکل ہو رہا ہے۔

افسانوی مجموعہ 'رام جی کا دکھ' میں کردار نگاری اعلیٰ درجے کی ہے۔ کئی کردار، چاہے وہ مثبت ہوں یا منفی، ہمارے سامنے جیتے جاگتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً مصور علی (زندہ تصویر) سمیع اللہ (بیکری) تلسی (ماں) نغمہ (تہذیب)، شرفو اور صاحب علی (بخشش) ماما پنجابی اور حشمت (خاں خدا کی قسم) وغیرہ۔ تلسی کے بارے میں تجزیہ نگار فراز حامدی کا یہ کہنا کہ ''ماں تو مامتا کا ساگر ہوتی ہے۔ وہ کبھی بھی اپنی اولاد کو اس طرح بددعا نہیں دے سکتی۔'' ایک اور مثال ہے جس میں بلوریں محل میں رہنے والے مثالیت پسند نظریہ ساز اس عورت کو نہیں پہنچانتے جس نے بیٹے اور بہو کا ظلم و تشدد سہا ہو۔ 'عورت' جب 'مامتا' پر غالب آتی ہے تو اس سے کہیں بڑھ کر شراپ منہ سے ابل پڑتے ہیں۔

ابراہیم اشک نے اپنے افسانوں میں طنز کا بھی بڑی خوبی سے استعمال کیا ہے۔ ملاحظہ ہو چند مثالیں:

- کیوں نہ اسی (ایشور) کے نام پر دھندہ کیا جائے۔ اگر چل گیا تو زندگی بن جائے گی۔

(افسانہ دھندہ)

- کیا وہاں کی پرستھتیاں جنگلوں سے بھی زیادہ خراب ہوگئی ہیں! میں نے تو آپ کے ساتھ چودہ برس کا بن باس جنگلوں، کندراؤں اور گپھاؤں میں بتایا تھا۔ (افسانہ رام جی کا دکھ)

ابراہیم اشک نے افسانہ نگاری کے میدان میں جو پہلا قدم اٹھایا ہے اس میں انہیں کامیابی بھی ملی ہے اور ناکامی بھی۔ البتہ ایک فنکار خود احتسابی سے ہی کاملیت اور پرکاری کی طرف گامزن ہو سکتا ہے۔ اپنے فن کی خوبیوں اور خامیوں کا تجزیہ کر کے اگر وہ آگے قدم بڑھاتے رہیں گے تو میں سمجھتا ہوں کہ اردو ادب کو ایک اچھا افسانہ نگار مل جائے گا بشرطیکہ وہ فلموں کا سایہ اپنی افسانہ نگاری پر پڑنے نہ دیں۔ ابراہیم اشک انسان سے ہمدردی رکھتے ہیں، رجائیت پسند ہیں اور دل کی بات بالراست قاری تک پہنچانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اردو ادب کو ان سے بڑی امیدیں ہیں۔

❖ ❖ ❖

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

افسانوی مجموعہ

لاوا

رحمان شاہی

ایک افسانوی مجموعہ جس نے ابتدا ہی سے میرے دل ودماغ کو سحر زدہ کیا، حال ہی میں ہمہ دست ہوا۔ نام ہے 'لاوا' اور مصنف ہیں رحمان شاہی جو ۲ فروری ۱۹۵۸ء کو پٹنہ میں پیدا ہوئے، پٹنہ یونیورسٹی سے ایم کام کیا اور پھر سرکاری ملازم ہو گئے۔ اس کے علاوہ وہ 'خمار' اور 'نقاد' کی ادارت سے بھی وابستہ رہے۔ سید ظل الرحمٰن (قلمی نام رحمان شاہی) کے اس مجموعے کے بارے میں ڈاکٹر قمر رئیس 'رحمان شاہی آدمی کی تلاش میں' کے عنوان کے تحت اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں: ''تخلیق کار جس کے سروکار بنیادی طور پر انسانی رشتوں سے تعلق رکھتے ہیں، انسان کی باطنی اور خارجی زندگی کے دھندلکوں میں داخل ہو کر درد مندی اور انسانی یگانگت کی روشنی کا متلاشی ہوتا ہے اور اپنے قلم کی قوت سے اسے پھیلاتا ہے..... رحمان شاہی کی کہانیوں میں اسی حیات بخش روشنی کی تلاش کا احساس ہوتا ہے۔''

جیسا کہ مجموعے انتساب سے ظاہر ہے، افسانہ نگار نے سہیل عظیم آبادی کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے حقیقت پسندی اور مقصدیت کو اپنا نصیب العین بنایا ہے۔ وہ ایک طرف غریب پسماندہ لوگوں کی محرومیوں کی عکاسی کرتے ہیں اور دوسری طرف دہشت گردی اور انسانی حقوق کی پامالی کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔ رحمان شاہی کا اسلوب نگارش واضح اور بیانیہ ہے حالانکہ وہ جا بجا علامتوں اور استعاروں کا بھی

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، سن اشاعت: ۲۰۰۸ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

برمحل استعمال کرتے ہیں جیسے افسانہ 'راستے بند ہیں' کی 'بلی'، 'جاڑے کی دھوپ' کے 'چڑا چڑیا'، اور 'بچے لوگ' کا 'شیر'۔ اپنے فن کے بارے میں رحمان شاہی یوں رقمطراز ہیں: ''میں اس بات کا کوئی دعویٰ نہیں ٹھوکتا کہ کہانی سنانا میری عادت ہے، میری خصلت ہے، میرا بچپن کا شوق ہے، میرا مشغلہ ہے یا پھر یہ میری دیوانگی ہے۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ مجھے کہانی سنانی ہے اور میں سب کچھ بھول بھال کر آپ کو موقع بے موقع کہانی سنانے بیٹھ جاتا ہوں۔'' ان کے افسانوں کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ موصوف اپنی آنکھیں کھلی رکھ کر جی رہے ہیں۔ اسی لیے ان کی کہانیوں میں زندہ جاوید کردار پائے جاتے ہیں۔ جو ہمیں کہیں بھی کسی بھی وقت مل سکتے ہیں، دفتر میں، فٹ پاتھ پر، دکانوں پر یا پھر اسٹیشنوں پر۔ وہ ان کے سکھ دکھ میں شریک ہو جاتے ہیں مگر امید کا دامن کبھی بھی نہیں چھوڑتے۔ اسی عینی پہلو کے زیر اثر وہ فرماتے ہیں:

> ''آدمی ہوں، آدمی سے پیار کرتا ہوں۔ سب کچھ اچھا اور بہت اچھا دیکھنا چاہتا ہوں۔ جبر اور تشدد سے خالی سماج، امن اور انصاف پسند نظام، خون خرابے سے محفوظ زندگیاں، دکھ ہو بھی تو آنے والے پل کی خوشی میں لپٹا ہو۔''

زیر نظر مجموعے میں سولہ کہانیاں ہیں۔ پہلا افسانہ 'راستے بند ہیں' کا موضوع معاشرے کی گھٹن ہے۔ معاشرے میں جب احتجاج کے راستے بند کیے جاتے ہیں تو لوگ تشدد کا راستہ اپنانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس افسانے میں یونین لیڈروں کی بالادستی، پولیس کے آتنک اور مزدوروں کی بے بسی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ 'لاوا' ایک نفسیاتی کہانی ہے جس میں ایک کم سن لڑکا انو ذبح ہو رہے مرغے کو دیکھ کر تڑپ اٹھتا ہے کیوں کہ لاشعور میں دبے ہوئے اس کے ابو کا قتل اسے یاد آتا ہے اور ردِ عمل کے طور پر وہ جنونی حالت میں قصائی نجیب اللہ سے یوں مخاطب ہوتا ہے۔ ''مار ڈالوں گا..... ظالم خونی مار ڈالوں گا..... ابو کا قاتل تجھے مار ڈالوں گا۔'' فرقہ وارانہ فسادات کے دوران کم سن بچوں کی نفسیات پر کیا گزرتی ہے، اس کی عکاسی بڑی فنکاری سے کی گئی ہے۔ انو کا کردار لاجواب ہے اور اس کی کردار نگاری میں افسانہ نگار نے نکتہ رسی سے کام لیا ہے۔ افسانہ 'جاڑے کی دھوپ' میں زندگی کی بے ثباتی کو منعکس کیا گیا ہے جبکہ 'آگ' اصول پرستی پر مبنی ایسا افسانہ ہے جس میں قبائل لیڈر لٹو بودرا ستہ کے خلاف جہاد کرنے کو اپنی زندگی کا مدعا بنا لیتا ہے۔ لٹو بودرا کا کردار بھی نہایت فن کاری سے پیش کیا گیا ہے:

> ''حالاں کہ وہ بزدل نہ تھا۔ ہٹا کٹا ایک نر تھا، ماداؤں پر سواری کسنے والا کوئی عام سانڑ نہیں، مکمل اور بھرپور نر تھا۔ دھرتی کی تاریخ بدل دینے والا۔ ایک سنکی، ایک بے جگرا۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

بے حد ذہین اور بے پناہ صلاحیتوں کا مالک۔ بہت حساس، بہت جذباتی اور فطرتاً بے باک اور کسی حد تک ضدی بھی۔ قد کاٹھ اور رنگ کا سانولا تھا۔ بے حد نمکین اور دیکھنے میں عام آدمی باسی نوجوان جیسا لگتا تھا۔''

'گندی نالی' علامتی افسانہ ہے جس کا موضوع ایک جانب پولیس اور ایڈمنسٹریشن کی دھاندلیاں اور رشوت ہے اور دوسری جانب عام لوگوں کی وہ مجبوری جس کے تحت وہ سسٹم کو رَد کرنے کے بجائے اسے قبول کر لیتے ہیں۔ ایک مکالمہ ملاحظہ ہو: ''سماج میں ایسے لوگ بھی ہیں جن پر کسی بھی طرح کی گندگی کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ غلیظ راستوں سے بھی بڑی آسانی سے گزر جاتے ہیں۔'' افسانہ 'مٹھی بھر آسمان' کہانی ہے ایک لاچار مزدور جوگیا کی جو مفلسی سے بدحال ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود اپنی بیوی ستیا کی بے حرمتی برداشت نہیں کر پاتا۔ اس کہانی میں ستیا کا یہ مکالمہ بڑا دلدوز ہے: ''آج نہ روکو ہمرا کے آج نہ روکو.....'' اسی طرح 'انصار بھائی کی چنیا' کا انصار بھی باغی کردار ہے جو سماجی بندھنوں کو نظر انداز کر کے کم ذات بکھو نسل کی بن بیاہی ماں کی بیٹی چنیا سے شادی کر لیتا ہے اور اپنی برادری سے ناتا توڑ کر چنیا کی بستی میں پناہ لیتا ہے۔ انصار بھائی کی کردار نگاری بھی دقیقہ ریزی سے کی گئی ہے اور مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ رحمان شاہی نے افسانوی مجموعے 'لاوا' میں کئی زندہ کردار اردو ادب کو دیے ہیں۔ ان کے کردار زندہ، متحرک اور ارتقا پذیر ہیں جو قاری کے ذہن پر ان مٹ چھاپ ڈالنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ افسانہ 'سلوگن' طنز ہے ہمارے معاشرے پر جہاں کتھنی اور کرنی میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اس کہانی میں ریل گاڑیوں کے حوالے سے محکمے کی اشتہار بازی اور کارکردگی کی تفریق کو نمایاں کیا گیا ہے۔ چند مکالمے غور کرنے کے قابل ہیں۔

- ''سب کے سب سالے بے حس اور بے بہرہ ہیں۔ دوسروں کے رحم و کرم پر زندگی گذارنے والے افراد۔ کبھی سوچتے ہی نہیں کہ آزادی کس کو کہتے ہیں۔ وطن دوستی کیا ہے اور حق یوں جتاتے ہیں جیسے سارا ملک ان کے باپ دادا کی جاگیر ہے۔''
- میرا ایسا سوچنا غلط نہیں۔ جس دیش کے ان گنت حصے ابھی اٹھارویں شتابدی میں بھی نہیں پہنچے ہوں وہ دیش اکیسویں شتابدی میں کیسے جا سکتا ہے۔
- وہ سارے گاؤں بھی ہیں جہاں کے باشندے آزادی کے چالیس سال بعد بھی ایک گھڑا پانی کے لیے دس دس کوس پیدل چلتے ہیں اور رات کے اندھیرے کو مٹی کے تیل کا دیا جلا کر دور کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

محولہ بالا اقتباسات سے یہ صاف ظاہر ہے کہ افسانہ نگار سیاسی رہنماؤں اور انتظامیہ (بیوروکریسی) کی کھوکھلی نعرہ بازی کو ننگا کرنے کی درپے ہیں کیونکہ انہیں یہ علم ہے کہ یہ دونوں طبقے ایک دوسرے پر نزبھر ہیں، اس لیے عام لوگوں کی بہبود کے لیے کم اور اپنی طاقت اور اقتصادی حال کو مضبوط کرنے کے لیے زیادہ کام کرتے ہیں۔ گذشتہ ساٹھ سالوں کے دوران یہ دیکھا گیا ہے کہ جہاں ملک ترقی کی بلندیوں کو چھونے لگا ہے وہاں کسانوں، مزدوروں اور قبائلی طبقوں کی حالت اب بھی خستہ ہے۔ امیروں اور غریبوں کے بیچ کی کھائی بڑھ گئی ہے یہاں تک کہ کمیونسٹ سیاست داں بھی اب ابن الوقت بن چکے ہیں جو مارکسزم کو خیر باد کہہ کر بنگال اور ترپورا میں درگا پوجا پر کروڑوں روپے خرچ کرتے ہیں اور کیرالہ میں شرعی بنک بنانے کی باتیں کرتے ہیں جبکہ بنگال کی صنعتی ترقی اور خوشحالی کے لیے کوئی بھی قدم نہیں اٹھایا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ افسانے میں ایسا مکالمہ پڑھنے کو ملتا ہے ''بھئے وا! یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ غریبوں اور مزدوروں کی بات کرنے والا آدمی کمیونسٹ ہی ہو.....'' اس افسانے میں افسانہ نگار نے کرداروں کے نام دینے کے بجائے ان کی پہچان کے حوالے سے ان کو مخاطب کیا ہے جیسے 'نیلی شرٹ والے نوجوان' اور 'ادھیڑ عمر کی آدمی'۔ ظاہر ہے کہ اس افسانے میں جدیدیت کا اثر صاف طور پر دکھائی دیتا ہے۔

'شیر اور چوہے' کی اسطوری کہانی سے متاثر ہو کر رحمان شاہی نے 'بچے لوگ' رقم کی ہے جس میں نہ صرف یہ باور کیا گیا ہے کہ راجہ اور پرجا کو ایک دوسرے کے ساتھ اشتراک کرنا چاہیے بلکہ [illegible] تنبیہ کیا گیا ہے کہ سماج میں استحصالی عناصر ہر دم ابھرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ہمیں ان سے ساودھان رہنا چاہیے۔ افسانے کا اختتام بھی فکر انگیز ہے: ''ابھی جنگل کے جانوروں نے شیر سے نجات کا جشن بھی نہیں منایا تھا کہ اس جنگل میں ایک اور شیر پیدا ہو گیا اور پھر..... پھر وہی سب ہونے لگا، جو پہلے ہو رہا تھا۔'' افسانہ 'سانپ کا پھن پکڑنے والا' سیاست دانوں کی ان کارستانیوں سے نقاب اٹھاتا ہے جن کے سبب ہمارا سماج فرقہ واریت کے گھناونے جال میں پھنس چکا ہے۔ اسی طرح 'زہر' استحصال زدہ لوگوں کی بے بسی اور بے عملی کی داستاں ہے کہ شکورے پر ہوئے ظلم کو دیکھ کر بھی ان دیکھا کیا جا رہا ہے۔ 'ویرانے کا سبز پرندہ' نفسیات پر مبنی کہانی ہے جس میں گورے اپنی فلرٹ بیوی کو برداشت تو کرتا ہے مگر آخر میں اپنے آپ کو تنہا پا کر یوں گویا [illegible] ''تنہائی مجھے بہت بہت کاٹتی ہے ساب..... کتے ما فک بھنبھوڑتی ہے ساب..... روپ متی اور منا بنا اب نہیں جیا جاتا.....''

'سیل' عصری تناظر میں لکھا گیا ایک اور خوبصورت افسانہ ہے جس میں شیخو بابا کو، جس نے اپنی ساری زندگی حب الوطنی کے لیے وقف کی ہے، پولیس دہشت گردوں کی مدد کرنے کی پاداش میں حراست میں لیتی ہے کیونکہ وہ مسلمان ہے اور اس کے علاقے میں دہشت گرد کارروائی کا شبہ ہوتا ہے۔ موجودہ

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

دور کا یہ سب سے بڑا المیہ ہے کہ سیاست دانوں نے مسلم فرقے میں غیریت (Alienation) پیدا کرنے کی دن رات کوشش کی ہے جبکہ بنیادی مسئلے کے تدارک کی طرف کوئی دھیان نہیں دیتا۔ 'شیخو بابا' معصوم نہتے لوگوں کا نمائندہ کردار ہے جو گجرات کا مسلمان بھی ہوسکتا ہے، پنجاب کا سکھ بھی ہوسکتا ہے اور کشمیر کا ہندو بھی ہوسکتا ہے۔ تبھی تو شیخو بابا گرج دار آواز میں چلاتا ہے۔ ''میرے ہم وطنوں کو کہنا..... کہنا اس ملک سے صرف گوروں کی واپسی ہوئی ہے.....'' ان الفاظ میں مجھے بھگت سنگھ کی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔

'وہ روشنی' بھی کرداری افسانہ ہے جس میں لاوارث اپاراؤ کا کردار اس کے نفسیاتی پس منظر میں بڑی فنکاری سے ابھارا گیا ہے۔ بے نام وجود اپاراؤ کی شخصیت میں بغاوت اور غصہ کوٹ کوٹ کر بھر دیتا ہے جس کے سبب وہ نڈر مزدوروں کا لیڈر بن جاتا ہے۔ تاہم وہ مزدوروں کی کسمپرسی کو دیکھ کر انہیں ہڑتال کا جنونی راستہ اپنانے سے روکنے کی کوشش کرتا ہے مگر ناکام ہو کر اکیلا پڑ جاتا ہے اور اپنی ماں کی گود میں شرن لیتا ہے لیکن وہ بھی اسے چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ 'افسانہ دھوپ کا سائبان' جذباتی افسانہ ہے جس میں فرقہ وارانہ فسادات کے دوران ایک مسلمان اپنی جان پر کھیل کر دو ہندو کمسن لڑکیوں کو بچانے میں کامیاب ہوتا ہے 'دُش چکر' کہانی ہے اس واقعے کی جس میں دو دوست کھیل کھیل میں لڑائی پر اتارو ہوتے ہیں اور یہی جھڑپ بلوے اور قتل و غارت کا روپ لیتی ہے مگر انسان کی مجبوریوں کو مفلس بوڑھے اور بڑھیا کے درمیان ہوئے مکالمے سے ظاہر کیا گیا ہے۔

- بڑھیا بوڑھے کے ارادے کو بھانپ گئی۔ وہ گھبرا کر ۔ ۔ ''آج مت نکلو، مارے جاؤ گے۔''
- ''ارے ہم زندہ ہی کب ہیں۔'' بوڑھا دھیرے سے بولا اور طاق پر سے المونیم کے کٹورے کو اٹھا کر میلے کچیلے تھیلے میں رکھا، لاٹھی اٹھائی، پھر تھیلے کو کاندھے پر لٹکایا اور باہر نکل گیا۔

آخر میں اس مجموعے پر لکھے گئے شان الرحمٰن کے یہ تاثرات پیش کرتا ہوں:

''وقت کے بدلتے تیور کے باوجود انہوں نے ان گمراہ کن رجحانات سے اپنا دامن ہمیشہ بچائے رکھا جن سے سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے بہت سارے فنکاروں نے اپنی ذات کو جوڑا۔ رحمان شاہی کے افسانے زمانے کے عروج و زوال، وقت کے بدلتے ہوئے مزاج سے سمجھوتا نہ کر کے انہیں جانب اشارہ کرتے ہیں جنہیں صحت مند ادب کی پہچان سمجھا جاتا ہے۔''

❖ ❖ ❖

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

کوئی چارہ ساز ہوتا

ــــــ ڈاکٹر رینو بہل

'کوئی چارہ ساز ہوتا' ڈاکٹر رینو بہل کا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے ان کے دو مجموعے 'آئینہ' اور 'آنکھوں سے دل تک' ۲۰۰۱ء اور ۲۰۰۵ء میں بالترتیب شائع ہو چکے ہیں۔ افسانہ نگار کے بارے میں ڈاکٹر شمع افروز زیدی پیش لفظ میں یوں رقم طراز ہیں: ''رینو بہل کو اردو سے جنون کی حد تک عشق ہے۔ اس لیے ستائش اور صلے کی پرواہ کیے بغیر کہانی کہنے میں مصروف رہتی ہیں۔ بھلے ہی ان کے فن کو کوئی سراہے یا نظر انداز کرے۔ ان کا کام تو بس لکھتے رہنا ہے۔ اگرچہ چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھتی ہیں لیکن عورت ذات کو اپنے حصار میں رکھتی ہیں کہ عورت ہونے کے ناطے جتنی خوبصورت اور حقیقی عکاسی ایک عورت کر سکتی ہے، مرد کے بس کی بات نہیں ہے۔''

ڈاکٹر رینو بہل کی کہانیوں کے موضوعات عام طور پر عشق و محبت، ایثار و بے نفسی، فلرٹیشن، مکاری و جعلسازی، سماجی بے ظابطگیاں، انسانی نفسیات اور جنسی کجرویاں ہیں۔ انہوں نے جہیز، نشہ بازی اور مخلصی موت (Mercy Killing) جیسے اہم موضوعات پر بھی اپنا قلم اٹھایا ہے۔ وہ اپنے کردار زیادہ تر سماج کے متوسط طبقے سے چن لیتی ہیں جو گوشت پوست کے بنے ہوتے ہیں اور جن میں بہیمی جبلت بھی ملتی ہے اور انسانی حساسیت بھی۔ یہ ایک ایسا طبقہ ہے جو ایک جانب روایتی قدروں کا پاسدار ہے اور دوسری جانب آسمانوں پر

ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج نئی دھلی ۱۱۰۰۰۲
سن اشاعت: ۲۰۰۸ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

کمندیں بھی پھینکنا چاہتا ہے۔ رینو بہل کے یہاں تانیثی تحریک کی شدت تو دکھائی نہیں دیتی البتہ ان کے افسانوں کا محور عورت ہی ہوتی ہے۔ اسی عورت کے بارے میں وہ فرماتی ہیں۔ ''اس کے ساتھ یہ کون سا نیا ہونے جا رہا تھا۔ صدیوں سے یہ ہی تو ہوتا آیا ہے عورت ذات کے ساتھ۔ اسے ہی اپنے ارمان، حسرتیں، خواہشیں کچل دینی پڑتی ہیں اور باقی کی زندگی سسکیوں، ناامیدیوں اور سمجھوتوں میں ہی بسر ہو جاتی ہے۔'' (افسانہ پانچ منٹ)۔ بہر حال رینو بہل کی عورت صرف ابلا ناری نہیں ہے۔ بہل کو جب اپنے پاس پڑوس پر نظر پڑتی ہے تو عورت کے کئی بدصورت اور مکروہ روپ نظر آتے ہیں جنہیں وہ ٹینا (ایک خط) اور نشا (پس آئینہ) کی شکل میں پیش کرتی ہیں۔

مجموعہ کے بیشتر افسانے پیار محبت کی کہانیاں ہیں۔ 'پانچ منٹ' میں پارو جبری شادی سے چھٹکارا پانے کے لیے پردیس جا کر طلاق لیتی ہے اور پھر اپنے معشوق پمی سے شادی کر لیتی ہے۔ 'چارہ گر' کی سسٹر جولی ایک مریض پر فریفتہ ہو کر جاتے سمئے اس کو ایک نوشتہ بھیجتی ہے جس پر لکھا ہوتا ہے ''آئندہ زیادہ دنوں کے لیے بیمار ہو کر آنا۔'' افسانہ 'وہ' میں ساکشی ایک انجانے ہم سفر کے عشق میں گرفتار ہو کر پہلے دفتری کام میں لاپرواہی برتتی ہے اور بعد میں آفس دیر سے پہنچ جاتی ہے جس کے باعث اسے باس کی ڈانٹ کھانی پڑتی ہے۔ 'پھسلن' میں امیر رگھو متوسط درجے کی چترا سے عشق کا ڈھونگ رچاتا ہے، اس کے جسم سے محظوظ ہونے کے لیے اس کو اپنے دوست کے گھر لے جاتا ہے مگر چترا اس کے ارادوں کی بھنک پاتے ہی بھاگ جاتی ہے۔ 'دھند' کہانی ہے مونا کی جو اپنے عاشق سے گفتگو کرنے کے لیے اس کے دوست کی گاڑی میں بیٹھ جاتی ہے گو دھند میں کچھ نظر نہیں آتا ہے تاہم وہ اپنے بھائی کی آواز پہچان کر وہاں سے فرار ہو جاتی ہے۔ 'اوس کا لمس' میں عادل سکسینہ ایک خوبصورت لڑکی کو پارٹی میں دیکھ کر اس کا دیوانہ ہو جاتا ہے مگر آخر کار اسے معلوم ہوتا ہے کہ چترا 'گونگی' ہے۔

نفسیات پر مبنی کہانیوں میں ڈاکٹر رینو نے انسانی جبلت کو مختلف رنگوں میں پیش کیا ہے۔ 'خطاوار ہم نہیں' میں ایک شادی شدہ جوڑا اپنے لڑکپن کے تجربے ایک دوسرے کو سناتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لڑکی اپنے ٹیچر پر عمر کے تفاوت کے باوجود مرمٹتی تھی جبکہ لڑکے کا جنسی ابال ایک ادھیڑ عمر کی عورت نے ٹھنڈا کیا تھا۔ افسانہ 'معصوم گناہ' میں حسد کی آگ میں جل کر آنندی اپنی ذہین سہیلی کی زندگی کا رخ موڑتی ہے اور اس کو تباہی کے دہانے پر کھڑا کر دیتی ہے۔ 'چوڑیاں' میں ایک عورت کی قربانی کا مذاق اڑایا جاتا ہے اور جب اس کی پیٹھ بستر سے لگ جاتی ہے تو اس کا دیور اس کی کلائیوں میں چوڑیاں پہناتا ہے جن کے لمس

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

سے وہ صحت یاب ہو جاتی ہے۔ افسانہ 'ہزاروں خواہشیں ایسی' میں ایک غریب ٹیچر اپنی جنسی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے اپنے سوتیلے داماد کو پھانس لیتی ہے کیونکہ اس کی غریبی کا فائدہ اٹھا کر ایک دولت مند بوڑھا اسے شادی کر لیتا ہے۔ 'ابھی تو میں جوان ہوں' میں ایک خوش مزاج آدمی ریٹائرمنٹ کے بعد بھی خوشنما لڑکیوں پر لٹو ہو جاتا ہے مگر ان کے منہ سے 'بھائی صاحب' سن کر دل مسوس کر رہ جاتا ہے۔ 'کھو گئے ہو کہاں' دو یتیموں کی کہانی ہے جو ایک دوسرے سے بے انتہا محبت کرتے ہیں یہاں تک کہ شوہر بیوی اور بچے کی خوشحالی کے لیے غبن کر لیتا ہے اور پھر لاپتہ ہو جاتا ہے۔ بیوی اسی کی نوکری پا کر دھیرے دھیرے سارا قرضہ اتارتی ہے کیونکہ اسے یقین ہے کہ اس کا شوہر مجبور تھا مگر بے ایمان نہیں تھا۔

افسانہ 'ایک خط' میں عورت کا گھناونا چہرہ سامنے آتا ہے۔ ایک شریف لڑکا جب امیر لڑکی ٹینا کی پیش قدمی کو روکتا ہے تو لڑکی بپھر کر ہنگامہ کھڑا کرتی ہے اور اس کو پولیس کے حوالے کرتی ہے جس کا اعتراف وہ اپنے خط میں اپنی معشوقہ سیمی سے کرتا ہے۔ اسی طرح 'پس آئینہ' میں پردیس سے لوٹے ہوئے دوست کی پراپرٹی ہتھیانے کے لیے نشا اپنے شوہر سجل کے مشورے پر سنیل کا بستر گرماتی ہے اور وہ اس دام میں پھنس کر اپنا مکان ان کے نام کر دیتا ہے۔

ڈاکٹر بہل کے افسانوں میں سماجی مسائل پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ 'ہم بھی کبھی انسان تھے' میں نوجوان کی شکل اختیار کر کے ایک روح اپنے بچوں سے لٹی ہوئی عورت اور اس کی بیٹی کو خودکشی کرنے سے روکتا ہے اور ہدایت کرتا ہے کہ وہ اپنے حق کے لیے لڑیں۔ 'کوئی چارہ ساز ہوتا' میں کینسر سے جوجھ رہا مانو اپنے بچپن کی ساتھی ریما کے شوہر چندر رانا سے چوہے مارنے کی دوا لانے کی درخواست کرتا ہے تاکہ وہ اس دردناک زندگی سے چھٹکارا پا سکے۔ 'پشیمان' کہانی ہے دوسری عورت کی جو لاولد ہوتی ہے اور شوہر کے مرنے کے بعد سوکن کو اپنے بچوں سمیت خوشحال دیکھ کر پشیمان ہوتی ہے۔ 'ہاتھوں کی لکیریں' میں ایک عورت بہت انتظار کے بعد صاحب اولاد ہو جاتی ہے لیکن اسی اولاد کو کھو کر تباہ ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر بہل اپنے افسانوں کے ذریعے کئی سوال اٹھاتی ہیں۔ افسانہ 'ہزاروں خواہشیں ایسی' میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دوش کس کو دیں؟ اشوک شرما کو جو سجاتا کی غربت کا استحصال کر کے، عمر کے تفاوت کے باوجود، اسے شادی کر لیتا ہے مگر اس کی جنسی ضروریات پوری نہیں کر پاتا یا پھر سجاتا کو جو جنسی تشنگی کے سبب اپنے سوتیلے داماد کو ورغلاتی ہے۔ کیا 'پانچ منٹ' میں اس ماں باپ کو الزام دیں جنہوں نے راجپوتی آن بان کی خاطر اپنی بیٹی کی بلی چڑھائی یا پھر پارو کو مورد الزام ٹھہرائیں جو اپنے معصوم خاوند سے دغا کر کے واپس

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

اپنے عاشق کی آغوش میں پناہ لیتی ہے۔اسی طرح مخلصی موت (Euthanasia) پر لکھا ہوا افسانہ ایسا ایک سوال کھڑا کرتا ہے جس کی گونج آج کل ہر طرف سنائی دیتی ہے۔

مجموعی طور پر زیر نظر مجموعے میں فن کی پختگی اور مشاہدے کی عمق صاف طور پر نظر آتی ہے۔رینو بہل سلیس اور رواں زبان استعمال کرتی ہیں اور عام فہم ہندی الفاظ کو اپنے افسانوں میں نگینوں کی طرح جڑتی ہیں۔تحریر میں البتہ کہیں کہیں عجلت پسندی کا شائبہ نظر آتا ہے جس کی طرف توجہ کی ضرورت ہے۔میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ڈاکٹر رینو بہل نے اپنے فکر انگیز افسانوں کی وساطت سے عصری ادب میں اپنے لیے بلند مقام حاصل کیا ہے۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

تم نے جفا بھی کی تو صنم مدتوں کے بعد

اقبال مہدی

اقبال مہدی کا تیسرا افسانوی مجموعہ 'تم نے جفا بھی کی تو صنم مدتوں کے بعد' گذشتہ سال منظر عام پر آچکا ہے۔ اس سے پہلے موصوف کے دو اور مجموعے 'درد آتا ہے دبے پاؤں' اور 'تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے؟' بالترتیب ۱۹۹۹ء اور ۲۰۰۲ء میں شائع ہو چکے ہیں۔ اقبال مہدی کے افسانے پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ لکھنؤ کا قدیم سکول پھر سے زندہ ہو چکا ہے۔ ان کے پلاٹ عام طور پر مسلم معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں بالخصوص متوسط طبقے سے۔ وہ زیادہ تر بیانیہ ہی سے کام لیتے ہیں اور بلا واسطہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کی زبان بیگماتی زبان کی یاد تازہ کرتی ہے۔ وہی روانی، وہی مکالمے اور وہی محاورے۔ اقبال مہدی اپنی نثر کو نفیس اور برمحل محاورات سے ایسے سجاتے ہیں کہ لگتا ہے یہ محاورہ صرف اسی تحریر کے لیے اختراع ہوا تھا۔ ان کے افسانوں میں نہ تو ترقی پسندی کا شائبہ ہے اور نہ ہی جدیدیت کی کارستانی۔ البتہ حقیقت پسندی اور مقصدیت صاف جھلکتی ہے۔ چنانچہ وہ سماجی موضوعات پر قلم اٹھاتے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ ہم عصر سماجی مسائل کو زیر بحث لایا ہوگا۔ اکثر و بیشتر افسانوں میں تعلیم نسواں، جہیز کی بدعت، کثیر الازدواجی رجحان، عورتوں کی کسمپرسی، ان پر ڈھائے جا رہے مظالم اور اقدار کی شکست و ریخت جیسے موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولا مارکیٹ دریا گنج، نئی دہلی ۲ سن اشاعت: ۲۰۰۷ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

افسانہ 'دل پہ جو برسے عذاب ہجر کے سنگ' میں ایک ماں آمنہ بیگم کو اپنے بچوں میں رہ کر بھی کہیں اپنا پن نظر نہیں آتا۔ اس لیے بوکھلاہٹ میں اعلان کرتی ہے۔ ''بس تم لوگوں پر ایک قرض چھوڑ گئے ہیں۔ تمہاری ماں کا۔ اب جس طرح چاہو بانٹ لو، چاہو تو میری قسط مقرر کر کے باری باری اپنے پاس رکھ لو .....''۔ 'نانی آپا' میں افسانہ نگار شفقت کی پیکر اس نانی کا کردار پیش کرتے ہیں جو بھولی بھی ہے اور شگفتہ مزاج بھی، بچوں کو کہانیاں بھی سناتی ہیں اور ان کو سر بھی چڑھاتی ہیں، کبھی روٹھ جاتی ہیں اور کبھی مان جاتی ہیں لیکن جب وہ راہ عدم اختیار کرتی ہیں تو سارے گھر میں ویرانی سی چھا جاتی ہے۔ 'شادی کی سالگرہ' میں ایک طرف بیٹی نائلہ چاہتی ہے کہ اس کا کوما میں مبتلا باپ جلدی سے مر جائے تا کہ وہ فراغت پائے اور دوسرے طرف گھر کا نوکر رحمت اپنے مالک کا درازی عمر کے لیے دست بدعا ہوتا ہے اور اس کی جی جان سے خدمت کرتا ہے۔ لیکن اس کے خلوص کو گھر کے افراد خود غرضی سے تعبیر کرتے ہیں۔ افسانہ 'دل وہ مریض ہے جو ابھی زیر غور ہے' مجنون عاشق نواب پتن کی داستاں ہے جو بچپن ہی سے ایڈیپس کمپلیکس (Oedipus Complex) میں گرفتار ہونے کے باعث اپنی عمر سے کافی بڑی عورتوں سے عشق لڑاتا ہے اور جب حج کا فریضہ انجام دیتا ہے تو پروردگار سے یہی دعا مانگتا ہے کہ ''تو پھر مجھے چار چھ سال کا لڑکا بنا دے۔'' بچپن کے کھو جانے کا ڈر تو ہر انسان کو لگا رہتا ہے مگر نواب پتن کے ہاں یہ ایک اعتراف (Confession) کا روپ اختیار کرتا ہے۔ 'شناخت کی صلیب' میں سن 1984ء کے دنگوں کے پس منظر میں کرن سنگھ کا لہولہان ہونا اور مرتے دم اپنی مسلمان پڑوسن سلامتی ماسی کو اپنی اکلوتی بیٹی امرت کور سونپ دینا بڑے ہی دلگداز انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ افسانہ 'مستعار آنکھیں' میں آنکھیں ٹرانسپلانٹ ہونے کے باوجود زیدی کو اپنا دروں ملامت کرتا ہے۔ 'آقا زادی' میں نوابوں کے طرز رہن سہن سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔ اس افسانے پر محاورہ 'رسی جل گئی پر بل نہیں گیا' مصداق آتا ہے۔ افسانے میں چھوٹی بیگم اپنے میاں چھوٹے نواب کی خوشنودی کے لیے اپنا مال و اسباب یہاں تک کہ زیور بھی بیچ ڈالتی ہے مگر اس کے باوجود اپنے گھر کی نیلامی کی خبر سن کر آخری ہچکی لے لیتی ہے۔ 'پریم بیل' کہانی ہے ایک بے لوث اور پر خلوص نرس کی، جو خدمت اور محبت کو اپنا پیشہ سمجھتی ہے لیکن اپنی بدنامی کے بارے میں سن کر نوکری سے استعفیٰ دے دیتی ہے۔ افسانہ 'پیاس کانٹوں کی طرح زیب گلو' ایک باغی مگر ذکی اور تعلیم یافتہ عورت صبوحی کی کہانی ہے جو شادی کی رات بیڈروم میں رکھی اپنے شوہر کی گرل فرینڈ کی تصویر دیکھ کر اہانت محسوس کرتی ہے۔ اس لیے بغاوت پر اتر آتی ہے۔ 'محافظ' میں اکیلی لاچار لڑکی فوزیہ رام بائی کی بیٹی لاجو کا حشر دیکھ کر دکھی ہوتی ہے۔ وہ

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

کمر کس کر اپنے ابّا کی تجہیز و تکفین کے لیے دوسروں سے مالی امداد لینے سے انکار کرتی ہے اور خود اپنی جیب سے روپیہ نکال کر سامنے رکھ دیتی ہے۔ بہر حال علی بھی اس کا ہاتھ تھام لینے کے لیے پہنچ جاتا ہے۔

'لوگ پہچان نہ لیں خود کو بچائے رکھیے' ایک طنزیہ افسانہ ہے جس میں پروفیسر کیفی کی بیوی اس بات پر مصر ہوتی ہے کہ وہ بھی اس بار غیر ملکی دورے پر پروفیسر کے ہمراہ جائے گی اور شوہر کا لکھا ہوا مقالہ وہاں پڑھ کر سنائے گی۔ ادھر بیگم عباسی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے شوہر کے سنگ ریسرچ اسکالر بن کر غیر ملکی محفلوں میں شرکت کرتی ہیں۔ 'تریاق' یوسف خان کی کہانی ہے جو ایک ظالم پٹھان کی بیٹی مہر النساء کے عشق میں گرفتار ہو کر طرح طرح کی اذیتیں برداشت کرتا ہے۔

'منجھلی دلہن' میں منجھلے نواب طوائف ستارہ جان کی زلفوں کے دام میں گرفتار ہو کر اپنی بیگم کو نظر انداز کرتا ہے اور اس موقعے کو غنیمت جان کر نواب کے رشتے کا بھائی اختر زمانی منجھلی دلہن پر ڈورے ڈالنے چلا آتا ہے مگر وہ بڑے حوصلے اور استقلال کا مظاہرہ کر کے اسے دھتکارتی ہے اور اپنی لکھوری اینٹوں کے حویلی کی بے حرمتی نہیں ہونے دیتی۔

'کھوکھلے لوگ' زخمی انا کی دلچسپ کہانی ہے جس میں خلیق صاحب اپنی گھر کی نوکرانی کامنی، جو اس کی بیوی کے پاس امانت ہوتی ہے، کو اپنی ہوس کا شکار بنانے کے ارادے سے ڈھونڈنے لگتا ہے اور اس کو اپنے بیٹے صدف کے ساتھ ہم آغوش پاتا ہے۔ نتیجے میں دوسرے دن کامنی پر فاحشہ کا الزام لگا کر گھر سے نکال دیتا ہے۔ افسانہ 'منھ پھیر کر قریب سے دنیا گذر گئی' میں قاسم اور اس کی بیوی اپنی بڑی بیٹی صابرہ کی فکر میں پریشاں ہیں کیونکہ جہاں منگنی ہوتی ہے وہاں ٹوٹ جاتی ہے۔ چھوٹی بیٹی بیلہ کو بھی مجبوراً شادی کرنی پڑتی ہے کیونکہ ان کے سسرال والے انتظار کرنے کے حق میں نہیں ہوتے۔ ادھر ایک چالیس سالہ آدمی تھوڑی دلچسپی دکھاتا ہے تو غنیمت جان کر اس کی اور دیکھنے لگتے ہیں۔ شومیٔ قسمت یہ کہ وہ بھی لالچ میں آ کر منہ پھیر لیتا ہے۔ حالانکہ صابرہ نے تعلیم حاصل کر کے اپنی تقدیر سے سمجھوتا کیا ہوتا ہے لیکن جب اس کا باپ یہ مژدہ سناتا ہے تو پھر کریوں گویا ہوتی ہے۔

> ''میرے ابّا۔ لڑکیاں پہاڑ نہیں ہوتیں۔ بیٹیاں تو اس نازک شاخ کی طرح ہوتی ہیں جن پر ماں اور باپ کے شاداب پھول ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ ابّا جی! بیٹیاں سینے پر مونگ نہیں دلتیں۔ وہ تو ماں باپ کی پلکوں پر رکھے اشکوں کی طرح ہوتی ہیں کہ وہ ذرا سا اشارہ کریں تو وہ ٹوٹ کر قدم بوس ہو جائیں!!!''

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

'تم نے جفا بھی کی تو صنم مدتوں کے بعد' کی صوفیہ بچپن میں کھلنڈری اور بے فکر ہوا کرتی تھی مگر شادی فوجی بریگیڈیر حامد کے ساتھ ہونے کے سبب اسے ہر بات پر ڈسپلن کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس کے باعث وہ مرجھا جاتی ہے۔ اس بات کا اعتراف وہ اپنے بچپن کے محبوب سے مدتوں بعد کرتی ہے۔ 'انتقام' ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جو اپنی سوتن کے بچوں کو شفقت اور مامتا سے جیت لیتی ہے یہاں تک کہ وہ اپنی ماں کو ہی بھول جاتے ہیں۔ 'آج بھی مصر کے بازار میں ہوں' کی آمنہ اپنے والد اور سوتیلی ماں کی مجبوریوں کو مدنظر رکھتے ہوئے یاور علی سے قطع تعلق کر کے احمد کو اپنا لیتی ہے مگر پھر بھی اس کا احساس گناہ اسے ہمیشہ کچوٹتا رہتا ہے۔ وہ آج بھی اپنے آپ کو مصر کے بازار میں بک رہی کنیز کی طرح محسوس کرتی ہے۔ افسانہ 'کیوں گردش مدام سے گھبرا نہ جائے دل' سجاد حیدر کی دکھ بھری زندگی کی داستاں ہے۔ وہ اپنے روایتی بھائی نواز حیدر کے بمقابل بڑا ترقی پسند ہوتا ہے اور انگلینڈ جا کر تعلیم حاصل کرتا ہے مگر والد کی فرمانبرداری کے لیے آیرش معشوقہ کو چھوڑ کر رشتے کی لڑکی سے شادی کرتا ہے۔ اس کے باوجود بدقسمتی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ پہلے بیوی اور پھر بیٹا مر جاتے ہیں اور آخر میں بیٹی آفریں یہ کہہ کر فرار اختیار کرتی ہے کہ اس کا باپ کمزور تھا۔ اس لیے محبت میں ثابت قدم نہ رہ سکا۔ آخر میں وہ بھی پتا کی دل آزاری کا خیال کرتی ہے اور لوٹ آتی ہے مگر اس کا والد داعی اجل کو لبیک کہہ چکا ہوتا ہے۔ افسانہ 'آشتی' میں نازلی، جو ابالی طبیعت کی مالک ہوتی ہے، پروفیسر ندیم سے شادی کرتی ہے جبکہ اس کی بہن آشتی، جو سنجیدہ طبیعت کی ہوتی ہے، ایک بار اُن کے گھر میں آ کر ندیم کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہے جس وجہ سے نازلی کو پریشانی ہوتی ہے۔ البتہ ڈاکٹر ندیم آشتی کو گھر بھیجتے وقت بہن بنا کر اسے ہدایت کرتا ہے کہ وہ ایک اچھا سا گھر بسائے اور دعا کرتا ہے کہ اسے اچھا سا شوہر مل جائے۔

'پگلی' کہانی ہے قسمت کی ستائی ایک لڑکی کی جس کے باپ اور سوتیلی ماں نے اس کو پاگل پن کے دہانے پر لا کھڑا کیا جبکہ اس کا بھائی پروفیسر حامد علی امریکہ میں نفسیاتی امراض پر تحقیق کر رہا ہے۔ پروفیسر کے مرنے کی خبر اخبار میں چھپتی ہے تو پگلی راوی کو اس کا فوٹو دکھا کر یہ کہتی ہے کہ اب اس کا بھائی واپس آ رہا ہے اور اس کا علاج کرے گا۔ افسانہ 'خنجر کو رگِ گلو کی تلاش ہے' میں ایک لڑکی جو گجرات کے دنگوں میں والدین کے قتل کے بعد اٹھائی جاتی ہے اور دور لے جا کر بیاہی جاتی ہے سسرال والوں کی بدتمیزیوں اور بدزبانیوں کے باوجود ماں بن جاتی ہے اور دھیرے دھیرے اپنی تقدیر کے ساتھ سمجھوتہ کرتی ہے لیکن پھر بھی دیش سے باہر گئے اپنے بھائی کو یاد کرتی ہے جبکہ اس کے ملنے کی امید بھی نہیں ہوتی ہے۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

'آتی ہے کسی طرف سے صدا بازگشت کی' میں شاداب اپنی بیگم کو دل و جاں سے محبت کرتا ہے اس کے باوجود اس کے بانجھ ہونے کے باعث اپنی نوکرانی کی کوکھ بھر کر بچہ حاصل کر لیتا ہے۔ بیگم شاداب بچے کو گود میں اٹھاتے ہی اس کی چھٹی انگلی دیکھ لیتی ہے جو شاداب کی نشانی ہوتی ہے اس لیے پریشان ہو جاتی ہے۔ کرائے کی کوکھ (Surrogate Mother) پر لکھا گیا خوبصورت افسانہ ہے۔ 'آفتاب' کہانی ہے ایک ماڈل زلیخا کی جو مس ورلڈ بن جاتی ہے مگر بہت مدت کے بعد اپنے کھوئے ہوئے حسین محبوب رامش کو اپنے روبرو پاتی ہے جو اسی ہوٹل میں چیف (Chef) کا کام کرتا ہے جس میں زلیخا کے شو کا انعقاد ہوتا ہے۔ اس کے بعد رامش کی بیوی لیلیٰ حبیب سے مل کر زلیخا کو کچھ کھو جانے کا احساس ہوتا ہے۔ 'ایک آواز ٹوٹے ہوئے گھنگھرو کی طرح' شر پر خیر کی جیت کا قصہ ہے۔ سعید دل جو فسادات کو غنیمت سمجھ کر لوٹ کا مال اکٹھا کر کے گھر جانے کے لیے تیار ہوتا ہے ایک نہتے بچے کو دیکھ کر پسیج جاتا ہے اور مال غنیم کو چھوڑ کر بچے کو بچاتا ہے۔ 'چلو کہ چل کے چراغاں کریں دیار حبیب میں!' مسعود اور اسما کی محبت کی کہانی ہے کہ شادی سے پہلے اسما خون کی منتقلی کے سبب ایڈز کی شکار ہو جاتی ہے مگر مسعود کی ماں پھر بھی ان کی شادی کے لیے رضامند ہو جاتی ہے کیونکہ دونوں کا عشق بہت سارے مرحلوں کو پار کر چکا ہوتا ہے۔ 'اڑ گیا آنکھ سے طائر میری بینائی کا' میں اکلوتے بیٹے کو دہشت گرد اٹھا کر لے جانے کے سبب والدین پر مصیبتوں کا طوفان امڈ پڑتا ہے۔ 'ابجی' ایک کرداری افسانہ ہے جس میں دادا' کا کردار' نیم کا پیڑ اور ہجرت استعارے بن کر رہ گئے ہیں۔ افسانہ 'میرا نو بہار بنا' میں مال و دولت کی لالچ میں رشید میاں پہلی بیوی کے فوت ہونے کے ترنت بعد میر صاحب کی جواں سالہ لڑکی سے بیاہ رچاتا ہیں اور اسے اپنی دولت کا آدھا حصہ بھی دے دیتا ہیں جبکہ اس کا بھائی اور بھاوج، جو اس کی جائیداد پر نظریں جمائے ہوتے ہیں، ہاتھ مل کر رہ جاتے ہیں۔ 'وہ ایک معصوم سی بھولی بھالی سی لڑکی' تبلیغی اور قدامت پرست افسانہ ہو کر رہ گیا ہے جس میں محبوب اپنی معشوقہ، جو امریکہ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے جا رہی ہے، سے یہ پوچھتا ہے کہ وہ امریکہ کیوں جا رہی ہے؟ وہاں کی تعلیم میں ایسا کیا ہے جو یہاں نہیں ہے؟ اگر یہ محض فیشن پرستی کے لیے ہے تو احمقانہ قدم ہے۔ آخری افسانہ 'زندگی کربلا..... کربلا.....' قید سے قبل از وقت چھوڑے جا رہے ملزموں کی کہانی ہے جس میں سیاسی قیدی سجاد زین الدین کا نام نہیں ہوتا کیونکہ وہ موڈرن فرعونوں کو ننگا کرنے کا عہد کر چکا ہے مگر جیلر غلام حیدر اس کو اپنی مرضی سے رہا کر دیتا ہے چنانچہ اس کا ضمیر اسکو ایسا کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

اقبال مہدی کے یہاں موضوعات اور کرداروں میں کافی گونا گونیت ملتی ہے۔ ان کے افسانوں میں

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

مشرقی اور مغربی تہذیبوں کا تصادم صاف طور پر جھلکتا ہے۔ ایسے افسانوں میں وہ دانستہ یا نادانستہ طور پر مشرقی تہذیب کے ثناخواں اور کہیں کہیں قدامت پرستی کے حامی بن جاتے ہیں (وہ ایک معصوم سی بھولی بھالی سی لڑکی)۔ ٹوٹتے ہوئے کنبوں کا المیہ بھی مشینی دور کی ہی دین ہے جس کو افسانہ نگار نے 'دل پہ جو برسے عذاب ہجر کے سنگ' اور 'شادی کی سالگرہ' میں بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ وہ کرداروں کا مشاہدہ سرسری طور پر نہیں کرتے بلکہ ان کی نفسیاتی گرہوں کو بھی کھولنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے یہاں عورت کا کردار مثبت اور خودداری کا آئینہ بن جاتا ہے چنانچہ 'پیاس کانٹوں کی طرح زیب گلو' کی صبوحی اپنی اہانت برداشت کرنے سے پہلے ہی بغاوت کر بیٹھتی ہے۔ اسی طرح محافظ کی فوزیہ بھی اسی احساس کے تحت کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کے بجائے اپنے والد کی تجہیز و تکفین کے لیے ذاتی روپے خرچ کرتی ہے۔ دوسری جانب 'منجھلی دلہن' کی آمنہ 'اپنے خاندان کی عزت بچانے کے لیے قربانیاں دیتی ہے جبکہ 'پریم بیل' کی بے لوث نرس لوگوں کی اُڑائی افواہوں سے تنگ آ کر نوکری چھوڑ دیتی ہے۔ بیانیہ کی فراوانی کے باعث افسانوں میں مکالمے بہت کم ملتے ہیں مگر جتنے بھی نظر آتے ہیں فطری معلوم ہوتے ہیں۔ اقبال مہدی کی منظر نگاری بھی ان کے گہرے مشاہدے اور دقیقہ شناسی کی دلیل ہے۔ 'وہ ایک معصوم سی بھولی بھالی سی لڑکی' کی ابتدا ہی میں افسانہ نگار نے لکھنؤ شہر کا خوبصورت نقشہ کھینچا ہے جبکہ 'اڑ گیا آنکھ سے طائر میری بینائی کا' اور 'میرا نو بہار بنا' میں کشمیر کے تعلق سے چند پیراگراف ملتے ہیں۔

افسانوں میں کچھ کوتاہیاں بھی نظر آتی ہیں۔ افسانوں کے طویل عنوانات پڑھ کر کانوں پر بھاری پڑتے ہیں۔ عنوانات میں بھی تنوع ہو تو دلکشی بڑھ جاتی ہے۔ افسانہ نگار کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ انفرادی نظریہ رکھتا ہو مگر جہاں یہ نظریہ قدامت پرستی، رجعت پرستی اور نرینہ عصبیت کا مرتکب ہو جاتا ہے تو پچانا مشکل ہو جاتا ہے۔ الغرض زیر نظر مجموعہ کی خوبیوں اور خامیوں کو دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگار نے اپنے افسانوں میں اردو کی داستانوی زبان کو پھر سے زندہ کر دیا ہے اور اپنے لیے ایک نئی راہ کا تعین کیا ہے جہاں امکانات ہی امکانات ان کا خیر مقدم کرنے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔

❖ ❖ ❖

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

بدلتے زمانے بکھرتے لوگ

ـــــ صفیہ صدیقی

صفیہ صدیقی کا چوتھا افسانوی مجموعہ 'بدلتے زمانے بکھرتے لوگ' حال ہی میں منظر عام پر آیا ہے۔ اس سے پہلے ان کے تین مجموعے (پہلی نسل کا گناہ ۱۹۹۰ء/۱۹۹۲ء، چاند کی تلاش ۱۹۹۴ء، اور چھوٹی سی بات ۲۰۰۱ء)، تین ترجمے (زبان واحد ۱۹۹۶ء، دی گولڈن کیج ۲۰۰۱ء اور یادداشتیں ۲۰۰۲ء) اور ایک ناول (وادیٔ غربت میں) شائع ہو چکے ہیں۔

صفیہ صدیقی نے نہ صرف تقسیم کی صعوبتیں جھیلی ہیں بلکہ مکرر ہجرتوں سے بھی دوچار ہوئی ہیں جس نے ان کے دل و دماغ میں بے گھری کا احساس شدت سے جگایا ہے۔ غیر شعوری طور پر یہ احساس ان کی تحریروں میں جابجا ابھر آتا ہے۔ ہندوستان سے نقل مکانی کرنے کے مناظر ان کے کئی افسانوں میں ملتے ہیں جیسے بدلتے زمانے بکھرتے لوگ، بیگم صاحبہ وغیرہ۔

زیر نظر مجموعہ صفیہ صدیقی کے فکری اور تخلیقی ارتقاء کا مظہر ہے۔ گذشتہ مجموعے 'چھوٹی سی بات' کے مقابلے میں افسانوں میں میچورٹی اور موضوعات میں تنوع کا احساس ہوتا ہے۔ اس مجموعے میں سولہ افسانے شامل ہیں۔ پہلا افسانہ 'بدلتے زمانے بکھرتے لوگ' ہے جس میں مصنفہ نے ناسٹلجیا کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔ افسانے میں دادی اماں، جو عارضی طور پر یادداشت کھو بیٹھی ہیں، اپنی جڑوں کو تلاشتی پھرتی ہیں

ناشر: مسعود احسن، A/436، بلاک۔ا۔نارتھ ناظم آباد، کراچی
سن اشاعت: اپریل ۲۰۰۸ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

کیونکہ اس کے بچے اپنی دھرتی کو چھوڑ کر پرائے دیس میں جا بسے ہیں۔ اس افسانے میں سے یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

''تم سب، تم سب اپنے اپنے بہتر مستقبل کے لیے اپنی ماں کو، باپ کو چھوڑ کر چل دیے اور پھر اپنے مستقبل کی تکمیل کر کے اپنے بچوں کا مستقبل بہتر بنانے کے لیے گارا، مٹی، اینٹیں تلاش کرنے لگے۔ تم اپنے آگے ہی آگے دیکھتے رہے، پیچھے پلٹ کر تو دیکھا ہوتا۔

افسانہ 'امتحان' میں نسائی وجود کا معمہ، 'فیصلہ' میں ایک پولیوزدہ لڑکی پر ہوئے اتیاچار کے خلاف ردِعمل 'سوزغم ہائے نہانی' میں امرد پرستی، 'مکالمہ' میں دل، بدن اور دماغ کے بیچ کا مکالمہ جو مصنفہ کے درون میں اٹھ رہے محشر کی بازگشت ہے، 'کب درِ زنداں کھلتا ہے' میں عورتوں پر ہو رہے ظلم وستم، 'حقیقتیں بن گئی ہیں افسانے' میں انگلستان میں رہائش حاصل کرنے کے لیے استعمال کیے جا رہے حربے، 'خیال خاطر احباب' میں جنسی رشتوں کی ناپائیداری اور 'اللہ والے لوگ' میں مذہبی ٹھیکیداروں کی نقاب کشائی کو موضوع بنایا گیا ہے جو بظاہر عصری مسائل ہیں خاص کر اسلامی معاشرے کے حوالے سے۔ 'ماضی کے دریچے سے' میں مصنفہ ایڈگر ایلن پو کا رنگ اختیار کر کے اساطیری دنیا میں ڈبکیاں لگاتی ہیں اور ماضی میں رانی بھائی کے کوٹھے سے چاندنی بی بی کے فرار ہو جانے کا قصہ بڑے ہی پُراسرار (mysterious) انداز میں پیش کرتی ہیں۔ افسانہ 'ایک طوفانی شام' میں مصنفہ نے عبوری رشتوں کی اکتاہٹ اور مشرقی تہذیبی ورثے کی فوقیت کو منعکس کیا ہے۔ 'بے عنوان زندگی' چوٹ ہے ہمارے معاشرے پر جس میں باوجودیکہ ایک لڑکی اجتماعی بلاتکار کا شکار ہو جاتی ہے، مگر اس پر ظلم کرنے والے کسی خمیازے کے بغیر بچ نکلتے ہیں۔ یہ کہانی جہاں پاکستانی مناظر میں صحیح اور حقیقی لگتی ہے وہیں ہندوستان میں بھی ایسی وارداتیں عام ہیں۔ افسانہ 'بیگم صاحبہ' میں روائتیوں سے کنارہ کش ہو کر معصومہ مغربی تہذیب کا چولا پہن کر ترقی کے زینے طے کرتی ہے جبکہ 'کریش' میں دہشت گردی اور مذہبی استحصال کو موضوع بنایا گیا ہے۔ مذہبی بے راہ روی کے باعث دہشت گردی کی طرف مائل ہونا، جو مسلم معاشرے کے لیے موجودہ دور میں بہت بڑا چیلنج ہے، بڑی خوبصورتی اور صناعی کے ساتھ اس افسانے میں اجاگر کیا گیا ہے۔ 'سوال سارے، جواب سارے' روایتی کہانی ہے جس میں ایک پہاڑی معصوم لڑکی شہری رئیس زادے کی ہوس کا شکار ہو جاتی ہے مگر خوش قسمتی سے ایک آرٹسٹ شوہر سے شادی کر کے خود بھی مصور کی حیثیت سے شہرت حاصل کرتی ہے۔ 'کیسے کیسے لوگ' ایک ایسے مسلمان لڑکے کی کہانی ہے جو ایک بوڑھی یہودی عورت کی مدد کرتا ہے اور بعد میں وہ عورت اس احسان کا بدلہ

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

چکانے کے لیے مرتے دم اس کے نام کچھ جائیداد چھوڑ جاتی ہے۔

چونکہ مصنفہ یو کے میں مقیم ہیں اس لیے ان کا ذہن کشادہ، ترقی پسند اور روشن خیال ہے۔ وہ جہاں مغرب کی بے ظابطگیوں کو بے نقاب کرتی ہیں وہیں مشرقی قدامت پرستی اور بے ہودہ سوچ کو بھی آڑے ہاتھوں لیتی ہیں۔ صفیہ صدیقی نے نرینہ عصبیتی سماج میں مذہبی اقدار اور روایات کی غلط ترجمانی کرنے والوں کو بھی نہیں بخشا ہے۔ چنانچہ 'کب درِ زنداں کھلتا ہے' میں رقمطراز ہیں۔ ''ابا..... اپنے معاشرے کے مردوں کی طرح..... جو نہ صرف یہ توقع رکھتے ہیں بلکہ اس کا مطالبہ بھی کرتے ہیں اور اکثر اپنے جائز ناجائز خواہشات اور فیصلوں کو مذہب اور شریعت کا مقدس لبادہ اڑھا کر اور ان کو مجبور کر دیتے ہیں۔''

صفیہ صدیقی نے نو دولتیوں کی نفسیات، ٹوٹتے بکھرتے رشتوں، جنسی بے راہ روی اور مشرقی اقدار کی شکست و ریخت پر خصوصاً فوکس کیا ہے۔ وہ مغربی معاشرے کی بے ربطیوں کو برداشت نہیں کر پاتیں۔ اسی لیے ان کے قلم سے مندرجہ ذیل مکالمے ابل پڑتے ہیں:

- ''جی نہیں..... بات دراصل یہ ہے کہ جس بات پر میں نے اس سے کمرہ خالی کرایا تھا وہ اس لیے کے..... وہ اس لیے کہ..... وہ لڑکے لاتا ہے۔'' (سوزغم ھائے نہانی ص۲۹)
- ''جی نہیں..... یہ قانونی بیوی نہیں ہے، یہ کومن لاء وائف ہیں۔''

(حقیقتیں بن گئی ھیں افسانے ص۵۱)

- بیٹی نے آسانی سے جواب دیا..... ''اگر اس کے پاس کوئی گرل فرینڈ نہ ہوئی اینڈ ..... اینڈ اف ڈیوڈ ڈزنٹ مائنڈ.....'' (خیال خاطر احباب ص۵۶)
- نہیں میں اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ چار سال سے رہ رہا ہوں مگر ہم نے شادی کی ضرورت نہیں محسوس کی۔ ایک کاغذ کے ٹکڑے میں کیا رکھا ہے۔'' (ایک طوفانی شام ص۷۹)
- پارٹنر چینج کرتے رہنے میں بچے بہت خوار ہوتے ہیں اور اس سولائزڈ دنیا میں بچوں کی جو بربادی ہوتی ہے وہ کسی غریب اور جاہل ملک میں نہیں ہوئی۔ پوری نسل کی نسل تباہ ہو جاتی ہے۔

(ایک طوفانی شام۸۰)

- ''یہی جیسے کہ اب سیلی کی ماں کو یہ یاد ہی نہیں کہ اس کا باپ کون تھا؟''

(ایک طوفانی شام ص ۸۶)

- یہ سب خوبصورت الفاظ ان ملکوں کے لیے ہیں جہاں سب انسان برابر ہیں، سب

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

کو انصاف ملتا ہے۔ جب ملتا نہیں تو لوگ خود اپنی عدالت بنا کر اپنا انصاف بانٹنے لگتے ہیں۔

(بے عنوان زندگی ص ۹۵)

- حق! کیسا حق؟ سحر غصے سے بولی..... ''تم ہٹے کٹے آدمی ہو، تم کام کر سکتے ہو، مگر تم جھوٹ بول کر بے کاری کا پیسہ لے رہے ہو، یہ تو ان کا حق ہوتا ہے جو دس پندرہ برس ٹیکس ادا کر چکے ہوں اور ان کی نوکری چھٹ گئی ہو یا وہ کسی وجہ سے نوکری نہ کر سکتے ہوں یا جاب نہ مل رہی ہو یا معذور ہو گئے ہوں۔

(کریش ۹۰۱)

- ''اسامہ بن لادین تو اپنی تخریبی کارروائیوں کے لیے مشہور ہے ورنہ اتنے پیسے والا تھا تو افغانستان میں بچوں کے لیے اسکول کیوں نہ قائم کیے، اسپتال کیوں نہ بنائے، یہ کام تو سارے مغربی ممالک کر رہے ہیں۔ ان لوگوں کو تو صرف توڑ پھوڑ آتی ہے۔''

(کریش ص ۱۱۱)

مجموعی طور پر 'بدلتے زمانے بکھرے لوگ' ہم عصر زندگی کا آئینہ ہے۔ صفیہ صدیقی سے اردو افسانے کو بہت ساری امیدیں ہیں اور مجھے یقین ہے کہ وہ آئندہ بھی عمدہ مقصدی افسانے تحریر کرتی رہیں گی۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

زندگی کی تلاش میں

ــــــ ڈاکٹر انوار احمد انصاری

'ہتھیار' کے بعد 'زندگی کی تلاش میں' ڈاکٹر انوار احمد انصاری کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے جو حال ہی میں منظر عام پر آیا ہے۔ مجموعے میں ۲۷ افسانے شامل ہیں جن میں سے بہت سارے افسانے منی افسانے کے زمرے میں رکھے جاسکتے ہیں جیسے خود غرضی، طمانچہ، غیرت، فتح، کیکٹس، گہری چوٹ، مجبور، طمانیت، زہر، باپ، بے ردا وغیرہ۔ افسانے کو پھیلانے کے بجائے ڈاکٹر انصاری مرکزی خیال کو محور بنا کر اس کے گرد گھومتے ہیں اور اپنے مقصد کو بڑی چابکدستی سے بیان کرتے ہیں۔ ان کے یہاں بیانیہ اسلوب بھی ملتا ہے اور روایتی انداز بھی۔ بزلہ سنجی تو افسانہ نگار کی رگ رگ میں بسی ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے افسانوں میں بھی اکثر طنز و مزاح سے کام لیتے ہیں۔

ڈاکٹر انوار احمد انصاری اپنے معاشرے کو کھنگالتے ہیں۔ ان کی حساسیت سماج میں پنپتی بدعنوانیوں بے ظابطگیوں کو برداشت نہیں کرسکتی۔ وہ ان کا حل کبھی مذہب میں ڈھونڈتے ہیں اور کبھی روایتی قدروں میں۔ بقول ڈاکٹر طارق کفایت: ''ڈاکٹر انوار احمد انصاری کا افسانہ تخیل و تصور کی وادیوں میں بھٹکنے کی بجائے زندگی کے روزمرہ حقائق سے نبرد آزما ہے۔'' وہ بیٹے کی موت (سوغات) یا پھر بیٹی کے بلڈ کینسر (ٹیس) سے بیقرار ہوتے ہیں، انہیں اس ماں سے محبت ہے جسے اپنا بیٹا فراموش کرتا ہے (تہی دامنی)، اس جوڑے پر افسوس ہے جو دراصل پنشن پر جی رہے ہیں مگر دم بچوں کا بھرتے ہیں (بھرم)، انہیں اڑان بھرتی ہوئی

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، لال کنواں دھلی ۱۱۰۰۰۶
سن اشاعت: ۲۰۰۸ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

انیتا کی خاطر آنکھیں نم ہوتی ہیں کیونکہ نرینہ عصبیت والے سماج میں اس کے پر کاٹ دیے جاتے ہیں، اس سگھڑلڑکی پر رحم آتا ہے جو سسرال میں صفائی کرمچاری کی حیثیت رکھتی ہے (اے بسا آرزو کہ خاک شدہ)، اس خوبصورت لڑکی سے ہمدردی ہے جس کو بغاوت کی پاداش میں ایک غریب بھینگے مزدور سے شادی کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے (معجزہ)، چرنجیت کور جیسی شریف لڑکی پر ترس آتا ہے جو اجتماعی زنا کا شکار ہو کر بھی سیاسی چالبازوں سے چھٹکارا نہیں پاتی، انہیں سعیدہ کی لڑکی کا بلاتکار دیکھ کر بھی غصہ آتا ہے کیونکہ پولیس کیس رجسٹر کرنے سے کتراتی ہے (مجبور) اور وہ اس نومسلم جج سے بھی اپنی دردمندی کا اظہار کرتے ہیں جو الزام تراشیوں سے تنگ آکر موت کی آغوش میں سکون پاتے ہیں۔ سیاست دانوں کی چالبازیوں اور پولیس کی دھاندلیوں کا پردہ فاش کرنے میں افسانہ نگار کو خاصی لذت محسوس ہوتی ہے۔

انصاری کے افسانوں کا غالب موضوع مرد عورت کا باہمی رشتہ ہے۔ ان کے یہاں بے وفائیوں کا بول بالا ہے (مجرم کون، انصاف کی سزا)، شہرت انگیزی ہے (انہونی)، آزادروی ہے (سرطان، زہر)، بے بات کی الزام تراشی ہے (صفائی)، بے آبروئی کا بدلہ ہے (انتظام) اور مادیت پرستی ہے (تلاش)۔ 'خودغرضی'، پرنسیس ڈائنا (Priacess Diana) کی زندگی سے متاثر ہو کر لکھا گیا خوبصورت افسانہ ہے جس میں ایک حسین ماڈل خلوت کی طلبگار ہے مگر پاپاراضی اس کا پیچھا ہر جگہ کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ حادثے میں جاں بحق ہو جاتی ہے۔ اسی طرح 'افسانہ' کا بزلہ سنج گلزار آخر کار اپنے سینے کے داغوں کی نمائش اپنے افسانوں میں کر کے قارئین کو رلاتا ہے۔

افسانہ 'نیکی' میں شبیر کی نیک سیرتی اس کی بدقماش بیوی سائرہ کو راہ راست پر لاتی ہے جبکہ 'محبت کے رنگ' میں اجے اپنی حسین رقاصہ بیوی سویتا سے علیحدہ ہونے کے باوجود اس کی وفات پر آٹھ آٹھ آنسو بہاتا ہے۔ اسی طرح 'طمانچہ' کی باکردار سویتا وجے کو مشورہ دیتی ہے کہ لڑکیوں کا تعاقب کرنے کے بجائے انہیں بہن کی مانند عزت کرنا سیکھے۔ افسانہ نگار نے بیواؤں کی کسمپرسی پر بھی قلم اٹھایا ہے کیونکہ ہندوؤں میں بیواؤں کی از سر نو شادی پر پابندی انہیں بے راہ روی پر مجبور کر دیتی ہے۔ 'غلط فہمی' میں بیوہ ریٹا اپنی جنسی ضروریات پوری تو کرتی ہے مگر اس وجہ سے 'کال گرل' کا نام بھی پاتی ہے جبکہ 'مقام' میں بیوہ رینو ایک ہمسفر کو اپنا دوست اور رفیق سمجھتی ہے مگر آخر کار وہ بھی دوسرے مردوں کی طرح ہی شہوانی مریض نکلتا ہے۔ 'طمانیت' میں سمیر خوبصورت حمیرہ کے بدلے اس کی بڑی بہن منیرہ سے شادی کر کے مایوس ہو جاتا ہے مگر جونہی اس کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حمیرہ پر پاگل پن کے دورے پڑتے ہیں تو خدا کا شکر ادا کرتا ہے۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

'غیرت' میں ڈاکٹر بلراج شرما کو پیشے کی رقابت کا شکار ہونا پڑتا ہے جبکہ 'گہری چوٹ' میں سردار اپنے حریف کرتارا کو کمرے میں ایک لڑکی کے ساتھ بند پا کر لوگوں کو اکٹھا کر لیتا ہے اور دونوں کو مارنے کے لیے اکساتا ہے مگر لڑکی برآمد ہونے پر خود سردار کی ہی بہن نکلتی ہے جس پر وہ نادم ہوتا ہے۔ افسانہ 'بے ردا' کہانی ہے ایک حساس عورت کی جو اپنی جوان بیٹی کو گھر پر اکیلی نہیں چھوڑتی کیونکہ اس کو اپنے شرابی شوہر پر بھروسہ نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر انوار احمد کے یہاں عورتوں کے کئی گھناؤنے روپ بھی نظر آتے ہیں جنہیں دیکھ کر قاری عبرت حاصل کر لیتا ہے۔ ان کی یہ عورتیں عیار ہیں، چالاک ہیں، دغاباز ہیں، بدقماش ہیں اور اپنے ذاتی فائدے کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہو جاتی ہیں۔ ڈاکٹر شاردا، شکوراں اور دھنیا ایسے ہی چند کردار ہیں۔ 'دل اور پتھر' میں ماں بیٹی پولیس سے مل کر بشیر کو بیٹی کے ساتھ شادی کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ افسانہ 'مصلحت' میں ایک عیار عورت اپنے سسر کا استحصال کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑتی 'کیکٹس' کی فاحشہ پولیس کے سامنے بھی سینہ تان کر کھڑی ہو جاتی ہے کیونکہ اسے معلوم ہے کہ پولیس اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتی۔ اسی طرح 'اپنا گوشت' کا پیٹر انسانی جنین (Foetus) کا گوشت کھانے میں لذت محسوس کرتا ہے جبکہ 'وقعت' میں صغیر صاحب عورت کی موت پر ریٹائرمنٹ پارٹی دیتا ہے۔

افسانہ 'صبر' انسانی ہمدردی پر تحریر کیا ہوا اچھا افسانہ ہے جس میں مہندر پے کمیشن کے سبب ملی ہوئی پوری رقم اپنے پڑوسی کے بیمار بیٹے پر لٹاتا ہے۔ افسانہ 'باپ' ایسے تابعدار بیٹے کی کہانی ہے جو اپنے باپ کی اسی طرح خدمت کرتا ہے جس طرح بچپن میں اس کا باپ کرتا تھا جبکہ افسانہ 'کسک' میں شاعرہ فضلیت بیگم بطن سے بچے تو پیدا نہیں کر پاتی مگر اپنے دماغ سے ہزاروں بچوں کے لیے دلچسپ افسانوں کے انبار لگا دیتی ہے۔

مجموعی طور پر 'زندگی کی تلاش میں' ڈاکٹر انصاری کی عینیت پسندی اور مقصدیت کا آئینہ دار ہے۔ افسانہ نگار کو کہنے کے لیے بہت کچھ ہے اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اتنی قلیل مدت میں اردو ادب کو دو مجموعے عنایت کیے ہیں۔ افسانہ نگار ایسا جوہری ہوتا ہے جو ہیرے کی مانند افسانے کو تراشتا ہے۔ اس میں جلد بازی، جھول یا بھٹکنے کی گنجائش نہیں ہوتی ہے۔ ڈاکٹر انصاری کے یہاں اختصار بھی ہے اور وحدت تاثر بھی، مشاہدہ بھی ہے اور مطالعہ بھی البتہ کہیں کہیں تیز روی اور عجلت پسندی دکھائی دیتی ہے جس سے افسانہ نگار کو گریز کرنا چاہیے۔ علاوہ ازیں ان کے افسانوں میں مکالموں کی کمی بھی نظر آتی ہے جبکہ زبان و بیاں پر ان کی گرفت مضبوط ہے۔ اردو ادب کو ان سے کافی امیدیں ہیں۔

❖ ❖ ❖

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

فرشتے کے آنسو

ـــــ ڈاکٹر بلند اقبال

کینیڈا میں مقیم ڈاکٹر بلند اقبال کو ادب وراثت میں ملا ہے۔ ان کے والد حمایت علی شاعر پاکستان کے مشہور و معروف شاعر تھے۔ یو ایس اے کی کئی یونیورسٹیوں سے پوسٹ گریجویشن کی ڈگریاں حاصل کرنے کے بعد کینیڈا میں بطور انٹرنل میڈیسن اسپیشلسٹ کے کام کر رہے ہیں۔ طالب علمی کے زمانے ہی سے لکھنا شروع کیا تھا۔ زیر نظر مجموعے میں شامل افسانہ 'تمنا' انہی دنوں (۱۲ فروری ۱۹۸۵ء) کی تحریر ہے۔ بہر حال موصوف گذشتہ پانچ چھ برسوں سے باضابطہ طور پر فعال ہیں۔ اپنی تخلیقی رجحان کا جواز وہ یوں پیش کرتے ہیں: ''میں بھی کچھ ایسی ہی کہانیاں لکھنا چاہتا ہوں جو تتلیوں کی طرح سندر ہوں اور آگ کی طرح جھلسا دینے والی بھی۔ جو ناگن کی طرح ڈسنے والی ہوں تو منکہ کی طرح زہر چوسنے والی بھی۔ پچھلے چار پانچ برسوں سے میں کسی ایسی ہی سچی کہانی کی تلاش میں اپنی ذات کے اندر اترا ہوا ہوں۔''

'فرشتے کے آنسو' بلند اقبال کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس لیے ان افسانوں میں ابتدائی تذبذب اور غیر متعینہ صورت حال نظر آتی ہے۔ ایک جانب جدیدیت کا اثر ملتا ہے، علامتوں اور استعاروں کی فراوانی ملتی ہے اور دوسری جانب نفسیات پر مبنی بیانیہ کہانیاں ملتی ہیں جن میں باضابطہ کیس اسٹڈیز کا تاثر دکھائی دیتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ کہانیاں ڈاکٹر اقبال نے پیشے کی وساطت سے گہرے مشاہدے کے

ناشر: دنیائے ادب، کراچی پاکستان، سن اشاعت: ۲۰۰۷ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

بعد ہی رقم کی ہیں۔ پہلے زمرے میں شامل کہانیاں ہیں۔ آوارہ خیال، پردے جونفرتوں کے تھے، شاہ دولے کا چوہا، فورتھ ڈائمنشن، ستیہ کے بکھرے ہوئے بال، لفظ جوطوائف بن گئے، ٹیڈی بیئر وغیرہ۔ شاہ دولے کا چوہا تو ہم پرستی کا استعارہ بن کر رہ گیا ہے۔ (شاہ دولے کا چوہا سعادت حسن منٹو کی مشہور کہانی ہے) اس کے برعکس دوسرے زمرے میں شامل کہانیوں کے نام یوں ہیں: آدھا مرد، ایمپٹی نیسٹ سنڈروم، اپوپٹوسس، پراسرار مسکراہٹ، پہلا پیار، سہاگ رات وغیرہ۔

بلند اقبال پہلے فقرے ہی سے قاری کی توجہ اپنی جانب کھینچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ یہ کیسی بے وفائی ہے، فورتھ ڈائمنشن، لفظ۔ جوطوائف بن گئے اور پہلا پیار اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

- اللہ مارے تمہارے لبا پرائی عورتوں کے بہت شوقین تھے، جہاں کوئی لال پیلی چھپن چھری دیکھی 'چل پڑے پیچھے پیچھے' پھر نہ گھر کا پتا نہ باہر کا..... (یہ کیسی بے وفائی ھے)
- ہاں وہی۔ وہ جو چھوٹا سا ناک بسورتا ہوا بچہ۔ گندا اور کالا سا۔ وہ جس کے جھپرے جھپرے بال دھول اور مٹی سے اٹے ہوئے ہیں۔ وہ جس کے ننگے پاؤں زخموں سے بھرے ہوئے ہیں اور جن پر مکھیاں بھنبھناتی ہیں اور ان سے رستے ہوئے خون اور پیپ سے اپنی پیاس بجھاتی ہیں۔ ہاں وہی بچہ..... جس کی بھوکی نظروں میں باسی روٹیاں ناچ رہی ہیں۔ جس کی خالی ہتھیلیاں بھیک مانگ رہی ہیں.....'' (فورتھ ڈائمنشن)
- عبدالجبار کو دوسروں کی بیویاں اچھی لگتی ہیں۔ (بیوی، دوسرے کی)
- اور جب وہ جوان ہوئی تو کافی عرصے تک خود کو آئینے میں ڈھونڈتی رہی۔ کوئی چاند چہرہ کوئی ستارہ آنکھیں، کوئی سرو قد، کوئی چمپئی رنگت، کوئی جو مسکرائے تو دیکھنے والوں کی آنکھوں میں نشہ سا چھا جائے، کوئی جو اٹھلائے تو جاتی ہوئی بہار کے بھی قدم ڈگمگا جائے۔ آہ مگر ایسا تو کوئی بھی آئینے میں نہیں تھا..... (لفظ۔ جوطوائف بن گئے)
- کہتے ہیں جس دن پہلی بار رحیم داد کو ماسٹر شریف نے چمکار کر گود میں بٹھایا تھا اسی دن رحیم داد سات سے سترہ سال کا ہو گیا تھا۔ (پہلا پیار)

کرداروں کی عکاسی میں بھی بلند اقبال نے اپنے تجربے اور مشاہدے کا بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔ 'ادھورا کافر' کے جبران کا کردار یوں بیان کیا گیا ہے:

''جبران کو لگا نیلوفر اس کی بے رنگ زندگی میں قوس وقزح کے رنگ بھر دے گی

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

اور حقیقت بھی یہی تھی مگر عام خوبصورت عورتوں کی طرح نیلوفر ذہنی شعور کی اعلیٰ منزلوں سے نابلد تھی۔ جلد ہی جبران کا دل نیلوفر کے حسن سے بھرنے لگا۔ وہ حسن و عشق کے فلسفے میں الجھا، ایک نیلوفر سے دوسری، اور دوسری سے تیسری اور پھر درجنوں حسین عورتوں سے مل کر جنسی رویوں کے راز جاننے میں مگن ہو گیا۔ جبران کی بے انتہا ذہانت اسے زندگی کے آسائشی رویوں کو اپنانے میں مدد کرتی، اس کا دماغ نت نئے تخلیقی خیالات سے مالا مال تھا چنانچہ اکثر اشتہاری کمپنیاں اس کی تخلیقات سے استفادہ کرتی تھیں۔ پہلی بیٹی کے بعد ہی اس نے نیلوفر کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ روز روز کے سوال جواب سے تنگ تھا۔ ازدواجی زندگی سے اس کا دم گھٹتا تھا۔''

مجموعے کا پہلا افسانہ 'یابی بی سیدہ' ہے جو افسانہ نگار نے اپنی ماں معراج نسیم کی محبتوں کو یاد کرتے ہوئے لکھا ہے۔ ماں اسے بار بار کہتی ہے کہ ''بیٹا خوب پڑھنا لکھنا، پھر تم دیکھو گے یہ بڑھاپا تم پر کبھی نہیں آئے گا'' بہر حال زندگی کا المیہ تو یہ ہے کہ جب بیٹا ماں باپ کی آرزوؤں کو پورا کرنے کے قابل ہو جاتا ہے تو بہاریں دیکھنے کے لیے والدین پاس نہیں ہوتے۔

افسانہ 'نہیں' ایک نیک اور خدا پرست عورت کی کہانی ہے جو اپنی خوش خصلت اور نیک اعمال سے پرچونیے شوہر کو بھی خدا کی راہ پر ڈال دیتی ہے مگر بچہ پیدا نہ ہونے کی پاداش میں وہی شوہر اس کی نیکیوں کو نظر انداز کر کے دوسری شادی کر لیتا ہے جس کا اسے وہم و گمان بھی نہیں ہوتا ہے۔ افسانہ 'سہاگ رات' میں زفاف کی شب کو شہوانی پیش بینی میں تپتی ہوئی بیوی اس وقت چونک جاتی ہے جب اس کا شوہر یوں مخاطب ہوتا ہے: ''محترمہ آپ دو رکعت نماز پڑھ لیجیے کہ سنت رسولؐ ہے اور میں بھی غسل کر کے آتا ہوں کہ مباشرت سے پہلے واجب ہے اور..... ہاں..... یہ روشنی گل کر دو، یہ مکروہ ہے۔'' جنسی موضوع پر لکھی گئی یہ کہانی واضح طور پر یہ اعلان کرتی ہے کہ جنسی فعل کوئی میکانیکی مشق نہیں جسے ہدایات کے مطابق عمل میں لایا جا سکتا ہے۔ اس طرح آدمی بچے تو پیدا کر سکتا ہے مگر عورت کی مانگ پوری کر سکتا ہے نہ اس کو مطمئن کر سکتا ہے۔ 'یہ کیسی بیوفائی ہے' میں منان اور عفت شادی کے بعد ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں مگر بچہ نہ ہونے کے سبب منان اپنے دوست شرافت بھائی سے ہم جنسی تعلقات پیدا کر لیتا ہے۔ 'ادھورا کافر' کا جبران جوں جوں ترقی کی منزلیں طے کرتا ہے اور آسودہ حال ہو جاتا ہے، تیوں تیوں بیوی سے دور ہو جاتا ہے اور اس کو چھوڑ کر امریکا چلا جاتا ہے جہاں وہ دوسری عورتوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتا ہے۔ آخر میں خود کو تنہا پا کر اپنی

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

دوسالہ بیٹی کو یاد کرتا ہے۔ 'اندھا فرشتہ' میں بھی اپنے شوہر قاسم کی تنہائیوں کو دور کرنے کے لیے اس کی بیوی خواب میں آکر اسے مخاطب ہوتی ہے: ''اور سنو جی، وہاں ساری حوریں بانجھ ہیں۔ میری طرح، اور سارے فرشتے خدا کی محبت میں اندھے ہیں۔ تیری طرح۔'' 'پلیج آف ایلی جینس' (Pledge of Allegiance) میں باپ بیٹے سے ہر سال صرف اس قول کی تجدید کرواتا ہے کہ وہ سال میں کم سے کم ایک بار باپ کی قبر پر پھول ضرور چڑھایا کرے گا۔ اس نہج کا ایک اور افسانہ ہے 'اکیسویں صدی کی موت' جس میں موت کے قریب پہنچ کر آدمی جمع کی ہوئی ساری آسائشوں کی بے ثباتی پر فکر مند ہوتا ہے۔ اسی طرح 'بیوی دوسرے کی' میں ایک کثیر زن آدمی اپنی بیوی کو طلاق دے کر تھیٹر میں ایک ملمع چڑھی خوبصورت اجنبی عورت پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ بعد میں پتہ چلتا ہے کہ وہ اسی کی طلاق شدہ بیوی ہے۔

افسانہ 'آدھا مرد' زنانیت (Transversitism) پر لکھا گیا افسانہ ہے جس میں رانی کا شوہر اپنے جسم کی کھوج میں عورت کا روپ دھارن کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ ہر آدمی میں کہیں نہ کہیں 'اردھ ناری شر' چھپا ہوا ہے۔ 'شکوہ' میں ایک چھوٹی سی معصوم لڑکی 'لاکڈ ان سنڈروم' (Locked in Syndrome) کے مرض کے سبب معذور ہو جاتی ہے۔ اکیس سال تک اس کی ماں اس کا بوجھ اٹھائے چلی جاتی ہے مگر ایک روز ماں موت کی آغوش میں پناہ لے کر بیٹی کو بے یار و مددگار چھوڑ جاتی ہے جس پر فرشتے بھی رو پڑتے ہیں ایسے بچوں کے لیے سماجی تحفظ (Social Securily) کا ہونا بہت ضروری ہے۔ افسانے میں مکڑی کے جال میں پھنسی ہوئی مکھی ایسے معصوم معذور بچے کی علامت کے طور پر پیش کی گئی ہے۔ بچوں کے چھوڑ جانے سے پیدا شدہ خالی پن اور تنہائی کبھی کبھی ایسی شدت اختیار کر جاتا ہے کہ عورت ایمپٹی نیسٹ سنڈروم Empty (Nest Syndrome) کے مرض میں مبتلا ہو سکتی ہے۔ موڈرن لائف کی ایک کڑوی سچائی۔ جنسیات پر ایک اور خوبصورت افسانہ 'پراسرار مسکراہٹ' ہے جو ذہن اور مباشرت کے تعلق کو واضح کرتا ہے۔ ایک عورت اپنے بدصورت شوہر قیوم کے ہوتے ہوئے بھی ذہنی طور پر پیش اختلاط اور اختلاط کے درمیان اپنی ایک حسین دنیا قائم کرتی ہے اور اپنے خوابوں کے شہزادے کے توسل سے جذباتی اور جنسی تشنگی مٹانے کی کوشش کرتی ہے۔ اسی طرح 'پہلا پیار' امرد پرستی پر مبنی افسانہ ہے جس میں رحیم داد اس روایت کو آگے بڑھاتا ہے جو اس کو بچپن میں ماسٹر شریف نے سونپ دی تھی اور اب زہرہ کا چھوٹا بھائی اس کا شکار ہو جاتا ہے۔

فورتھ ڈائمنشن پر جدیدیت کی چھاپ صاف نظر آتی ہے۔ اس افسانے میں افسانہ نگار انسانی وجود کی اصلیت جاننے کے لیے کوشاں ہیں یعنی چوتھے ڈائمنشن کی تلاش میں محو ہیں۔ افسانہ 'خدا کا بت' ایک ایسے

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

حساس بت تراش کا قصہ ہے جو زندگی کے ارتقاء کو خدا کے تصور سے جوڑتا ہے اور اس طرح لوگوں کے عتاب کا شکار ہوتا ہے کیونکہ اس نے 'خدا کا بت' بنایا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ وہ غربت اور افلاس میں اپنے خالق کو ڈھونڈتا ہے۔ چنانچہ افسانہ نگار تحریر کرتے ہیں۔ ''آزر کا بنایا ہوا خدا کا بت۔ ایک چھوٹے سے معصوم بچے کا بت۔ جو لاغر کمزور اور ننگا تھا، جس کے ہاتھوں پیروں کی ہڈیاں اور سینے کی پسلیاں سوکھی ہوئی تھیں، جس کی بھوکی آنکھوں میں آنسو تھے اور جس کے ہاتھ میں خالی پیالا تھا۔'' اسی طرز کا افسانہ گلزار نے مائیکل انخیلو، کے عنوان سے رقم کیا ہے۔ افسانہ 'کارٹون' میں بظاہر نیکوکار محمد شجاع اپنے ہی عکس (کارٹون) سے نبرد آزما ہو کر اپنی باطنی کیفیت جان کر تذبذب میں پڑ جاتا ہے۔ 'لفظ جو طوائف بن گئے' ایک بدصورت تخلیق کار کی کہانی ہے جو الفاظ میں خوبصورتی سمیٹ کر خیالی دنیا میں رہنے کا عادی ہو گیا ہے۔ 'ٹیڈی بیئر' ایک خوب صورت مختصر کہانی ہے جس میں بوڑھا محمد حسین اپنے بچپن کے ٹیڈی بیئر سے ہمکلام ہے جو اس کو یاد دلاتا ہے کہ بچپن میں انسان سبھی بندھنوں، ذہنی الجھنوں اور کثافتوں سے دور ہوتا ہے لیکن آہستہ آہستہ معاشرہ اس کے ذہن کو مذہبی، جغرافیائی اور نسلی کثافتوں سے آلودہ کرتا ہے۔

اپوپٹوسس (Apoptosis) میں شہر کے خودکش حملے کے دوران بیوی اور چار جوان بچے کھونے کے سبب اللہ دتا ذہنی توازن کھو بیٹھتا ہے اور پاگل خانے میں داخل کیا جاتا ہے۔ وہاں اس پر یہ منکشف ہوتا ہے کہ ہم سب کو آکاش میں پناہ لینا ہے مرنا ہے اور محبت سے ملنا ہے کیونکہ طے شدہ موت (Apoptosic) ہی زندگی کی حقیقت ہے۔ اسی طرح ہندو لڑکے سے بیاہ کرنے کی پاداش میں افسانہ 'شرک' میں ایک مسلم لڑکی کو ایک درگاہ (جو مشترکہ کلچر کی علامیہ ہے) کے بیچوں بیچ سنگسار اور نذر آتش کیا جاتا ہے کیونکہ آج بھی انسان ذہنی قدامت پرستی اور فرقہ واریت سے آزاد نہیں ہو پا رہا ہے۔ 'گدھ' ایک طوائف رجو بائی کی کہانی ہے جس کا دل معصوم لاجی کو دیکھتے ہی پسیج جاتا ہے اور وہ اس کو اپنے بالا خانے میں قید کرنے کے بجائے رہا کر دیتی ہے۔ دہشت گردی پر لکھی گئی کہانی 'لال چونا' میں جونہی رنگ ساز مسجد میں اپنے بیٹے کی لاش دیکھتا ہے تو خون ملے ہوئے چونے سے مسجد کی دیواریں رنگ دیتا ہے جو بذات خود ایک علامیہ ہے۔ افسانہ 'انتظار' میں کینسر میں مبتلا مریض موت کا انتظار کرتا ہے جبکہ 'نروان' میں موہنی مغربی سماج کی غلط عملی کو دیکھ کر فرار اور نروان کی متمنی ہو جاتی ہے۔ افسانہ 'بے بی کیئر سینٹر' میں پہلے پہل تو بچوں کی پرورش بڑے پیار و محبت سے ہوتی ہے مگر بعد میں قانون اور ضابطے ماحول کو محبس بنا دیتے ہیں۔

'فرشتے کے آنسو' پیش کر کے ڈاکٹر بلند اقبال نے اردو ادب کو ایک نادر تحفہ دیا ہے کیونکہ اس میں چند

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ایسے افسانے ہیں جو پیشہ ور ڈاکٹر ہی رقم کرسکتا ہے۔ افسانہ نگار کو فن افسانہ نگاری پر دسترس حاصل ہے گو ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں۔ میری صرف یہ مخلصانہ رائے ہے کہ افسانوں میں مزید افسانویت لانے کی ضرورت ہے جو مطالعے اور محنت سے خود بہ خود آئے گی۔ اگر علامتوں اور استعاروں کو انجام کے بدلے محض ذریعہ بنایا جائے تو ترسیل میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی۔ مجھے یقین ہے کہ یہ تو شروعات ہی ہے، ڈاکٹر بلند اقبال کے حساس قلم سے ابھی بہت کچھ ہمارے سامنے آئے گا۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

لمحوں کی داستاں

ـــــ کرشن بیتاب

پنجابی ادب میں کرشن بیتاب کا نام کوئی نیا نہیں ہے۔اب تک ان کی نو کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں البتہ اردو میں 'لمحوں کی داستاں' ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے جس میں مشاہدے کی گہرائی اور فکر کی پختگی دونوں صاف طور پر جھلکتی ہیں۔ گورمیل مڈاہڑ کا قلمی خاکہ اور سالک جمیل براڑ کا مرتب کیا ہوا حیات نامہ اور انٹرویو افسانہ نگار کی زندگی پر بھرپور روشنی ڈالتے ہیں جبکہ مشمول افسانے ان کی سوچ وفکر کے آئینہ دار ہیں۔ خود کرشن بیتاب فرماتے ہیں۔ ''لکھنا میرے لیے عبادت ہے۔ عبادت سے جو کچھ انسان کو حاصل ہوتا ہے وہ سکون اور روشنی مجھے ضرور ملی ہے۔''

کرشن بیتاب کے اکثر و بیشتر افسانے کرداری افسانے ہیں۔ انہوں نے اپنے آس پاس کے ماحول سے گورمکھ سنگھ، بکرم اور کپور جیسے مضبوط کردار ڈھونڈ نکالے ہیں۔ یہ کردار ہماری ہی طرح گوشت پوست کے آدمی ہیں مگر ان میں عزم ہے، حوصلہ ہے اور مثبت قدروں کی پاسداری ہے۔ افسانہ نگار پلاٹ پر بھی کڑی نگاہ رکھتے ہیں اور اس میں کہیں کوئی جھول نہیں آنے دیتے۔ 'لمحوں کی داستاں' میں ۱۴/افسانے شامل کیے گئے ہیں۔ جن کے پلاٹ افسانہ نگار کے گہرے مشاہدے اور عمیق مطالعے کے عین شاہد ہیں۔ ایک نہنگ کا اجتماعی زنا سے ہراساں لڑکی کو سہارا دینا (گورمکھ سنگھ)، فراموش کیے گئے عمر رسیدہ والد کی مجبوریاں (اونچی کرسی والا)،

ناشر: براڑ سنز، بی ۵۹۴/۱۴، حضرت شیخ روڈ، پنجاب۔ سن اشاعت: ۲۰۰۹ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ایماندار سر پھرے آدمی کا زیست سے ہاتھ دھو کر قابل پرستش بننا (سورج سلام کرتا ہے)، طاقت، رتبے اور دولت کی لالچ میں انسان کا اپنی زندگی برباد کرنا (ٹارچ، طوطا اور جوانی)، انسانیت کی طرف ایک درندے کی مراجعت (آج ہی تو جاگے ہیں)، سیاست دانوں کی جادوگری اور چالبازیاں (میں نے ایسا تو نہیں کہا تھا)، اس مادی دنیا میں بھی استاد کا احترام اور جنت نشین ہونا (بیکنٹھ) فرشتہ صفت کپور کا مارا جانا (صبح ضرور آئے گی) یوروپی استعماریت کی داستاں (پنر جنم) پاگل کتوں کی مانند انسانی دیوانگی (باؤلے کتے پاگل آدمی)، عورتوں پر ہو رہے ظلم و تشدد کی کہانیاں (بولتی لاشیں)، انسانی شخصیت کا دوغلا پن (دن دن، رات رات)، نہتے قبائلوں کا ظلم و جبر کے خلاف آواز اٹھانا (خوشبو کا قتل نہیں ہوتا) اور بھوک کی تاب نہ لا کر ایک غریب لاچار لڑکے کا روٹی چھیننا (لمحوں کی داستان) ان سب موضوعات پر غور کر کے مجھے یہ بات کہنے میں کوئی باک نہیں کہ کرشن بیتاب کے افسانوں کی گونا گونیت اور معنویت قاری کو ہر دم سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ ان کے افسانوں میں کہانی پن بھی ہے اور جدید طرز اسلوب بھی۔ کہیں کہیں وہ علامتوں کا برمحل استعمال بھی کرتے ہیں۔ ان کے مکالمے چست ہوتے ہیں اور گاہے بہ گاہے وہ اپنی بات بھی بین السطور کہہ جاتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے ایک مکالمہ:

> ''کیا مناسب نہیں سر؟ یہی تو میں کہتا ہوں کہ آزادی کا سورج کیا اس لیے طلوع ہوا تھا کہ چاندنی راتیں جل جائیں۔ ہم سر شام اپنے ڈبوں (ڈربوں) میں سہم کر دبک جائیں۔ کیا وہ راتیں اب کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گی جب رات رات بھر رام لیلائیں دیکھی جاتی تھیں۔ چاندنی راتوں میں ناٹک کھیلے جاتے تھے۔''

اسی طرح 'سورج سلام کرتا ہے' کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''اسی لیے آخر ایک دن اس کا قتل کر دیا گیا۔
>
> کیونکہ وہ سچ بولتا تھا۔
>
> کیونکہ رات کے اندھیروں میں اس نے لوگوں کو مکھوٹے بدلتے دیکھا تھا۔
>
> کیونکہ وہ عبادت گاہوں کا احترام نہیں کرتا تھا۔
>
> کیونکہ وہ انسان کے بنائے خداؤں کو نہیں مانتا تھا۔
>
> کیونکہ اس نے غلاظت کو نگلا تھا۔
>
> کیونکہ اس کے زخم رسنے سے بند نہیں ہوتے تھے۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

کیونکہ جہاں جہاں وہ جاتا تھا اپنے پیروں کے نشان چھوڑ جاتا تھا۔

کیونکہ وہ دردمند تھا۔

زیرنظر مجموعے میں زبان و بیان کی چند غلطیاں بھی در آئی ہیں جو شاید کمپوزنگ کی دین ہیں۔ پروف ریڈنگ میں ان کی طرف توجہ نہیں دی گئی ہے۔ آئندہ اس طرف دھیان دینے کی ضرورت ہے۔

بدقسمتی سے کرشن بیتاب کا فوکس پنجابی کہانیوں پر رہا ہے نہیں تو اردو ادب کو انہوں نے اب تک مالا مال کیا ہوتا۔ خیر میں ان سے اتنی تو امید کرتا ہوں کہ وہ اپنی سبھی پنجابی کہانیوں کو اردو میں منتقل کر کے اردو قارئین کو مستفیض کریں گے۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

درد کی فصیل

ـــــ کرشن بیتاب

۲۰۰۹ء میں کرشن بیتاب کے افسانوں کا مجموعہ 'لمحوں کی داستاں' شائع ہوا تھا اور اب ایک سال کے بعد ہی ان کا دوسرا مجموعہ 'درد کی فصیل' منظر عام پر آچکا ہے۔ کرشن بیتاب کا زیادہ فوکس پنجابی پر رہا ہے جس میں ان کی نو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اِن کے علاوہ انہوں نے پنجابی کی دو کتابوں کا ترجمہ بھی اُردو میں کیا ہے جو اردو لٹریچر میں ایک اہم اضافہ ہے۔

'درد کی فصیل' میں چودہ افسانے شامل ہیں جن کے مطالعہ سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف پریم چند اسکول کی روایت کو آگے بڑھانے کے کوشاں ہیں حالاں کہ افسانہ 'درد کی فصیل' میں ان کے خیالات سعادت حسن منٹو سے ملتے جلتے ہیں (ص ۸۲)۔ چند ایک افسانوں مثلاً 'کروٹ' میں جدیدیت کا اثر بھی ملتا ہے۔ کرشن بیتاب کے افسانوں میں ایک جانب انسانی رشتوں کی تقدیس، ہمدردی اور معصومیت جھلکتی ہے۔ (بڑا ہے درد کا رشتہ، جھلک، لاوارث اور بھگوڑا) جبکہ دوسری جانب انسانی بہیمیت، بربریت اور سرد رَوی کی مثالیں ملتی ہیں۔ (تری جنت کے سائے میں اور اولڈان)۔ وہ اپنے معاشرے پر کڑی نگاہ رکھتے ہیں اور اس میں پل رہی گندگی کو دور کرنے کی سبیلیں ڈھونڈتے ہیں۔ افسانہ 'کروٹ' میں انہیں دنیا ایک چڑیا گھر کے مانند لگتی ہے اور انسان اس میں قید ہوئے جانوروں کی طرح۔ 'برف کا آدمی' بہت ہی خوبصورت

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

افسانہ ہے جس میں ایک تارک الدنیا شخص کو آخر کار جبلی خواہشوں کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پڑتے ہیں۔ انسانی سرشت کی لاجواب کہانی۔ البتہ اس کہانی کا عنوان پلاٹ سے میل نہیں کھاتا ہے یا پھر میری سمجھ سے باہر ہے کیونکہ 'برف کا آدمی' بے حرارتی Frigidity کی علامت ہے۔ پرہیز گاری Abstinence کی نہیں۔ چنانچہ کرشن بیتاب تقسیم ملک کی صعوبتیں جھیل چکے ہیں اس لیے 'بڑا ہے درد کا رشتہ' کا ناسٹلجیا بہت ہی اثر انگیز ہے۔ اسی زنجیر کی کڑی ہندو سکھ فسادات پر مبنی افسانہ 'بھگوڑا' بھی ہے۔

عورتوں کے بارے میں ان کا مخصوص نظریہ 'منزل'، 'فیصلے سے پہلے' اور 'درد کی فصیل' میں ظاہر ہوتا ہے۔ ان کے یہاں عورت ایک جانب اپنے حق کی طلب گار ہے اور اپنی ہمت و حوصلے سے مصائب کا سامنا کرتی ہے اور دوسری جانب وہی عورت اپنے پہلو میں نرم دل بھی رکھتی ہے اور طوائف ہونے کے باوجود تو شار کو مہلک بیماری میں مبتلا ہونے سے باز رکھتی ہے۔ 'درد کی فصیل' کی شاہدہ الطاف حسین آئی اے ایس افسر کو، جس نے اس کو دھوکہ دے کر کہیں کا نہیں رکھا ہوتا ہے، بہت ہی دردانگیز سبق سکھاتی ہے۔

'ایک نہیں..... دو اور' بہت ہی خوبصورت افسانہ ہے جس میں اسپتالوں کے نظام اور ڈاکٹروں کی لاپرواہی پر زبردست چوٹ کی گئی ہے۔ اس کے برعکس افسانہ 'بھوک' میں پلاٹ اور کرداروں کی کمزوری ابھرتی ہے اور ساتھ ہی کمپوزنگ کی غلطیاں بھی نظر آتی ہیں۔ یہی خامیاں افسانہ 'انٹرویو' میں بھی دِکھائی دیتی ہیں کیونکہ یہ افسانہ تصور کی حدوں کو پھلانگ کر لایعنی ہو چکا ہے۔

کرشن بیتاب روزمرہ کی زبان استعمال کرتے ہیں اس لیے قاری کو افسانے پڑھنے میں کہیں بھی بوریت محسوس نہیں ہوتی۔ ان کے یہاں جو مقصدیت ہے وہ ان کے افسانوں کو اعلیٰ درجہ عطا کرتی ہے۔ پنجابی میں لکھی ہوئی اُن کی سبھی کہانیاں اُردو میں منتقل ہوں تو اُردو ادب کے لیے مفید رہے گا۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

اور خون جلتا رہا

ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی

مقصدی ادب کی ایک اچھی مثال زیر نظر افسانوی مجموعہ 'اور خون جلتا رہا' میرے پیش نظر ہے۔ انتساب پڑھ کر ہی افسانہ نگار کے ارادے اور منشاء کا پتہ چلتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ڈاکٹر فاروقی نے یہ افسانے نیویاک میں بیٹھ کر وہاں کے مسلم معاشرے کے بارے میں لکھے ہیں لیکن ان کے پ ہنی دھرتی، اپنے کلچر اور اپنے سماج میں پیوست ہیں۔

پروفیسر عبدالقادر غیاث الدین فاروقی بیجاپور کرناٹک سے تعلق رکھتے ہیں۔ بی اے، بی کام، ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کرنے کے بعد وہ معلّمی کے پیشے سے وابستہ رہے اور پھر امریکہ جا کر شعبۂ صحت عامہ سے جڑے رہے جس کی گونج ان کے افسانوں میں جابجا ملتی ہے۔ 'اور خون جلتا رہا' سے پہلے فاروقی کی دو اور کتابیں 'اعجاز' اور 'مضامین فاروقی' شائع ہو چکی ہیں۔

مشرق میں زندگی کا بیشتر حصہ گذار کر مغربی تہذیب کے ساتھ جوجھنا کسی بھی حساس آدمی کے لیے کلچرل شاک سے کم نہیں ہوتا۔ اس کا اندازہ فاروقی کے افسانوں سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ خود چھاؤں میں کھڑا آدمی لوگوں کو دھوپ کی نعمتوں سے روشناس کراتا ہے۔ مغربی ممالک میں سکونت پذیر اردو رائٹرز نے بھی یہی لائحہ عمل اختیار کیا ہے۔ پھولے پھلیں مغربی تہذیب کی بدولت اور گن گائیں مشرقی تہذیب کے۔ ڈاکٹر فاروقی کے یہاں مغربی تہذیب کی عکاسی رجعت پسندانہ طور پر نہیں ہوئی ہے بلکہ

ناشر: بُک ویر، ۸۵، فرسٹ فلور، نزد پولیس سٹیشن جے سی نگر، بنگلور۔۶ سن اشاعت: ۲۰۰۶ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ایک روشن ذہن ادیب کا ردِ عمل ہے۔ انہوں نے دونوں کلچروں کی اچھائیاں اور برائیاں ہمارے سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے افسانوں کے موضوعات ہیں۔ لڑکیوں کو تعلیم سے محروم رکھنا، نرینہ عصبیت، کثیر الازدواجی، گھریلو تشدد، عورتوں کا استحصال، مسلم معاشرے میں طلاق کا بے وجہ استعمال، مغربی تہذیب کی عریانیت پسندی، شراب نوشی اور منشیات کی لت، ایڈز جیسی مہلک بیماریوں کا پھیلنا، منظم اور غیر منظم دہشت گردی خاص کر حکومتی اور افواجی دہشت گردی وغیرہ۔ منشیات اور کثیر الازدواج کے انجام کے بارے میں انہوں نے اکثر و بیشتر افسانوں میں روشنی ڈالی ہے جس کی انتہا افسانہ 'میٹھا زہر' میں دیکھنے کو ملتی ہے جب ایک مجبور اور لاچار لڑکی اپنے ہی شرابی اور نشہ خور باپ کے سامنے بکنے کے لیے حاضر ہوتی ہے۔

ایک اہم موضوع جس پر مصنف نے بالخصوص روشنی ڈالی ہے وہ ہے ہمارے سماج میں عورت کا استحصال۔ چاہے وہ اس کی تعلیم چھڑوا کر ہو یا پھر سن بلوغ سے پہلے ہی شادی کے حجرے میں دھکیل کر ہو۔ کئی افسانوں میں ایشیائی والدین مال و دولت کی لالچ میں آکر اپنی بیٹیوں کی شادیاں غیر ممالک میں کرتے ہیں جہاں منکوحہ کی زندگی حقیقت کا سامنا کر کے اجیرن ہو جاتی ہے۔ وہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوتا ہے کہ خاوند نے اسے جھوٹے خواب دکھائے تھے (تقدیر کا قتل) یا پھر اس کا خاوند پہلے بھی کئی شادیاں کر چکا ہے (جو ور ریٹائرڈ ہوگئی) یا پھر اس کا شوہر اپنی جنسی کمزوری کو چھپانے کے لیے عورتوں کو بدلتا رہتا ہے۔ کئی شوہر مغربی تہذیب کی چکا چوند کے آگے اپنا سر خم کر لیتے ہیں اور نہ صرف خود بلکہ اپنی بیویوں کو بھی شراب اور منشیات کا عادی بنا دیتے ہیں یہاں تک کہ وہ ایڈز کے شکار ہو جاتے ہیں۔ (زندگی کی بھیک، زخمی پھول)۔ ماں باپ کے کرتوتوں کا خمیازہ بچوں کو بھی اٹھانا پڑتا ہے (سسکتی آرزو)۔ افسانہ نگار نے چند ایک افسانوں میں مذہب کے ٹھیکیداروں یعنی مولویوں کو اپنے تیر بہدف کا نشانہ بنایا ہے۔ افسانہ نگار کا ماننا ہے کہ یہ لوگ مذہب کی غلط تشریح کر کے اپنی لذت اور عیش و عشرت کا سامان جٹاتے ہیں۔ افسانہ 'باسی پھول' میں ساٹھ سالہ مولانا بیس پچیس سال کی لڑکی سے شادی کرنے کا متمنی ہوتا ہے اور ایک مطلقہ عورت کے پروپوزل کو یہ کہہ کر ٹھکراتا ہے۔ ''میاں مجھے باسی پھول کی ضرورت نہیں ہے۔''

ڈاکٹر فاروقی کے یہاں عورت کا کردار عام طور پر مظلومیت اور لاچاری کی تصویر پیش کرتا ہے۔ مشرقی عورت، چاہے وہ تعلیم یافتہ ہو یا ان پڑھ، اپنے شوہر کی خوشنودی کے لیے ہر ممکن کوشش کرتی ہے لیکن مرد اسے عورت کی کمزوری سمجھ کر اس کا فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس متعفن ماحول میں فردوس جیسی عورت اپنے موڈرن شوہر کو خیر باد کہہ کر اپنے بچے کی پرورش کرنے میں ہی نجات ڈھونڈتی ہے۔ افسانہ 'بوائے فرینڈ' کی سلمیٰ اپنے ظالم شوہر کی بیڑیوں سے خود کو آزاد کر لیتی ہے اور شوہر کو پانچ سال کی قید بھی دلواتی ہے۔ اسی طرح 'سوکھے پتے' کی سلمیٰ بھی شوہر کے ظلم و جبر سے آزادی پانے کی کوشش کرتی ہے۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

افسانہ 'بلندی' میں روزگار ڈھونڈ رہا اسلم امریکہ میں لٹ جاتا ہے اور پھر چوری کی پاداش میں پکڑا جاتا ہے۔ اس کے نیک چال چلن کو دیکھ کر ایک مجرم اس کا اثاثہ اور سرٹیفکیٹس لوٹا دیتا ہے اور ایک غیر ملکی اس کی تقدیر سنوارتا ہے۔ اس افسانے میں ڈاکٹر فاروقی نے اپنی مثالی اور رجائی سوچ وفکر کا ثبوت دیا ہے اور اس بات کو ذہن نشین کرنے کی کوشش کی ہے کہ لوگ اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی۔ اچھائی اور برائی کا تعلق کسی مذہب، فرقے یا نسل سے نہیں ہوتا۔ اسلم کے کردار کے برعکس 'ویلینٹر' کا شوکت ہمیشہ شیخ چلی کی مانند خواب دیکھتا رہتا ہے اور اپنی زندگی برباد کر دیتا ہے۔ اسی طرح افسانہ 'بجھتے چراغ' میں رشید تجہیز وتکفین کی صعوبتوں سے بچنے کے لیے اپنے والدین کو پہچاننے سے انکار کرتا ہے۔ چند ایک افسانوں کا موضوع دہشت گردی ہے وہ چاہے انفرادی ہو یا اجتماعی، حکومتی ہو یا افواجی۔ انہی حالات کے سبب صباح کو بیسا کھیوں کا سہارا لینا پڑتا ہے اور مریم کو اپنے بیٹے کی بے کفن لاش گھسیٹنی پڑتی ہے۔ 'خون پکار اٹھا' خونی، عید، روٹی کے ٹکڑے، دو گز زمین اور خون جلتا رہا اس نوع کی پر تاثیر کہانیاں ہیں۔

'اور خون جلتا رہا' کے افسانوں کے موضوعات جہاں اچھوتے اور دلکش ہیں وہیں افسانوں کی ٹریٹمنٹ اور زبان میں بہت ساری خامیاں نظر آتی ہیں۔ ہیئت کے حساب سے لگتا ہے کہ ڈاکٹر فاروقی کسی طے شدہ فارمولہ کے تحت افسانے رقم کرتے ہیں کیوں کہ ان میں کہیں کوئی بوقلمونی نظر نہیں آتی۔ ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ افسانہ نگار قاری کو محظوظ کرنے کے بجائے اس کو نصیحت کرنا اپنا فرض اولین سمجھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ افسانوں میں بہت سارے جاندار کردار بھی سپاٹ بن کر رہ گئے ہیں اور صرف افسانہ نگار کے نوک قلم کے تابع ہو کر رہ گئے ہیں۔ افسانے تحریر کرتے وقت جذباتیت سے کام لینا افسانوی تکنیک کے لیے مضر ہوتا ہے۔ دیکھا جائے تو راجندر سنگھ بیدی کے افسانے کرشن چندر کے افسانوں پر اسی لیے بھاری پڑتے ہیں کیونکہ ان میں جذباتیت کا فقدان ہے۔ اس کے برعکس ڈاکٹر فاروقی کے یہاں شدید جذبات نگاری ہے اور دل دہلا دینے والی منظر نگاری ہے جس کے باعث افسانوں کا تاثر کم ہو گیا ہے۔ جہاں تک زبان کی خامیوں کا تعلق ہے بہتر یہ ہوتا کہ افسانہ نگار کتاب شائع کرنے سے پہلے اپنا مسودہ اردو کے کسی نامور ادیب کو بھیجتے اور ان سے نظر ثانی کرنے کی درخواست کرتے۔ اس طرح گرامر اور املا کی غلطیاں متن میں نہیں رہتیں۔ مجھے امید ہے کہ دوسرا ایڈیشن نکالنے سے قبل ڈاکٹر فاروقی میری اس ادنیٰ گزارش کو ذہن میں رکھیں گے۔

مجموعی طور پر مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ زیر نظر افسانوں کا مجموعہ ایک اچھی کوشش ہے خاص طور سے مغربی سماج پر نئی روشنی ڈالنے کے حوالے سے۔ ڈاکٹر فاروقی کے پاس مشاہدہ بھی ہے اور مطالعہ بھی۔ اس لیے آئندہ بھی ان سے اچھے افسانوں اور افسانوی مجموعے کی امید کی جاسکتی ہے۔ ❖ ❖ ❖

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

نقطۂ نوگریز

ـــــ محمد خالد عابدی

حالانکہ اُردو میں منی افسانے (افسانچے) لکھنے کی روایت منٹو سے چلی آرہی ہے مگر اس طرف قلم کاروں نے زیادہ توجہ نہیں دی۔ دیکھا جائے تو شیخ سعدی کی حکایتیں بھی منی کہانیاں ہی تھیں جن میں نصیحتیں پوشیدہ رہتی تھیں۔ اس میدان میں جوگندر پال کا خاصا یوگدان رہا ہے۔ حال ہی میں محمد خالد عابدی کے منی افسانے جو ۱۹۸۴ء کے بعد تحریر کیے گئے ہیں کتابی صورت میں نقطۂ نوگریز کی شکل میں ہمارے سامنے آئے ہیں۔ ''ان کی وجہ تخلیق'' بقول مصنف ''تقلید، نقل، ناموری وغیرہ نہیں ہے بلکہ یہ منی کہانیاں ایک کیفیت، آمد اور نزول کی باعث رہی ہیں۔'' ان مختصر مگر جامع کہانیوں کے بارے میں دیوندر اسر فرماتے ہیں۔ ''عام طور پر ایسی کہانیوں کے بارے میں ہوتا یہ ہے کہ وہ منی تو ہوتی ہیں لیکن کہانی نہیں ہوتیں۔ ان کہانیوں میں ایسا نہیں ہے۔''

نقطۂ نوگریز میں ۴۸ منی افسانے شامل ہیں جو اردو اور ہندی میں یکجا شائع کیے گئے ہیں تاکہ دونوں نوع کے قارئین ان سے استفادہ کرسکیں۔ ان کہانیوں کے اہم موضوعات یوں ہیں۔ انسانی زندگی کی قدر وقیمت (زندگی نامہ، آدمی کا زہر، جنازے کا سرکاری ریٹ، معاوضہ، احمق، کہانی کی کہانی، یکمشت)؛ قدروں کی شکست وریخت (گھر کا شہر، بمپر انعام، کتبہ، کہانی کا جواب)؛ نفسیاتی وجنسیاتی کشمکش (زخم تمنا)؛

ناشر: مکتبہ عابدیہ، ۵۴۵، دل آرام ہاوس، ہوا محل روڈ، بھوپال۔ ۴۶۲۰۰۱ سن اشاعت: ۲۰۰۹ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

بے گھری (جڑوں کا پانی، پناہ گاہ)؛ غربت وافلاس اور غلامی (روٹی کا پیٹ، روٹی کی قیمت، پسینے کی مہندی، سچا جھوٹ اور جھوٹا سچ، جشن)؛ سماجی بدعتیں (جہیز، گل پیادہ، خوابوں کا طلسم، خوشبو کا ذائقہ)؛ سیاسی پینترے بازی (دھوپ کا موسم، ذہنی بلندی، پانسہ)؛ بے ایمانی اور رشوت خوری (مٹی میں سونا، کاغذ کا پیٹ)؛ ادبی دھاندلیاں (انتخاب، حضور آداب عرض ہے، فنکار)؛ شہرت پانے کی خاطر ڈرامے بازی (شہرت)؛ پولیس کی کارستانیاں (ہفتہ، آخری خواہش، مہاتماجی، پادری)؛ مذہبی فرقہ واریت (قومی ایکتا، صلیب بردوش، شہر نامہ، جغرافیہ کا شہر، ہم ایک ہیں، رات !رات!!، مذہب) اور آزادی کے بعد مسلمان شہیدوں کی فراموشی (جاں نثاران ہند، تمغوں کی ساکھ، خون کی پہچان)۔

جیسا کہ ظاہر ہے افسانہ نگار نے زندگی کے مختلف شعبوں کو اپنے منی افسانے کا موضوع بنایا ہے اور کہیں پر بھی اپنے آپ کو دہرایا نہیں ہے۔ خالد عابدی کے یہاں ترقی پسند رجحانات اور مقصدیت صاف طور پر نظر آتی ہے۔ وہ اپنے معاشرے کا تجزیہ بڑی باریک بینی کے ساتھ کرتے ہیں اور اس میں پل رہے ناسوروں کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔ ایسا کرتے ہوئے وہ منی افسانوں کی فنی لوازمات کو نظر انداز نہیں کرتے۔ ان کی زبان سلیس اور سادہ ہے اور طنز کی گونج قاری کے ذہن میں دیر پا رہتی ہے۔ ان منی افسانوں کے اختصار اور مکالموں کی چستی نے سونے پر سہاگا کا کام کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ محمد خالد عابدی کے قلم سے اور بھی کئی مجموعے مستقبل میں منظر عام پر آئیں گے۔

❖ ❖ ❖

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

پنجرے کا آدمی

—— رونق جمال

گزشتہ صدی میں افسانے کی کئی صورتیں ہمارے سامنے آئی ہیں مثلاً طویل افسانے مختصر افسانے مختصر ترین افسانے، منی افسانے اور یک سطری افسانے۔ تجربات تو ہوتے رہتے ہیں مگر زندہ وہی لٹریچر رہتا ہے جس میں قاری کو سحر زدہ کرنے کی طاقت ہو۔ حال ہی میں رونق جمال کے مختصر افسانوں کا (جو عام افسانوں سے قدرے چھوٹے ہیں مگر منی افسانوں کے زمرے میں نہیں آتے) ایک خوبصورت مجموعہ 'پنجرے کا آدمی' شائع ہو چکا ہے۔ اس میں چھپّن مختصر افسانے شامل ہیں۔ اس سے پہلے بھی موصوف کی آٹھ تصانیف منظر عام پر آ چکی ہیں۔ غلام احمد جمال جو رونق جمالؔ کے قلمی نام سے لکھتے ہیں ۵ مئی ۱۹۵۴ء کو کھولا پور، امراوتی، مہاراشٹر میں پیدا ہوئے اور پچھلے پینتیس سالوں سے اردو ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ اردو میں مختصر افسانے کی ترویج میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔

بقول قاضی مشتاق احمد ''رونق جمال نے اپنے اردگرد کی دنیا کو غور سے دیکھا ہے۔ ان کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا ہے اور جو کچھ بھی لکھا ہے صدق دل سے لکھا ہے۔'' رونق جمال کے موضوعات کا تنوع کہیں پر اکتاہٹ محسوس نہیں ہونے دیتا۔ انوکھا خواب میں اجتماعی گناہ، آدمی کا زہر میں آدمی سے کتّے کا ڈرنا، جیب تراش میں خود اپنی بازیافت، ضمیر کی نیند میں گناہوں سے توبہ کرنا، ایک معمہ میں جذبۂ انسانیت، خوش

ناشر: زرین پبلی کیشنز، پی۔۵، آدرش نگر، درگ (سی جی) ۴۹۱۰۰۱ سن اشاعت: مئی ۲۰۰۸ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

نصیب کتے میں انسانوں اور کتوں کا موازنہ، پنجرے کا آدمی میں ضمیر کو جگانے کی ضرورت، آنسوؤں کا رشتہ میں بھائی بہن کے رشتے کا تقدس، انجام میں دولت کی لالچ، یاسمین میں عورت کا عزم، ایثار میں کرائے کی کوکھ، اور ٹرین چلتی رہی میں غریب بکھارن کا چلتی ٹرین سے گر کر مر جانے کے باوجود ٹرین کا چلتے رہنا، دل کا معاملہ میں نرینہ جبریت اور عورت کا ایثار، شریف آدمی میں انسانی سرشت کا اظہار، مالدار بھکاری میں افراط دولت سے پیدا شدہ دیوانگی، ہائے بیچاری اردو میں اردو والوں کی دوغلی پالیسی، رزق حلال میں طوائف کی کمائی کا احتساب، شارٹ کٹ میں فرقہ وارانہ فسادات میں پیسے کا رول، نجات کا راستہ میں بھوک سے نجات کی دعا اور ہم دونوں میں ضعیف العتقادی ایسے موضوعات ہیں جو عصری بھی ہیں اور ہنگامی بھی۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ کہیں پر بھی افسانہ نگار اپنے آپ کو دہراتا نہیں۔ غرض یہ کہ ہر مختصر افسانے کا موضوع بھی الگ ہے اور ٹریٹمنٹ بھی۔

چنانچہ رونق جمال مقصدی ادب کے قائل ہیں اس لیے وہ اپنے افسانوں میں سماجی وسیاسی بدعنوانیوں اور طبقاتی و مذہبی کشاکشی پر خاص طور سے روشنی ڈالتے ہیں۔ افلاس وغربت اور مذہبی تصادم پر انہوں نے کئی خوبصورت مختصر افسانے قلمبند کیے ہیں۔ پارٹیوں میں فضول خرچی (دوستی کی لاج)، نرینہ اولاد نہ ہونے کے سبب دوسرے کا بچہ چرانا (قدرت اور اولاد)، سیاسی رہنماؤں پر قدرت کا قہر (بے ایمانی کا طوفان)، فرقہ وارانہ فسادات میں ہوٹل کلرک کا ایک مسلمان کی جان بچانا (فرشتے)، ایماندار آدمی کی لاچارگی (جمہوریت کا جال)، مولوی صاحب کی مکاری (تناور حریف)، نواب صاحب کی بداخلاقی (اعتماد کا کرب)، جہیز کی لعنت (حق)، فرقہ وارانہ بہیمیت (ذائقہ)، کاسٹنگ کوچ (شرط)، غربت کے باعث جسم بیچنا (آج کل)، رشوت خوری (تجربہ کار)، گنڈہ گردی اور لوٹ کھسوٹ (دوسرا سین)، سیاسی شعبدہ بازی (اے کاش)، امیر وغریب میں تفاوت (رقص)، چہرے در چہرے (شرافت چھوڑ دی میں نے)، جہیز کی لاچاری (مجبوری)، مہنگائی (ناگن)، گورنمنٹ کی بے توجہی (سب ٹھیک ہے)، جہیز کے لیے ذہنی گراوٹ (لاشوں کا کاروبار)، دولت کا کرشمہ (بڑے میاں سبحان اللہ)، بہنوں کی دلالی (نیا بزنس) اور میچ فکسنگ (راز کی بات) ایسے موضوعات ہیں جن میں معاشرے کو آئینہ دکھانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے حالانکہ چند ایک افسانوں میں افسانہ نگار نے ناصح کا کام کرنے کی بھی کوشش کی ہے جو عصری تقاضوں کے خلاف ہے۔

افسانہ جیب تراش میں ایک آدمی دوسرے ضرورت مند آدمی کی مدد تو کرتا ہے مگر ساتھ ہی یہ تاکید

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

بھی کرتا ہے کہ جب کبھی مستقبل میں کوئی اور ضرورت مند اسے مدد مانگے تو وہ بھی ایسا ہی کرے۔ افسانہ نگار نے کچھ افسانوں میں ہندستانی ویلفیئر سوسائیٹی کے تناظر میں مسلم سماج کے حقوق کا تعین بھی کرنا چاہا ہے۔ جنس، خاص کر تزویج محرمات، کے حوالے سے بھی کئی خوبصورت افسانے رقم کیے گئے ہیں جیسے بے وقوف، نقش قدم، شناخت اور سرٹیفکیٹ۔ البتہ کچھ افسانے ٹریٹمنٹ کے سبب لطیفے بن کر رہ گئے ہیں مثلاً قوس قزح، امتحان کے رنگ، نقش ثانی، درد کی دوا، قتل کا موسم، دوسرا بھکاری، خوب صورت فتنے، چوکون اور انتقام۔ چند موضوعات اپنے اندر اتنی وسعت رکھتے ہیں کہ افسانے کا اختصار ان کی نمو کے لیے رکاوٹ بن چکا ہے۔ کہیں کہیں ہندستانی عورتوں کی ایذا پسندی (masochism) سامنے آتی ہے جو ہمارے نرینہ عصبی سماج کی خصوصیت ہے۔

رونق جمال طنز کا استعمال بڑی خوبصورتی سے کرتے ہیں۔ آدمی کا زہر میں لکھتے ہیں ''تمہارا یہ کتا آدمی ہو گیا ہے..... میرا مطلب ہے اسے آدمی کا زہر چڑھ گیا ہے''۔ اور ٹرین چلتی رہی میں مکالمہ یوں درج ہے ''ایک بکھارن کے لیے مفت میں ٹرین لیٹ کرنا ٹھیک نہیں''۔ افسانہ یاسمین میں مربوط پلاٹ کی تشنگی کا احساس ہوتا ہے جبکہ مالدار بھکاری میں پیسہ پیسہ کی ضرورت سے زیادہ تکرار نظر آتی ہے۔ صفحہ ۸۹ پر فرسٹ کلاس وتھ ڈیز ٹیشن ان پولیٹکل سائینس اور صفحہ ۱۳۹ پر خوداری غلط لکھا گیا ہے جبکہ صحیح الفاظ 'ڈسٹنکشن' اور 'خودداری' ہیں۔

رونق جمال کی زبان سلیس اور عام فہم ہے۔ وہ رمز و کنایہ اور استعارہ سے پرہیز کرتے ہیں۔ اس لیے ان کے یہاں ترسیل کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ ان کے یہاں اعلا فن کاری بھی ہے اور گہرا مشاہدہ بھی ہے۔ ان کا ذہن رجائیت پسند ہے اور مزاج سیکولر۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر وہ اسی طرح لکھتے رہے تو اردو ادب میں ان کا نام اہم معاصر افسانہ نگاروں میں ہمیشہ لیا جائے گا۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

نئی صبح

ڈاکٹر ایم اے حق

افسانے کی روایت کوئی زیادہ پرانی نہیں ہے تاہم ان سوسوا سوسالوں میں خاص طور پر دورِ جدید میں اس صنف میں کئی تجربے کئے گئے۔ پلاٹ، مکالموں، کرداروں، کلائمیکس اور ہئیت میں تبدیلیاں کی گئیں۔ کچھ بامعنی اور کچھ بے معنی۔ جدید افسانہ نگاروں نے ایک جانب کہانی سے کہانی پن چھین لیا اور دوسری جانب مغربی افسانہ نگاروں کی تقلید میں اس زعم کو پالنے لگے کہ قارئین کے پاس پڑھنے کے لیے وقت نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے مغربی قارئین کے بارے میں یہ بات صحیح ہو مگر ہمارے ملک میں ابھی تک ایسا کوئی انقلاب نہیں آیا جس کے باعث قارئین عدیم الفرصت ہو گئے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ رسالوں کے مدیران نے دانستہ طور پر اس نہج کو ترویج دی کیوں کہ اس طرح وہ زیادہ سے زیادہ قلمکاروں کو اپنے رسالوں میں جگہ دے سکتے ہیں۔ خیر مدعا جو بھی رہا ہو، منی افسانہ یا افسانچہ اب ایک حقیقت بن چکا ہے اور اس صنف نے اپنی الگ پہچان بنائی ہے۔

ڈاکٹر ایم اے حق کا لکھا ہوا منی افسانوں اور مختصر افسانوں کا ایک خوبصورت مجموعہ 'نئی صبح' حال ہی میں منظرِ عام پر آچکا ہے۔ ضلع دمکا، جھارکھنڈ میں پیدا ہوئے ایم اے حق نے بحیثیت شاعر (تخلص جوہر)

ناشر: ثریا پبلی کیشنز، حق منزل، غوث کمپاؤنڈ، سنٹرل اسٹریٹ،
ہند پیڑھی، رانچی۔ ۸۳۴۰۰۱۔
سن اشاعت: ۲۰۱۰ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ادبی میدان میں قدم رکھا مگر وہ جلد ہی نثر کی طرف مائل ہو گئے۔ ابتدا میں بچوں کے لیے لکھنے لگے لیکن ۱۹۶۸ء سے افسانے تحریر کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کے زیر سایہ اور جدید رجحان کے مدِ نظر انہوں نے جذباتیت اور بیانیہ کو ترک کر کے منی افسانوں کی طرف زیادہ دھیان دیا جس کا ثمر 'نئی صبح' کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔

منی افسانے کی تعریف میں برصغیر کے نامور افسانہ نگار جوگندر پال 'نئی صبح' کے پیش لفظ میں فرماتے ہیں: ''افسانچے کے اختصار کا اہم ترین پہلو یہی ہے کہ اُس کے معانی افسانچہ نگار کے دوٹوک فیصلے کے بجائے قاری کے تخلیقی تجسس سے انجام پاتے ہیں۔'' زیر نظر مجموعے کے افسانچوں کا غور سے مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ایم اے حق کے بیشتر افسانچے اس کسوٹی پر کھرے اترتے ہیں۔ وہ زندگی کے اہم اور غیر اہم شعبوں کو اپنے افسانچوں کا موضوع بناتے ہیں اور بیشتر افسانچوں میں سماجی معنویت کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ انہوں نے کئی معاصر مسائل پر قلم اٹھایا ہے جیسے جہیز (پسند)، مکر و فریب (چسکا)، فرقہ واریت (سمجھوتہ، اپنوں کا دشمن)، غنڈہ گردی (رنگ داری)، مہنگائی (مایوسی)، خود غرضی (بے چینی، لاشعور، پریمیم، ارادے، میں، دھوپ چھاؤں، پرسہ، سیلفش،) ذات پات (نفرت کی زنجیر) کنبوں کی ٹوٹ پھوٹ (دستور، آخری تحفہ)، سوشل سیکورٹی (تحفظ) بچوں کی مزدوری (قانون)، حرص و لالچ (لاعلاج، اپنی کلہاڑی اپنا پیر، ان بجھی پہیلی)، رشوت خوری (الزام، کرپشن) اور سیاسی شعبدہ بازی (طمانچہ)۔ چند افسانچے انسانی نفسیات پر بھی رقم کیے گئے ہیں مثلاً پسند، خلافِ توقع، تسکین، دیش بھکت، ھُنہ، جواب، نفرت و ندامت اور سراب۔ 'معمول' ایک خوبصورت افسانچہ ہے جس کا لب لباب یہ ہے کہ ہماری زندگی چیونٹی کی چال چلتی ہے اور دس روز پہلے کی خبر آج بھی تازہ لگتی ہے۔ افسانہ 'شفقت' میں باپ کی شفقت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے یہ اقتباس:

> ''میں نے اس بیماری کے علم میں آتے ہی زہر کی ٹکیا احتیاطاً خرید کر رکھ لی تھی کہ جیون جب موت سے بھی کٹھن ہو جائے تو اس کا انت کر دوں گا۔ لیکن جیون پھر بھی جیون ہے۔ کشٹ سہہ کر بھی جینے کی تمنا انسان میں سماپت نہیں ہوتی ہے۔''

'مجرم' میں بیٹی ریلوے ٹائیلٹ میں اپنے باپ کی لکھی گندی عبارت پہچانتی ہے جسے باپ کی اصلیت کا بھانڈا پھوٹ جاتا ہے۔ 'رزق' میں کریم کی بیوی شوہر کے دونوں ہاتھ کٹ جانے پر غمگین ہونے کے بجائے خوش ہوتی ہے کہ چلو اب بھیک مانگ کر وہ کنبے کا پیٹ تو پال سکتا ہے۔ ایسی ہی خوشی افسانہ 'نئی صبح'

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

میں ہنگامے میں مرنے والوں کے لواحقین کو بھی ہوتی ہے جب انہیں یہ پتہ چلتا ہے کہ انہیں حکومت دو لاکھ روپے دینے والی ہے۔انسانی حرص وطمع کی دلگداز تصویریں!

زیرِ نظر کتاب میں چند مختصر افسانے بھی شاملِ اشاعت ہیں لیکن ان کو پڑھ کر کچھ تشنگی برقرار رہتی ہے۔کئی افسانوں کی ٹریٹمنٹ میں افسانہ نگار نے عجلت سے کام لیا ہے۔'خول' ہمارے معاشرے پر بھرپور طنز ہے کہ کیسے ہم اپنی جھوٹی شان رکھنے کے لیے ایک دوسرے کو دھوکہ دیتے ہیں۔'گزرے لمحے' راجندر سنگھ بیدی کی کہانی 'لاجونتی' کی یاد دلاتا ہے۔'فریب' میں بھی ایک باپ اپنے بیٹے کے لیے امیر رشتہ ڈھونڈنے کے لیے مکروفریب سے کام لیتا ہے۔یہاں میں افسانہ نگار کو ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں۔افسانہ شروع کرنے سے پہلے یہ طے کرنا اہم ہے کہ کیا یہ موضوع اتنا مختصر ہے کہ افسانچے کا روپ دھارن کر سکے یا پھر اس میں اتنی وسعت ہے کہ اس کا افسانہ بنایا جائے۔پہلی صورت میں غیر ضروری منظر نگاری اور بیانیہ سے پرہیز کرنا لازمی بن جاتا ہے جبکہ دوسری صورت میں اختصار کے ساتھ بیانیہ، منظر نگاری اور مکالمہ نگاری کو برتنا ضروری ہے۔

ایم اے حق کی زبان میں شستگی اور سلاست ہے۔مکالمے چست ہیں۔دیکھا جائے تو جدیدیت پسند ہو کر بھی ان کے یہاں منصوبہ بند پلاٹ اور کہانی کا اتار چڑھاؤ ملتا ہے۔ان کا مطالعہ اور مشاہدہ گہرا ہے جس کے باعث افسانچوں میں کافی رنگارنگی پائی جاتی ہے۔امید ہے کہ وہ آگے بھی اردو ادب کو مالا مال کرتے رہیں گے۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

باریکہ

ــــــ داکٹر ساغر جیدی

ڈاکٹر ساغر جیدی کا تجریدی نثر پاروں کا مجموعہ 'باریکہ' دور جدید کی بازگشت بن کر ہمارے سامنے آیا ہے۔ ساغر جیدی وضاحتی اور کھلے بیانیہ سے پرہیز کرتے ہیں کیونکہ وہ اپنے فکر وخیال کو استعاروں اور علامتوں کے دبیز پردوں میں ملفوف کرنے کے قائل ہیں۔ انہوں نے عربی اور فارسی الفاظ وترکیبات کا بہ کثرت استعمال کیا ہے اور انہیں نئے معنی عطا کیے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے تلمیحات سے بھی استفادہ کیا ہے۔ چانچہ مقدمے میں تحریر کرتے ہیں۔ ''میرے 'باریکہ' کو انصاف پسندی کے رنگ زیادہ پسندیدہ ہیں اس لیے یہ فراخ فن کے نمونے اجاگر کرتا ہے۔ اس پر شک کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ کے روزمرہ بلا دفن کے رکھے گئے ہیں۔ ادراک کو آسیائے سنگ میں پسنے کی ضرورت نہیں۔''

ڈھلتی عمر، زندگی کے کھوکھلے پن اور بے سود جہد بقا کے بارے میں 'خاک قطرہ گہر خاک' میں نثر نگار یوں رقم طراز ہیں: ''اب بیکراں آرام وسکوں کا طالب ہوں، اب یہی آخری آرزو کے لمحے میں مسافت طے ہو جائے اور چشمۂ خوں خشک ہو جائے۔ بہت دیکھ چکا گیاہ کا کاہ ہونا۔ خرس کا درد شکم سے بے قابو ہو جانا، مختلف امتحان۔''

استعاروں اور تلمیحات کا استعمال کرنا ایک خوش گوار بات ہے۔ ان کے توسط سے ادیب بہت کچھ کہہ جاتا ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ ان کے استعمال میں ادیب کو احتیاط برتنے کی ضرورت ہے۔ اگر

ناشر: رائلسیما اردو رائٹرس فیڈریشن ۲۰/۳۶۹، مشتاق ولی سٹریٹ، کڈپا ۵۱۶۰۰۱ سن اشاعت: ۲۰۰۷ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

استعاروں کو سمجھنے کے لیے باب کے آخر میں کلیدی اشارے دینے کی ضرورت پڑے تو ادیب قاری کے ساتھ ناتا جوڑنے کے بجائے اسے قطع تعلق کرنے کی فراق میں نظر آتا ہے۔ یہ بات سچ ہے کہ تجریدی فن کار، وہ چاہے مصور ہو، سنگ تراش ہو یا پھر ادیب، اس بات کا قائل ہے کہ وہ اپنے جذبات اور فکر وخیال کا پابند ہے جس کا وہ اظہار کرتا ہے۔ اس لیے قاری کو اس کی تخلیق سمجھنے کے لیے بقول دریدا حساب کے سوال کی طرح حل ڈھونڈنا پڑے گا چاہے اس میں کڑی سے کڑی محنت اور ذہنی مشقت ہی درکار کیوں نہ ہو۔ اس ضمن میں میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ادب قاری کو نشاط اور آنند مہیا کرنے کے لیے ہے نہ کہ کائنات کی گتھیاں سلجھانے کے لیے۔ یہ کام علم الحساب، فلسفے، کیمیات یا پھر طبعیات کا ہوسکتا ہے، ادب کا ہرگز نہیں ہے۔

تجریدی قلمکار کتنا ہی 'فرد' اور 'ذات' کی باتیں کیوں نہ کرے وہ سماج اور اپنے ماحول کو نظر انداز نہیں کر پاتا۔ اس کی تخلیقات میں محبس معاشرے کی تلخیاں عود کر آتی ہیں۔ ساغر جیدی نے 'باریکہ' میں 'سرد تہذیب' کی نقاب کشائی بھی کی ہے اور انسانیت کے مرجانے کا نوحہ بھی لکھا ہے۔ 'لائیٹنگ نامہ' موجودہ تکنالوجی پر طنز کے تیر برساتا ہے جبکہ 'اشتہار' میں ان عورتوں پر چوٹ کی گئی ہے جو بظاہر شریف نظر آتی ہیں لیکن بہ باطن فاحشہ ہوتی ہیں۔ '7000' میں نثر نگار اپنے معاشرے کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

''ہمارے کہنے پر تو لوک سبھا اور ودھان سبھا تک بھنگ ہوجاتی ہے اور بم دھماکوں کے ملزم آزاد کردیے جاتے ہیں۔ سکیولرازم کا تحفظ تو ایسے ہی ہوتا ہے۔ ملکوت! یہ وطن کی توہین ہے۔'' ایک اور جگہ فرماتے ہیں۔ ''مجھے معلوم ہے کہ جتنے فرقہ پرست ہیں، دہشت گرد ہیں، آپ کے بنائے ہوئے ہیں۔ میں اپنا ہر الزام دوسروں پر توڑتا ہوں۔ روز روز نئے انتخابی وعدے کرتا ہوں۔ عوام کی تائید حاصل کرنے کے لیے بدل بدل کر بیانات دیتا ہوں۔ اتنا ہی نہیں تہہ دل سے ڈاکوؤں اور سمگلروں کی پشت پناہی کرتا ہوں۔ میں سیاسی پارٹیوں میں خانہ جنگی کرواتا ہوں۔ اندھے لوگوں کو ہی نہیں زنخوں کو تک پارٹی ٹکٹ دے کر انہیں کامیاب کراتا ہوں۔''

دہشت گردی کے تناظر میں مندرجہ ذیل فقرے گہری معنویت کے حامل ہیں۔

''اب ہمارا محافظِ حقیقی خوف ہی ہے۔'' (بوڑھے قیدی)

''دہنِ شیر میں گھسے ہوئے مگس ہی جانتے ہیں کہ موت کا مزہ کیا ہوتا ہے۔''

(دیپک راگ)

''ہر جگہ جنگ ہوسکتی ہے چاہے وہ مقدس مقام ہو چاہے غیر مقدس۔'' (مغائر)

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

زیرِ نظر نثر پاروں میں سے کچھ اقتباسات میں یہاں پر درج کرتا ہوں تا کہ قارئین ان کی گہرائی اور گیرائی کا اندازہ خود لگا سکیں۔

- وہ زبان حال سے کہہ رہے تھے کہ ''انسانیت کب کی مر چکی ہے، اگر کوئی کہے کہ انسانیت زندہ ہے تو وہ بہت بڑا جھوٹا ہے۔'' (بہت بڑا جھوٹ)
- میری رگ رگ میں جو مکاری ہے، عیاری ہے، انسانیت کی فلاح کے لیے عزّ و وقار سے بھی معالقہ لے سکتی ہے۔'' (ذریعہ آمدنی)
- درندوں کا معاشرہ ایسا ہی ہوتا ہے، یہ جاہل معاشرہ پشت در پشت چلا آتا ہے۔ دیکھنے میں بڑا سادہ لوح ہوتا ہے۔ ان کو دولت کمانے کے فنون میں بڑی مہارت ہے۔
- کوئی جانور توریت، زبور، انجیل، وید و پاژند سے واقف نہیں ہو سکتا، یہودیت سے جھینگر واقف نہیں، عیسائیت سے آریہ دھرم سے وابستہ نہیں، برہمو سماج کو عقاب نہیں جانتا، اگر یہ سب، میں جنگل میں تلاش کروں تو نظر تھک کر ناکام ہو کر لوٹ کر آجائے گی۔ یہ حقیقی فلسفہ ہے۔ (دیپک راگ)
- اب ہم میں شک وشبہ کی فصل کاٹنے والا موجود نہیں رہا۔ اندھے واقعات سے ہم سب راضی ہو گئے اور ہر تو تلی رائے سے متفق۔ کیونکہ ہماری نظر فرشتے اور انسان میں تفریق نہیں کر رہی ہے۔ یہ راز ہمارے سینوں میں بچپن ہی سے بویا گیا تھا۔ یہ تماشہ ہمیں پسند نہیں تھا۔ یہ بات غلط بھی نہیں ہے تاہم سفر جاری ہے۔ (عنکبوت کی انگلیوں میں تسبیح)
- دراصل وہ لوگ اپنی ایک طمانیت کی تاریخ لکھنا چاہتے ہیں، یعنی اپنی غیر شائستہ آواز سے کئی مست سانپوں کا زہر نچوڑنا چاہتے ہیں، سب کو معلوم ہے کہ ان کے بے دریغ ہلاک کرنے والے چاقو ماتھے کا پسینہ صاف کرنے میں کام نہیں آسکتے۔ ان کا ہر واقعہ من وعن زبانوں پر شائع ہو گیا۔ (ہمارے ضمیروں نے کہا)

مجموعی طور پر 'باریکہ' ان انٹلکچول قارئین کو فوکس کرتی ہے جو ادب سے صرف حظ حاصل نہیں کرنا چاہتے ہیں بلکہ وجودی حقیقتوں سے بھی نبرد آزما ہونا چاہتے ہیں۔ مجھے پوری امید ہے کہ ڈاکٹر ساغر جیدی اپنی اس کاوش میں کامیاب ہو جائیں گے اور اپنے دل کی بات قارئین کے دلوں میں منتقل کر پائیں گے۔

❖ ❖ ❖

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

سنگ ریز ہوائیں

رشید انجم

اردو فکشن میں جہاں افسانہ چند ہی دہائیوں میں اوج کمال تک پہنچ گیا، وہاں ڈرامے کی طرف بہت کم قلمکاروں نے توجہ دی۔ اس کی بنیادی وجہ ہے؛ اسلام میں مذہبی کرداروں کو اسٹیج پر پیش کرنے کی ممانعت، اردو میں اساطیری روایات کی کمی اور عام طور پر اپنے کنبے کے ساتھ تھیٹر جانے سے پرہیز۔ اس کے باوجود دیہی علاقوں میں نوٹنکی اور رام لیلا کی روایت نے فوک تھیٹر کو زندہ رکھا جبکہ ممبئی اور کلکتہ جیسے میٹروپولیٹن شہروں میں انیسویں صدی میں باقاعدہ تھیٹر کی بنیاد پڑی اور سینما کے چلن تک ڈرامہ پھلتا پھولتا رہا۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ڈرامہ نگاروں نے نکڑ ناٹکوں اور تھیٹر کے ذریعے عام لوگوں کو بیدار کرنے کی کوشش کی مگر سینما نے آہستہ آہستہ ان تھیٹروں کو نگل ڈالا اور اس طرح ڈرامے کی جانب جو توجہ دی جانے لگی تھی وہ منقطع ہوگئی۔

ڈرامے کی چند اہم ضرورتیں یوں ہیں: (۱) اس میں ایک کسا ہوا پلاٹ ہو (۲) ایک دوسرے سے جوجھتے ہوئے مضبوط کردار ہوں (۳) اسباب فتنہ ہو (۴) جاندار مکالمے ہوں (۵) ڈرامائی واقعات کسی جھول کے بغیر منتہا کو پہنچیں اور پھر (۶) المیہ یا طربیہ انجام ہو۔ اس سے بھی اہم بات یہ کہ ڈرامہ ایک مقررہ اور مختصر وقت میں اسٹیج پر کھیلا جا سکے تاکہ سامعین کی توجہ پورے ڈرامے کے دوران صرف ڈرامہ پر

ناشر: مصنف، ۴۷، کاشانہ، اسلام پورہ، بھوپال، ایم پی۔ ۴۶۲۰۰۱ سن اشاعت: ۲۰۰۸ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ہی مرگوزر ہے۔ بیسویں صدی میں مغربی ادب میں چند ایک ڈرامہ نگاروں نے ایسے بھی ڈرامے تحریر کیے جن کو اسٹیج پر کھیلا جانا بعید از قیاس تھا تاہم وہ بحیثیت ڈرامہ پڑھے جاسکتے تھے اور ان کی قرأت، منظر نگاری، کرداروں اور مکالموں سے قاری محظوظ ہونے لگا۔ اسی روایت کو رشید انجم نے 'سنگریز ہوائیں' رقم کر کے آگے بڑھایا ہے۔ پانچ سو چار صفحات پر محیط یہ ڈرامہ مغلیہ دور کے آخری ایام، جس کو عہد زوال کہنا زیادہ مناسب ہوگا، پر مبنی ہے اور ظاہر ہے کہ ان میں جو مناظر اور واقعات پیش کیے گئے ہیں ان کو اسٹیج پر پیش کرنا بہت مشکل ہے۔ البتہ اس ڈرامے کو ٹیلی وائز کرنا یا اس پر مشتمل فلم بنانا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

۱۰ فروری ۱۹۴۰ء کو بھوپال میں جنمے رشید انجم معروف شاعر اور نثر نگار ہیں۔ اس کے علاوہ موصوف رقص، اداکاری اور فلموں سے بھی جڑے رہے۔ رشید انجم کے ۷ ایڈونچر ناول، ۵ ڈرامے، ایک افسانوی مجموعہ اور ایک فلمی مضامین کا مجموعہ اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ بسیار نویسی کے باوجود ان کی تخلیقات میں کہیں کوئی جھول نظر نہیں آتی اور نہ ہی ایسا لگتا ہے کہ وہ محض بھرتی کے لیے اشعار یا نثر قلمبند کرتے ہیں۔

ڈرامہ 'سنگ ریز ہوائیں' ۱۸۵۷ء کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ اس کو تحریر کرنے کے لیے بہت محنت اور لگن سے کام لیا گیا ہے جس کا اندازہ حوالہ جات (کتابیات) سے لگایا جاسکتا ہے۔ کتاب کی ابتدا میں حرف حرف زندگی، کے تحت ڈرامہ نگار نے زیر نظر ڈرامہ رقم کرنے کی غرض وغایت، اس کے تواریخی پس منظر اور سیاسی حالات سے آگاہ کیا ہے جو ڈرامہ سمجھنے کے لیے کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ خوش آئند بات یہ ہے کہ رشید انجم اردو ڈرامے کے روشن مستقبل کے خواہاں ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> ''اردو ڈرامہ، وہ چاہے تجارتی اصولوں کی خاطر ہو (جیسا کہ فلم، ریڈیو اور ٹی وی میڈیا) یا محض شوق پورا کرنے کے لیے ہو (جیسا کہ دہلی سے ممبئی تک اسٹیج کی دنیا)، زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔ اور ہم جیسے سر پھرے اپنے قلم سے اسی طرح اردو ڈرامے کو زندہ رکھے رہیں گے۔''

اس ڈرامے کی شروعات بہرام گڈھ سے ہوتی ہے جہاں حب الوطنی کی چنگاری نواب شوکت یار جنگ کے محل کو خاکستر کر دیتی ہے۔ اس کا بیٹا سکندر یار جنگ قوم پرست طاقتوں کا ہیرو بن کر ابھرتا ہے اور کئی جیالے جیسے عبداللہ اور وشمبر سنگھ اپنی جان کی بازی لگا کر اس کا ساتھ دیتے ہیں یہاں تک کہ آخر کار خود نواب شوکت یار جنگ کی سوچ میں بھی تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ سکندر یار جنگ انگریزوں سے خود کو بچا کر بھوپال چلا جاتا ہے جہاں بیگماتِ بھوپال انگریزوں سے مفاہمت کرنے میں ہی اپنا اور اپنی ریاست کا بھلا

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

سمجھتی ہیں۔ تاہم سکندر اپنے ارادوں کو مضبوط کرتا ہوا دہلی دربار میں وزیر اعظم کے توسط سے مشاعرے کی آڑ لے کر بادشاہ تک رسائی پاتا ہے اور بوڑھے بادشاہ کے ضمیر کو جگاتا ہے۔ اس مشاعرے میں غالبؔ، داغؔ، شیفتہؔ وغیرہ مشہور و معروف ہستیاں شریک ہوتی ہیں۔ ان ہی دنوں میرٹھ اور دہلی کے گرد و نواح میں فوجیں بغاوت کرتی ہیں اور فوجی تلنگے دہلی میں جمع ہو کر بہادر شاہ ظفر کو ہندوستان کا شہنشاہ اعلان کر کے انگریزوں کے ساتھ لوہا لیتے ہیں۔ ایسی ہی بغاوتیں اودھ، جھانسی اور ہندوستان کے دیگر علاقوں میں بھی وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ کہیں انگریز جیت جاتے ہیں اور کہیں پسپا ہو جاتے ہیں۔ دہلی میں اس بغاوت کا سربراہ شہنشاہ کا بیٹا مرزا مغل، اور سپہ سالار، انگریزی فوج کا بھگوڑا جنرل بخت خان ہوتا ہے جو بہادری کے باوجود ہار جاتے ہیں۔ آزادی کی یہ لڑائی لوٹ کھسوٹ اور مار کاٹ میں تبدیل ہو جاتی ہے اور سارا دلی شہر افراتفری کی زد میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ بالآخر جیت انگریزوں کی ہوتی ہے۔ اس جیت کا سبب بادشاہ کی خود غرض بیوی زینت محل، نمک حرام سمدھی مرزا الٰہی بخش اور حکیم احسن اللہ خاں اور بہت سارے مخبروں کی کارستانیاں بھی بن جاتا ہے۔ سکندر، بخت خان اور عبداللہ اس لڑائی میں بچ تو نکلتے ہیں مگر ایک ایک کر کے بچھڑ جاتے ہیں۔ سکندر پہلے اپنی بہن روپا سے ملنے میں کامیاب ہوتا ہے، پھر اپنی معشوقہ عینی سے، جو لڑتے لڑتے اپاہج ہوئی ہوتی ہے، مگر وہ آخرش اپنی بہن ثریا سے ملنے بہرام گڑھ جاتے جاتے اپنی زندگی کی آخری لڑائی ہار جاتا ہے۔ عبداللہ اور عینی کو ٹھگ مار دیتے ہیں اور سکندر اکیلا رہ جاتا ہے۔ اپنے ماضی کا محاسبہ کرتے ہوئے سکندر ٹوٹ جاتا ہے اور اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ وہ انگریزوں سے نہیں ہار سکا بلکہ خود اپنوں نے اسے اس حالت تک پہنچا دیا۔

'سنگریز ہوائیں' کو اعلیٰ ڈرامہ بنانے میں جو خصوصیات کارآمد ثابت ہوئیں وہ یوں ہیں۔ (۱) وسیع حوالہ جاتی مطالعہ (۲) تواریخی شعور (۳) آخری مغلیہ عہد کی اور بیگماتی زبان پر مکمل قدرت (۴) چست اور برجستہ مکالمے (۵) مخصوص و مناسب منظر نگاری۔ ڈرامہ کا انوکھا پہلو یہ بھی ہے کہ اس کا ہیرو سکندر مع اپنے محسن بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے میدان جنگ میں ناکام رہتے ہیں مگر پھر بھی ان کی حوصلہ مندی، اعلیٰ ہمتی اور حب الوطنی انہیں پرستش کے قابل بناتی ہے۔ ڈرامہ نگار نے اس وقت کے ہندوستانی تناظر، نفسا نفسی، آپسی چپقلش، درباری سازش، مخبری اور بددیانتی پر بڑی ہی فنی عمدگی کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ اس بات سے بھی پردہ اٹھ جاتا ہے کہ آزادی کی اس لڑائی میں سربراہوں کی عدم موجودگی، نصب العین کی کمی اور جنگی تیاریوں کے فقدان کے سبب مٹھی بھر انگریزوں کی فوج اور ہندوستانی موقع پرستوں کے سامنے حب الوطن ہندوستان کی کئی

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

گنا زیادہ فوج گھٹنے ٹیک دیتی ہے۔ ڈرامہ ان وجوہات کو قاری کے ذہن پر ثبت کرنے میں پوری طرح کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس موضوع کے علاوہ بھی ڈرامے میں چند ذیلی مسئلوں پر فوکس کیا گیا ہے جیسے ستی پرتھا، مذہبی کٹر پرستی ابن الوقتی، وغیرہ

ڈرامہ چنانچہ طویل ہے اس لیے مجھے یہ احساس ہوا کہ مصنف نے پروف ریڈنگ میں کوتاہی سے کام لیا ہے۔ متن میں کمپوزنگ کے وقت کئی غلطیاں در آئی ہیں جن کا تدارک کرنا ضروری تھا۔ کہیں کہیں انگریزی عبارت جوں کی توں لکھنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن بہتر یہ ہوتا کہ اس عبارت کو اور بجنل ماخذ سے کمپیئر کیا جاتا۔ محاورات کی نظر ثانی بھی ضروری ہے۔ دو مثالیں (۱) بیوی خیلا ایک اجلا ایک میلا (صحیح: بیوی خیلا دو چٹے ایک میلا۔ بحوالہ فرہنگ فیروز اللغات) (صفحہ 358) (۲) چپے بھر کی کوٹھری میاں حوالدار (صحیح: چپے جتنی کوٹھڑی میاں محلدار بحوالہ فرہنگ فیروز اللغات) (صفحہ 359)۔ اسی طرح دھرم داس جو چھتری ہوتا ہے اور ہر داس جو برہمن ہوتا ہے، کے خاندانوں کے بیچ شادی بیاہ ہونا کچھ غیر ممکن سا لگتا ہے، کتاب میں صفحات کا شمار اوپر بھی درج ہے اور نیچے بھی جبکہ اوپر والا مٹا دیا جانا چاہیے تھا۔ علاوہ ازیں بہتر یہ رہتا کہ حوالہ جات کتاب کے آخر میں کتابیات سے پہلے دیا جاتا۔

مجموعی طور پر ڈرامہ 'سنگریز ہوائیں' اردو ڈرامے میں ایک اہم اضافہ ہے اور تواریخی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ اس ڈرامے کو پڑھ کر رشید انجم کی صلاحیتوں اور فنی بصارتوں کا پتہ چلتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ موصوف اگر موڈرن اسٹیج کی ضرورتوں کو مدنظر رکھ کر مختصر ڈرامے رقم کریں گے تو اردو ڈرامے میں پیدا ہوئی خلیج کو کسی حد تک پُر کر سکیں گے۔

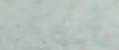

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

وتستا کی سیر

ڈاکٹر عزیز حاجنی

ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لیے تحریر کیا گیا زیر نظر ڈرامہ 'وتستا کی سیر' عنوان کے تحت اب کتابی صورت میں منظر عام پر آچکا ہے۔ یہ ڈرامہ دریائے وتستا یعنی جہلم پر بسی ہوئی صدیوں پرانی تہذیب کا بڑی فنکاری کے ساتھ احاطہ کرتا ہے۔ ڈاکٹر عزیز حاجنی نے نہ صرف یہ ثابت کیا ہے کہ وہ فن ڈرامہ نگاری پر دسترس رکھتے ہیں بلکہ تواریخ پر بھی کسی تعصب کے بغیر عمیق نظر رکھتے ہیں۔ چنانچہ خود ہی لکھتے ہیں کہ 'دِر دست کتاب وتستا کی سیر' قاری کو وتستائی تہذیب کے مختلف پہلوؤں سے آگاہ کرنے کی سعی ہے۔ ڈاکٹر عزیز حاجنی شاعر بھی ہیں اور نثر نگار بھی، محقق بھی ہیں اور ڈرامہ نگار بھی۔ وہ ادبی تنظیموں کے ساتھ بھی وابستہ رہے ہیں اور ذرائع ابلاغ کے ساتھ بھی۔ انہیں کشمیر کی ثقافت اور روحانی وصوفیانہ طرزِ زندگی سے خاصی دلچسپی ہے۔

زیر نظر ڈرامہ گیارہ قسطوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر قسط میں حسب ضرورت مناظر شامل کیے گئے ہیں۔ ڈرامہ دو مرکزی کرداروں بلقیس اور اس کے شوہر قیصر کے توسط سے ابتدا سے انجام تک پہنچ جاتا ہے حالانکہ بیچ بیچ میں اور بھی کئی کردار پوری آب وتاب کے ساتھ شامل ہوتے ہیں۔ سفر کے دوران کچھ عرصے تک انہیں رمضان چاچا جیسے کردار کا ساتھ بھی ملتا ہے جو نہ صرف اپنے علاقے کی ثقافت اور روایات کا آئینہ دار ہوتا ہے بلکہ انہیں گیت سنا کر محظوظ بھی کر لیتا ہے۔ بلقیس اپنے والد مرحوم حیدر صاحب کی بدولت تواریخ

ناشر: میزان پبلشرز، بنہ مالو، سرینگر۔ ۱۹۰۰۰۱

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

اور ثقافت میں بے انتہا دلچسپی رکھتی ہے جبکہ قیصر سول انجینئر ہونے کے باعث عملی قسم کا مادہ پرست آدمی ہوتا ہے لیکن بلقیس کی محبت، ذہانت اور تشویقی صلاحیت اسے اپنی سوچ وفکر بدلنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ دونوں وتستا کی سیر کر کے اپنا ہنی مون منانے کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔ ان کا سفر وتستا کے منبع ویری ناگ سے شروع ہوتا ہے حالانکہ کھنہ بل تک اس دریا کو ساندرن نام سے جانا جاتا ہے۔ پھر کھنہ بل سے لے کر کھادن یار تک دونوں راستے میں آئے اہم مقامات جیسے اننت ناگ، بجبہاڑہ، اونتی پور، پامپور، سرینگر، سمبل، سونا واری، سوپور وغیرہ کے پاس رک جاتے ہیں۔ بلقیس ان مقامات کی تاریخی اور جغرافیائی اہمیت بیان کرتی ہے۔ اس سفر کے دوران کئی ندی نالے وتستا کے ساتھ ہم آغوش ہوتے ہیں جبکہ اس دریا کا پانی ایشیا کی دو خوبصورت جھیلوں، ڈل اور ولر کو بھی تر و تازہ رکھتا ہے۔

عزیز حاجنی نے نہ صرف تواریخ بلکہ آثار قدیمہ، تلمیحات، دیو مالائی قصے کہانیوں اور لوک کتھاؤں سے وتستا کی بازیافت کی ہے۔ اس کھوج میں انہوں نے وتستا مہاتایم، کلہن کی راج ترنگنی، نیل مت پران، والٹر لارنس کی دی ویلی آف کشمیر، کننگھم اور سٹین کی تصنیفات، تاریخ حسن اور دیگر کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔ انہوں نے لل دید، شیخ العالم ؒ رسول میر، محمود گامی، حبہ خاتون، رحیم صاحب، مہجور، عبدالاحد آزاد وغیرہ کا بھی حوالہ دیا ہے۔ عبدالاحد آزاد کی وتستا پر لکھی ہوئی نظم سے ڈرامہ نگار نے نہ صرف وتستا کی منظر کشی کی ہے بلکہ اس کو زندگی کے فلسفے کے طور پر بھی استعمال کیا ہے۔ اس نظم میں وتستا کہتی ہے کہ میں کوہ و دشت کاٹ کر، پتھروں سے سر ٹکرا کر، جنگلوں سے گزر کر پیچ و خم کھاتی ہوئی زندگی کے سفر میں مختلف منزلوں سے آشنا ہوتی ہوں۔ ڈرامہ نگار نے اہم سلاطین للتا دتیہ، اونتی ورمن اور زین العابدین کا ذکر کیا ہے۔ اہم منادر، مساجد اور زیارتوں کا ذکر بھی آیا ہے۔ شنکر پنڈت کی کلہاڑی کا ذکر بھی ہے اور 'کاہ کاہ' کے بھاری بھرکم پتھر کا بھی جو صرف گیارہ انگلیوں سے اٹھایا جا سکتا ہے۔ حکیم سوئیا کے کارناموں کی تفصیل بھی دی گئی ہے۔ بستیوں سے گزرتے ہوئے ڈرامہ نگار نے ہر مقام کی تخصیصی اہمیت بیان کی ہے اور وہاں کے لوگوں کے رہن سہن اور طور طریق پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ نہ کشمیری نمکین چائے کو بھولے ہیں اور نہ سنگھاڑے کو۔ ہاوس بوٹوں کا ذکر بھی آیا ہے اور دست کاریوں کا بھی۔ کشمیری لوک سنگیت 'ننبدِ باتھ' (پنیری لگانے کے سمے کا گیت) اور 'روف' کے بارے میں بھی لکھا گیا ہے اور آلاتِ موسیقی جیسے سنطور، سارنگ، ستار، چنگ ورباب، طبلہ وغیرہ کے بارے میں بھی تفصیلات درج ہیں۔ آزادی کے بعد ہوئی ترقی کے بارے میں خصوصاً لفٹ ارگیشن، ریڈیو اور ٹیلی ویژن مراکز اور کلچرل اکادمی کے یوگدان کے بارے میں ڈرامہ نگار

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri
نے جانکاری فراہم کی ہے جو ایک خوش آئند بات ہے۔

ڈرامہ نگار اس بات کی طرف اشارہ کرنے سے بھی نہیں چوکے ہیں کہ ہم لوگوں نے، جن کا ماضی، حال اور مستقبل اسی دریا سے جڑا ہوا ہے، اس دریا کو نہ صرف کثیف بنایا ہے بلکہ جنگلوں کی کٹائی کے سبب اس کا پانی بھی کم ہو چکا ہے۔ اس طرح ڈراما نگار نے ایک اہم سوشل پیغام دینے کی کوشش بھی کی ہے۔

ڈرامے کی زبان میں مٹھاس اور مقامی رنگ و بو بسی ہوئی ہے۔ مکالمے چست ہیں۔ ڈرامہ کی بُنت داد طلب ہے کیونکہ ڈرامہ نگار نے بنا کسی پیچیدگی اور الجھاؤ کے ڈرامے کو آغاز سے انجام تک پہنچا دیا ہے۔ چند ایک جگہ غلطیاں در آئی ہیں جو دوسرے ایڈیشن میں دور کی جا سکتی ہیں۔ مثلاً 'ڈیوڑھی' کے بدلے 'ڈیوڑی' لکھا گیا ہے (صفہ ۱۶۰) یا پھر 'جالی دار روشن دان' کو 'پنجرہ دار روشن دان' لکھا گیا ہے۔ جو غلط ہے (۱۶۰) (پنجرہ کشمیری زبان میں جالی کو کہا جاتا ہے)۔ 'تعمیر کیا ہے' کے بدلے 'تعمیر کروایا ہے' زیادہ موزوں رہتا (ص ۱۱۸)، 'ہُکا' کا صحیح املا 'حقہ' ۱۰۸۔ 'نالا' اور 'شکارا' زیادہ موزوں ہے بہ نسبت 'نالہ' اور 'شکارہ' کے۔ کتاب کی نوعیت کو دیکھ کر میں سمجھتا ہوں کہ اس کتاب کو سیکنڈری کلاسز کے نصاب میں شامل کیا جانا چاہیے کیونکہ نہ صرف یہ ڈرامے کے فن پر اچھی کتاب ہے بلکہ طالب علموں کو اپنے کلچر سے متعارف کرانے میں بھی کامیاب ہوگی۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ہزار روپے کا نوٹ

ایم مبین

محمد مبین محمد عمر (قلمی نام ایم مبین) اُردو ہندی کے معروف قلمکار ہیں جو بحیثیت افسانہ نگار کافی نام کما چکے ہیں۔ اُردو میں بچوں کے لیے ان کی چار کتابیں اور ہندی میں دو کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ زیر نظر کتاب 'ہزار روپے کا نوٹ، بچوں کے ڈراموں کا مجموعہ ہے جس میں ایک ایکٹ کے دس مختصر ڈرامے شامل ہیں جو سکولوں میں آسانی سے اسٹیج پر کھیلے جا سکتے ہیں۔ ڈرامہ نگار کو البتہ اُردو رسائل سے شکایت ہے کہ وہ ان ڈراموں کی اشاعت میں آنا کانی کرتے ہیں۔

زیر نظر مجموعے میں مشمول ڈراموں کا مطالعہ کر کے یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہ ڈرامے اسٹیج کو مدِ نظر رکھ کر ہی لکھے گئے ہیں اور ان میں کم سے کم کردار شامل ہیں۔ کردار دلکش بھی ہیں اور متحرک بھی۔ مکالمے بچوں کی نفسیات اور ادائیگی کے حساب سے برمحل اور چست ہیں۔ پلاٹ میں تھیم سبق آموز بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ موضوعات میں تنوع اور معنویت نظر آتی ہے۔ 'چھنگا پہلوان الیکشن کے اکھاڑے میں' کا ہیرو اپنے چاپلوس چمچے کی وجہ سے الیکشن میں کھڑا ہونے کی تیاری کرتا ہے اور اپنے دماغ کو صحیح طریقے سے کام نہ لانے کے باعث ہزاروں روپے کھو بیٹھتا ہے۔ 'کالی گڑیا' توہم پرستی پر مبنی ہے جبکہ

ناشر: مصنف، ۳۰۳، کلاسک پلازہ، تین بتی، بھیونڈی ۴۲۱۳۰۲ سن اشاعت: ۲۰۰۸ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

'ہزار روپے کا نوٹ' جعلسازی اور دھوکہ دھڑی پر مرکوز ہے۔ ڈرامہ 'دولت' علم اور دولت کا موازنہ کرتا ہوا بڑی خوبصورتی سے یہ ثابت کرتا ہے کہ علم کو دولت پر فضیلت حاصل ہے۔ 'اچھی عادت' میں ڈراما نگار نے یہ باور کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ صبح سویرے اٹھ کر اخبار پڑھنا بہت فائدہ مند رہتا ہے۔ 'انعام نہیں ملا' میں لاپرواہی، 'بیچارہ ووٹر' میں الیکشن کی دھاندلی اور 'سوٹ کیس کا مالک' میں چلتری اور فریب کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ڈرامہ 'انمول خزانہ' میں ایک کسان رگھو اپنے سست بچوں کو خزانے کا لالچ دے کر پاس کے تالاب سے اپنے کھیت تک نہر کھودنے کی ترغیب دیتا ہے جس سے ان کے کھیت ہرے بھرے ہو جاتے ہیں۔ انہیں خزانہ تو نہیں ملتا ہے مگر یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ محنت کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ 'انعام کی جگہ' ایسے چغد دہقان کی داستاں ہے جو لوگوں کی باتوں میں آکر ہزاروں روپے اپنی جھوٹی شان کے لیے برباد کر دیتا ہے۔

'ہزار روپے کا نوٹ' میں شامل تمام ڈراموں کی زبان آسان، سلیس اور شگفتہ ہے جو ایسے ڈراموں کے لیے بہت ضروری ہے۔ البتہ اگر ان ڈراموں میں مانوس محاوروں کا استعمال بھی کیا جاتا تو سونے پر سہاگہ ہوتا۔ چند ایک ڈراموں میں واقعات دہرائے گئے ہیں مگر ڈراموں پر اس کا کوئی منفی اثر نہیں پڑتا۔ مجموعی طور پر یہ ڈرامے قاری کے ذہن پر مثبت اثرات چھوڑ جاتے ہیں اور مجھے امید ہے کہ اسٹیج پر بھی ان ڈراموں کو ایسی ہی کامیابی ملے گی۔

❖ ❖ ❖

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

یہ پھول خاموش تھا

ـــــ نقشبندی قمر نقوی

''مجھے اب وقت بھی زیادہ میسر ہے، وسائل بھی حسب مرضی ہیں اور اللہ تعالیٰ سبحانہٗ، کی عنایات ونوازشات سے میں بہرہ ور ہوں۔ میں شکار میں جس قدر قانون اجازت دیتا ہے ہرگز کمی یا کوتاہی نہیں کرتا، عیش کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں اور شکار کرتا ہوں اور کتابیں لکھتا ہوں۔''

مندرجہ بالا الفاظ شکاری نقشبند قمر نقوی کے تین سو پچھتر ہالینڈ اینڈ ہالینڈ میگنم رائفل سے نہیں نکلے ہیں بلکہ ناول نگار نقشبند قمر نقوی کے قلم سے نکلے ہیں جو ان کی ہمہ جہت شخصیت پر روشنی ڈالنے کے لیے کافی ہیں۔ شاید جو بات ان الفاظ میں نہیں کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ موصوف شکاری ہونے کے باوجود حساس دل رکھتے ہیں تبھی تو زیر نظر ناول تحریر کرنا ممکن ہو سکا ہے۔

'یہ پھول خاموش تھا' گوانا وَ قصبے کے ماحول میں رچا بسا ہے پھر بھی دیہی زندگی کے مختلف شعبوں کو واضح طور پر اجاگر کرتا ہے کیونکہ جس زمانے کی یادیں نقوی دل میں بسائے پھرتے رہے اس وقت اتر پردیش میں سوائے لکھنؤ، کانپور، الہ آباد اور وارانسی کے سبھی علاقے گاؤں جیسے ہی لگتے تھے۔ گھوسی برادری کی روایت پسندی، افسر شاہی کی من مانی، پولیس اور وکیلوں کی زور زبردستی، غنڈوں اور ڈاکوؤں کی بالادستی

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دھلی۔٦ سن اشاعت: ۲۰۰۸ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

اور غریب عورتوں کی لاچاری کی تصویریں اس ناول میں جابجا اتاری گئی ہیں۔ ناول کا پلاٹ ایک گھوسی غلامو کے کنبے کے ارد گرد بُنا گیا ہے۔ غلامو کی دو بیٹیاں، حسو (حسیبہ) اور لکھیری جوان ہو چکی ہیں۔ حسو کا معاشقہ منشی علیم الدین کے بیٹے نبو سے چل رہا ہے جبکہ گھوسی برادری کا سردار رمضان اس کی شادی اپنے آوارہ گرد بیٹے بادل سے کرانے کا متمنی ہے۔ حسو اور نبو کی منگنی کا پتہ چلتے ہی بادل دو پیشہ ور ڈاکوؤں کی مدد سے حسو کو اغوا کر لیتا ہے اور پھر اس کے سر کو دھڑ سے کاٹ کر ویرانے میں پھینک کر فرار ہو جاتا ہے۔ پکڑے جانے کے باوجود وہ جیل توڑ کر بھاگنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ مگر آخر کار پولیس اور لوگوں سے بھاگتا ہوا ایک گہری کھائی میں گر کر کیفر کردار کو پہنچ جاتا ہے۔ نبو کی دماغی حالت بگڑ جاتی ہے مگر ایک حکیم کی دواؤں سے وہ شفایاب ہو جاتا ہے۔ رشتے کی تجدید کی خاطر حسو کی بہن لکھیری نبو کی دلہن بن جاتی ہے۔

پلاٹ کی بنت نہ صرف فکر و تردد اور گہرے مشاہدے کا ثمرہ ہے بلکہ ماحول کی صحیح عکاسی بھی کرتا ہے۔ یہ وہی ماحول ہے جو ہمارے دیہی اور نیم دیہی علاقوں میں انگریزوں کے وقت بھی موجود تھا اور آج بھی نظر آتا ہے۔ سیدھے سادے ان پڑھ گنوار غریب عوام ایک جانب غنڈوں بدمعاشوں اور ڈاکوؤں کے جبر سے جوجھتے رہتے ہیں اور دوسری جانب سماج اور برادری کے خود ساختہ ٹھیکیداروں سے۔ قانون کے محافظ افسر، پولیس اور وکیل بھی ان مظلوموں کے استحصال میں کوئی کسر باقی نہیں رکھتے جس کی مثالیں منشی اور عدو میاں کے روپ میں ہمارے سامنے پیش کی گئی ہیں۔ عورتیں پالکیوں اور پردے کی زینت بن کر رہ گئی ہیں اور ان کی آواز سننے کو کوئی بھی تیار نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حسو کے مر جانے کے بعد نبو کو ذہنی طور بحال کرنے کے لیے لکھیری کو قربانی کا بکرا بنایا جاتا ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کے ناول 'ایک چادر میلی سی' میں بھی عورت کا یہی حال ہوتا ہے۔

ناول میں کردار نگاری بھی ہنرمندی سے کی گئی ہے۔ جہاں ایک جانب نبو لائق اور فرماں بردار بیٹا ثابت ہوتا ہے وہیں بادل اپنے بے جا مقصد کو پانے کے لیے کچھ بھی کرنے سے گریز نہیں کرتا۔ عدو میاں سر سے پیر تک پولیس والا بن کر سامنے آتا ہے جبکہ منشی جی وکالت کے داؤ پیچ استعمال کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ چند کرداروں کے بارے میں ناول نگار یوں تحریر کرتے ہیں۔

- **بادل**: اس کو (رمضان کو) بادل کی حمایت ایسی حالت میں نہیں کرنا تھی، لیکن وہ بھی مجبور تھا بادل سے اگر وہ کہتا کہ یہ رشتہ نہیں ہو سکتا تو وہ اپنے باپ سے بھی بدتمیزی اور بدزبانی کرتا۔ وہ کون سا تابعدار لڑکا تھا۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

باپ کے خیال کے مطابق۔ کوئی خاص خرابی نہیں تھی۔ ان پڑھ تھا۔ غنڈہ گردی اس کا کاروبار تھا۔ شراب پینے کے بارے میں سبھی کو معلوم تھا۔ شرابی تھا۔ اور شراب پینے کے بعد اور بھی جو کچھ کرنا ہوتا ہے وہ سب کچھ کرتا تھا۔ دو تین بار صدر میں دنگا فساد کرنے کی وجہ سے حوالات بھی جا چکا تھا۔ جوا کھیلنا تو عام بات تھی!

صدر کے آخر میں جو 'بائیوں' کے کوٹھے تھے، کبھی کبھی وہ ادھر کے چکر بھی لگا لیتا تھا۔ صرف گانے سننے جاتا تھا۔ اور کچھ تو وہ کرتا ہی نہیں تھا۔ توبہ!۔ جو 'اور' کچھ کرے وہ کافر!

- **نبو**: نبو۔ جس کا پورا نام نبی احمد تھا۔ ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس لیے چہیتا بھی۔ باپ نے اس پر کبھی سختی نہیں کی تھی اور نبو بھی صالح جوان نکلا۔ اس نے کبھی بے راہ روی اختیار نہیں کی۔ کبھی نالائقی کا کوئی کام نہیں کیا۔ سعادت مند تھا، ماں باپ کی خدمت کرنے میں خوشی محسوس کرتا، شرافت کی زندگی کا قائل تھا، زمینوں پر جو مزارع تھے۔ تین ہی تھے۔ ان سے نبو نے اچھی بنا رکھی تھی۔ دوستی کر رکھی تھی۔ ان کی مدد کرتا رہتا تھا، اس لیے وہ تینوں اسے چاہتے تھے۔
- **غلامو**: لیکن فوراً ہی اس کو اپنے شوہر (غلامو) پر بہت پیار آیا۔ گھوسی تھا، ان پڑھ تھا، اور بد دماغ بھی لیکن کوئی کام بے تکا نہیں کرتا تھا۔ ہمیشہ فیصلہ سوچ سمجھ کر کرتا تھا اور اچھا ہی فیصلہ کرتا تھا۔ جاہل ہونے کے باوجود اس میں قوت فیصلہ اچھی تھی۔
- **رمضان**: لیکن رمضان برادری کا سربراہ تھا، اچھا مالدار آدمی تھا۔ تیس چالیس بھینسیں، دس بارہ گائیں اور پھر اس کے دو اپنے گھر تھے۔ اچھا پیسے والا تھا اور برادری والے اس سے اس لیے بھی ڈرتے تھے کہ وہ جس سے ناراض ہوتا، اس کے کاروبار پر ناراضگی کا بہت ہی برا اثر پڑتا۔ کاروبار ٹھپ ہی ہو جاتا تھا۔ نقصانات بھی ہوتے تھے۔ مالی بھی اور جانی بھی اور یہ لوگ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔
- **عندو میاں**: عندو میاں بہت سمجھ دار، متین اور بارعب شخص تھے، وہ کسی سے زیادہ بات نہیں کرتے تھے لیکن جب بات کرتے تو ایسی مستحکم کہ معاملہ بگڑ نہیں سکتا تھا۔

عندو میاں، قلعے پر رہتے تھے، پولیس میں تھے اور بہت بارعب اور بااثر شخصیت کے

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

مالک تھے، ساتھ ہی باخبر بھی۔ ان کو کئی ایسے معاملات کی اطلاع ہوتی تھی جس کے بارے میں ملوث لوگ سمجھتے تھے کہ اللہ کے سوا جاننے والا اور کوئی نہیں۔ عدو میاں اس بات سے واقف ہوتے تھے۔ کسی کو کیا معلوم ان کی آگہی کے کیا ذرائع تھے، کشف تو ان کو یقیناً نہیں ہوتا تھا، اس لیے کہ وہ اگر چہ برے آدمی نہیں تھے لیکن ولی صفت بھی نہیں تھے۔ ان کی شرافت تہذیب اور وضعداری میں کوئی شبہ نہیں تھا!

ناول میں مکالموں پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ مکالمے چست اور برمحل ہیں۔ کرداروں کی نفسیات اور ان کے رویے کے مظہر ہیں۔ چنانچہ بادل اس کے باپ رمضان کی بات چیت میں کرختگی اور تیزابیت، غلاموا اور اس کی بیوی کی آواز میں مفلسی اور غربت، نبو کے لہجے میں فرمانبرداری اور اطاعت اور عدو میاں کے منہ سے نکلے الفاظ میں تحکم اور رعب داب کے عنصر نظر آتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ مکالمے ناول کی جان ہیں۔

'یہ پھول خاموش ہے' کا مقصدی پہلو بھی صاف عیاں ہے، غلط کام کرنے والوں کا انجام ہمیشہ برا ہوتا ہے اور نیک سیرت لوگوں کو دیر سویر بھلائی اور صبر وشکیب کا پھل مل ہی جاتا ہے۔

کتاب میں کمپوزنگ اور گرامر پر دھیان نہیں دیا گیا ہے۔ پروف ریڈنگ کی کمیاں صاف جھلکتی ہیں۔ چند الفاظ جو غلط لکھے گئے ہیں (یہ لسٹ پوری نہیں ہے): لھاف (لحاف) مظبوط (مضبوط) غھغھی (گھگھی) وغیرہ۔

نقشبند قمر نقوی ایک اچھے شکاری ہیں اور اس کے ساتھ ہی اچھے ناول نگار بھی ثابت ہو رہے ہیں۔ اس میں ان کے مشاہدے کا خاص عمل دخل ہے۔ انہوں نے دنیا دیکھی ہے، تہذیبوں کا تصادم دیکھا ہے اور فطرت کے ساتھ نزدیکی رشتہ جوڑا ہے۔ ان کا زیر نظر ناول ایک اچھی کوشش ہے اور یہ ناول معیار پر کھرا اترتا ہے۔ امید ہے قمر نقوی آگے بھی یہ شغل جاری رکھیں گے۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

سسکتا سماج

ـــــ پشوری لال شرر

ڈوگری میں پہلا ناول 'جس ایلے نیہرا پئی گیا' لکھ کر پشوری لال شرر اب اپنا پہلا اردو ناول 'سسکتا سماج' لے کر میدان میں اترے ہیں۔ اردو زبان ان کی پہلی محبت ہے اور ناول کا مطالعہ کرنے کے بعد اس بات کی تصدیق بھی ہو جاتی ہے۔ زندگی کے اس موڑ پر، جبکہ وہ ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہے ہیں، انہوں نے ایک ایسا خوبصورت ناول تحریر کیا ہے جس میں مختلف سماجی مسائل پر معروضیت اور دقیقہ شناسی سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس بارے میں ناول نگار خود اپنا مدعا یوں بیاں کرتے ہیں۔

> ''لیکن ایک ٹیچر اور پھر ایک معمر بزرگ ہونے کے ناطے آنے والی نسل کو خطرات سے آگاہ کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ راقم نے ساکن پانی میں پتھر مار کر اس میں ارتعاش پیدا کرنے کی ہی سعی نہیں کی ہے بلکہ ان لہروں کی آواز پہچاننے کے لیے اپنے کرداروں کے طفیل سیر حاصل اور بصیرت افروز تبصرات بھی کیے ہیں۔''

ناول کی ابتدا سلیم اور اس کی فیشن پرست ٹیچر کے ٹکراؤ سے ہوتا ہے جہاں ایک شاگرد اپنے ٹیچر کو یہ احساس دلاتا ہے کہ وہ پڑھانے سے زیادہ اپنے بناؤ سنگھار پر دھیان دیتی ہیں۔ اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی ٹیچر اپنے آپ کو صحیح راستے پر ڈال دیتی ہے اور پھر اپنے فکر و عمل سے دیدی کا درجہ حاصل کرتی ہے۔ سلیم امتحان دے کر ننیہال جاتا ہے جہاں حمیدہ، جو ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرنے کی خواہاں ہے، اسے عشق کرتی ہے

ناشر: لکشمی بک سٹور، بٹل بالیاں روڈ، اودھم پور، جموں وکشمیر
سن اشاعت: ۲۰۰۴ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

جبکہ سلیم کے ماموں دوسری بیٹی نجمہ کی شادی ایک اوباش امیر زادے اسلم سے طے کرتے ہیں۔ جہاں تک دیدی کا سوال ہے، وہ بچپن ہی میں یتیم ہو چکی ہے اور اپنی قابلیت اور محنت کے بل بوتے پر بڑا مرتبہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوتی ہے مگر جہیز کے باعث شادی نہیں کر پاتی ہے۔ اس نے اپنی بقیہ زندگی سماجی کاموں کے لیے وقف کر لی ہے۔

ادھر سلیم اور راج کی ملاقات ایک پیشہ کرتی عورت سرلا سے ہوتی ہے جو اپنے دو معصوم بچوں کی آڑ میں خریدار جٹاتی ہے۔ سرلا ایک متوسط طبقہ کی لڑکی ہے جو سسرال کے جبر و تشدد کا شکار ہو کر یہ کام کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے مگر سلیم اور راج کی رفاقت پا کر اور ان کے سمجھانے بجھانے پر اپنا پیشہ ترک کرتی ہے اور پھر مزدوری کرنے لگتی ہے۔ راج کے پتاجی بھی اس کی شادی میں جہیز کی مانگ پر مصر ہیں مگر راج نہیں مانتا اور پھر سلیم کی جرح کے سامنے پتاجی کی ایک نہیں چلتی اور وہ ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ غلط راستے پر چلنے کا مزہ رام داس منیم تب چکھتا ہے جب وہ اپنے مالک سے روپیہ ادھار لینے کے لیے فریاد کرتا ہے مگر اپنا سامنہ لے کر واپس آتا ہے جبکہ مالک اسی کے سامنے اپنی بیٹی کو تفریح کے لیے اسے بھی زیادہ رقم دے دیتا ہے۔ منیم پولیس کے سامنے سیٹھ کے کرتوتوں سے پردہ اٹھانے کی دھمکی دیتا ہے جبکہ دوسری جانب بیٹی ریٹا حادثے میں زخمی ہو جاتی ہے۔ کچھ عرصے کے بعد ریٹا کو مبارک، بہرام اور بنیتا سنگھ اغوا کر کے اس کے سرمایہ دار باپ سے ایک لاکھ کی وصولی چاہتے ہیں۔ ریٹا ان کی داستانیں سن کر ان کو زر فدیہ حاصل کرنے میں مدد کرتی ہے اور ان غریبوں کی کسمپرسی اور حوصلے کو دیکھ کر اس کی آنکھیں کھل جاتی ہے۔

دیدی ایک ایک کر کے سبھی کو اپنی تنظیم میں شامل کرتی ہے جو سماج سے برائیوں کا قلع قمع کرنے کے لیے کمر کس لیتے ہیں۔ لیکن ان کا مسلک تشدد کی جگہ عدم تشدد بن جاتا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ لوگ اپنی حالت بے زار کا جائزہ لے کر ایک خاموش انقلاب برپا کر لیں۔

سیٹھ کروری مل کی بہو آشا عدم مناسبت کے سبب رمیش کو چھوڑ کر چلی جاتی ہے اور جب رمیش اس کو ڈھونڈنے کار میں جاتا ہے تو حادثے کا شکار ہوتا ہے۔ ڈاکٹر حمیدہ اسکی دیکھ بھال کرتی ہے۔ رمیش ہی اپنی بہن ریٹا کو زر فدیہ کے عوض چھڑوا کر لاتا ہے۔ دوسری جانب کروری مل اپنے برے کاموں کی وجہ سے اجمل کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ریٹا اور رمیش ڈاکوؤں سے بدظن نہیں ہوتے ہیں بلکہ ان سے ہمدردی جتاتے ہیں۔

اوباش اسلم کی شادی اس کے والدین عائشہ سے کرتے ہیں جبکہ یوسف کی شادی اس کے رسوخ

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

اور دولت کے سبب نجمہ سے ہو جاتی ہے مگر وہ اپنی عادتوں سے باز نہیں آتا۔ سلیم کو اس بات کا دکھ تو ہوتا ہے مگر وہ حمیدہ کی طرف سے مطمئن ہوتا ہے۔ اُدھر دیدی اور تنظیم کے دوسرے رکن جلسے کرتے رہتے ہیں اور سماج کو بیدار کرنے کی مہم تیز تر کرتے ہیں۔ موضوعات رشوت خوری سے لیکر قومی کردار تک اور سیکولرازم سے لیکر دہشت گردی تک شامل بحث رہتے ہیں۔

رمیش اور ریٹا کے بدلاو کو دیکھ کر کروری مل کی بیوی نرملا ان کا ساتھ دیتی ہے اور آخر کار سماجی بہبود کے لیے ٹرسٹ بنالیتی ہے۔ وہ اپنی ساری جائیداد ٹرسٹ کے نام کرتی ہے۔ اس کے بعد سلیم، رمیش، راج کمار اور رام سنگھ ایک اجتماعی شادی کا انعقاد کر کے خود شادی کر لیتے ہیں اور اپنی معشوقاؤں کو عمر بھر کے لیے اپنا لیتے ہیں۔ وہ کسی بھی طرح نمائش سے پرہیز کر کے اپنی زندگی سماج کے لیے وقف کرتے ہیں۔ بدقسمتی سے نجمہ اپنے شوہر کی اذیتوں سے پریشان ہو کر دریا میں ڈوبنے کے لیے چھلانگ لگاتی ہے جس کو دیکھ کر حمیدہ اور سلیم بھی دریا میں چھلانگ لگاتے ہیں تاکہ اسے بچا سکیں مگر تینوں ڈوب جاتے ہیں۔ پولیس جب تینوں لاشوں کو نکالتی ہے تو اسلم انہیں دیکھ کر پشیماں ہو جاتا ہے اور خود بھی دریا کی آغوش میں پناہ لیتا ہے اور پھر کبھی واپس نہیں آتا۔

ناول کے مطالعے کے دوران دو باتیں سامنے آتی ہیں۔ ایک یہ کہ ناول نگار گاندھی جی کے اصولوں کا قائل ہے اور دوسرے یہ کہ وہ معلم رہ چکا ہے۔ پہلے رویے کی تصدیق یوں ہوتی ہے کہ ناول کے اکثر کردار جیسے دیدی، سرلا، ریٹا وغیرہ حالات کے مدنظر اور راست بحث و مباحث سے اپنا راستہ بدل دیتے ہیں اور نیکی کا راستہ اپنا لیتے ہیں۔ ناول کا مندرجہ ذیل اقتباس اس دلیل کی مزید تصدیق کرتا ہے۔

> ''ہمارے عمل سے کسی کو دکھ نہ پہنچے، کسی کی آتما زخمی نہ ہو، ایسا طرز فکر اپنانے سے ہی ہم کچھ کر دکھانے کے قابل ہو سکتے ہیں۔ ایک انقلاب برپا کر سکتے ہیں۔''

جہاں تک دوسرے رویے کا سوال ہے یہ ناول کی ابتدا سے آخر تک نمایاں ہے۔ ناول نگار اپنے آپ کو اپدیشک کے طور پر پیش کرتے ہیں اور لوگوں کو سماجی بدعتوں سے آگاہ کرانا چاہتے ہیں۔ یہ طرز ناول نگاری پریم چند کی دین ہے مگر ان دنوں اس کی ضرورت تھی چونکہ قوم ایک ایسے دور سے گزر رہا تھا کہ رہنمائی کی شدید ضرورت تھی۔ مگر تبلیغی ناول نگاری اب ناول کے فن کے لیے مضر سمجھی جاتی ہے کیونکہ نقادوں کا یہ ماننا ہے کہ قاری اب اتنا سمجھ بوجھ تو رکھتا ہے کہ وہ اپنے برے بھلے کی خود تمیز کرے۔ ناول نگار کو اپدیشک بننے سے احتراز کرنا چاہیے۔ بہر حال ناول نگار نے معاشرے میں پل رہے ناسوروں کو ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ معاشرے کی شاید ہی کوئی بدعت ہو جسے انہوں نے نظر انداز کیا ہو۔ نظام

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

درس وتدریس، امتحانات میں ہوری دھاندلیاں، بے ٹکٹ سفر اور جھوٹا حق جتانے کا غاصبانہ رویہ، رشوت ستانی، مضر اشتہارات کی ان دیکھی کرنا، طبقاتی اونچ نیچ، سکولوں کالجوں میں پڑھائی کے بدلے پرائیوٹ ٹیوشنوں پر زور، ایجوکیشن کا تجارتیانہ، لڑکیوں کی مرضی کے خلاف ان کی شادی کرنا اور پڑھائی روک لینا، جہیز کی لعنت، سرمایہ داری سے پھیلتے ہوئے غلط طور طریقے، تخریبی کارروائی اور دہشت گردی، عصمت فروشی، بے روزگاری، اور سب سے بڑھ کر اخلاقی قدروں کی گراوٹ۔ ناول میں اتنے مسائل کو اکٹھے کرنے سے ناول کو جو نقصان بلاواسطہ طور پر ہوا ہے وہ یہ ہے کہ کسی ایک مسئلے پر ناول نگار فوکس نہیں کر پاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ قاری پر ناول میں پیش کیے گئے مسائل اور دلائل دونوں دیرپا اثر نہیں چھوڑ پاتے ہیں۔ ناول نگار نے خود اپنی ہی حکمت عملی سے ناول کے مقاصد کو زائل کر دیا ہے۔ دیکھا جائے تو اس کا ایک اور انجام یہ بھی ہے کہ کوئی بھی کردار اتنے پھیلے ہوئے ناول کے باوجود زندہ وجاوید نہیں ہو پایا ہے۔ وہ ہوری یا امر کانت نہیں بن سکا ہے جبکہ دیدی اور سلیم میں یہ امکانات موجود تھے یا پھر ڈاکٹر حمیدہ اور ریٹا بھی امٹ چھاپ ڈال سکتی تھیں۔ تاہم مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ پشوری لال شرر نے ایک بہت بڑے کینواس کو اپنا کر اس پر مکمل تصویر بنانے کی کوشش کی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ناول محنت اور لگن کا طلبگار ہے اسی لیے اردو میں بہت کم ناول لکھے جاتے ہیں۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو پشوری لال شرر کی یہ تصنیف خوش آئند قدم ہے اور اس کی ادبی حلقوں میں پذیرائی ہونی چاہیے۔

ناول نگار کو اردو زباں پر مکمل دسترس حاصل ہے۔ ان کا بیانیہ دلکش اور رواں ہے، مکالمے میں روز مرہ کی زبان استعمال کی گئی ہے جس کے سبب وہ فطری اور دلچسپ نظر آتے ہیں اور وقتاً فوقتاً انہوں نے محاوروں کا برمحل استعمال بھی کیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ناول کا پلاٹ اور موضوع بہت ہی سنجیدگی اور فکر وعمل سے چنا گیا ہے۔ اگر ٹریٹمنٹ میں بھی ایسی ہی چابکدستی سے کام لیا جاتا تو یہ ناول صف اول کے ناولوں میں شمار کیا جاتا۔ تاہم پہلی ہی کوشش میں اتنا اچھا ناول تحریر کرنا بڑی بات ہے جس کے لیے شرر مبارکباد کے حق دار ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ فن ناول نگاری میں بھی بہت ساری تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ یہ تبدیلیاں اکثر وبیشتر مغربی اثرات کے تحت در آئی ہیں مگر خود اردو ادب میں بھی ترقی پسند جدیدیت اور مابعد جدیدیت تحریکوں کے زیر اثر ناول کی ہیئت اور اسلوب میں کافی تبدیلی آچکی ہے۔ اس لیے ہم عصر ناول نگاروں سے ان تبدیلیوں کو مدنظر رکھنے کی امید کی جاتی ہے۔ مجھے پوری امید ہے کہ پشوری لال شرر کے اندر ابھی بھی ایک دو ناول چھپے ہوں گے اور وہ ضرور ان کو بھی کاغذ اور قلم کے حوالے کر لیں گے۔

❖ ❖ ❖

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

یہ تو سچا قصہ ہے

ڈاکٹر سیفی سرونجی

ڈاکٹر سیفی سرونجی کی آپ بیتی بعنوان 'یہ تو سچا قصہ ہے' حال ہی میں منظر عام پر آئی ہے۔ اکتیس کتابوں کے مصنف سیفی سرونجی شاعر بھی ہیں اور نثر نگار بھی، صحافی بھی ہیں اور تنقید نگار بھی۔ انہوں نے اردو کی نئی اور پرانی بستیوں میں خوب نام کمایا ہے۔ یہاں سوال اٹھتا ہے کہ کیا ڈاکٹر سیفی کی شخصیت ایسی دلفریب ہے کہ وہ اپنی سوانح حیات رقم کریں اور قارئین اس سے مستفیض ہوں؟ سچ تو یہ ہے کہ رمضانی سے ڈاکٹر سیفی سرونجی تک کا سفر بڑا دلکش رہا ہے۔ ان کی زندگی کی جدوجہد اور راستے کے نشیب وفراز دیکھ کر مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ ان کی آپ بیتی مستقبل میں کئی غریب بے یار و مددگار بچوں کے لیے مشعل راہ بن سکتی ہے۔ چرواہوں (گدی خاندان) سے تعلق رکھنے والا ایک اوسط قد وکاٹھ کا سیدھا سادا آدمی، جس کا نانا اسحاق ڈاکو کے نام سے جانا جاتا تھا، جس نے بچپن میں نہ کبھی سکول اور نہ ہی کالج کی چوکھٹ دیکھی، جو دنیا والوں کے پرفریب چہرے پڑھنے میں ہمیشہ ناکام رہا، وہی آدمی غیر رسمی تعلیم پا کر اردو میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے میں کامیاب ہوا اور پھر گورنمنٹ ہایئر سکنڈری سکول میں معلم بن گیا۔ اتنا ہی نہیں ڈاکٹر سیفی سرونجی ہم عصر ادب کے ایک اہم دستخط ہیں اور ۱۹۸۵ء سے ایک سہ ماہی جریدہ 'انتساب' بھی نکال رہے ہیں۔ بقول ڈاکٹر سیفی سرونجی۔

ناشر: سدبھاونا منچ پبلی کیشنز، سرونج (ایم پی) 464228 سن اشاعت: ۲۰۰۹ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

''ہر شخص کی ترقی میں اس کی اپنی سوچ کا زیادہ دخل ہوتا ہے۔ اگر اس میں شعور نہیں ہے، اچھے برے کی تمیز نہیں ہے، دوست کو دشمن سمجھنا اور دشمن کو دوست سمجھنا اس کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ بن جاتا ہے۔ اگر آدمی اندر سے اچھا ہے، تو یقیناً اسے اچھے آدمی بھی ملیں گے، اگر وہ خود برا ہے تو اس کی تمام عمر شکوے شکایت میں گزر جائے گی۔''

'یہ تو سچا قصہ ہے' اس آدمی کے حوصلے کی داستاں ہے جو پیسے پیسے کا محتاج ہو کر بھی اپنی گھر گرہستی چلا تا رہا، بیڑیوں کے کارخانے میں کام کرتا رہا جہاں چند شاعروں کی صحبت اسے علم حاصل کرنے کی ترغیب دیتی رہی، اس کی بیوی بھی اسی کارخانے میں اس کا ہاتھ بٹاتی رہی اور اس طرح وہ ترقی کے زینے طے کرتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ اس کے باوجود وہ نہ تو اپنی اصلیت کو بھول جاتا ہے، نہ اپنے دوست احباب سے دامن چھڑاتا ہے اور نہ ہی اپنی وضع قطع بدلتا ہے۔ قرض میں ڈوبی ہوئی سیفی کی زندگی کے بارے میں پڑھ کر مجھے بار بار غالبؔ کی یاد آتی رہی۔ سیفی سرونجی نے اپنا بچپن کھلنڈرے پن میں گزارا۔ انہوں نے اپنی زندگی کے کئی واقعات جو جان لیوا بھی ہو سکتے تھے اپنی سوانح میں بیان کیے ہیں۔ ایک فرضی الزام میں انہیں جیل کی ہوا بھی کھانا پڑی۔ ان کی شخصیت میں بغاوت اور ضدی پن کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ انہوں نے اپنے باپ کو ٹکڑے ٹکڑے اپنی زمین و جائیداد بیچتے ہوئے دیکھا مگر وہ اپنی ہی دھن میں مست رہے۔

فلموں اور لڑکیوں سے بڑی رغبت تھی۔ ایجوکیشنل ٹور پر اپنی ایک ہم جماعت پر فوکس کر کے منظوم سفر نامہ بھی لکھ ڈالا۔ سرونج میں سیفی لائبریری کا قیام اور پھر انتساب کا اجرا ان کی زندگی کے سفر کے اہم سنگ میل ہیں۔ سرونج اور بھوپال کی علمی سرگرمیوں اور ادبی شخصیات کا انہوں نے بھرپور جائزہ لیا ہے۔ اردو دوستی کا کیا کہئے کہ گھر گھر جا کر رسالے بیچتے رہے اور اپنی لائبریری طالب علموں کے لیے وقف کی۔

ڈاکٹر سیفی نے اپنے اسفار کا بھی ذکر کیا ہے حالانکہ لندن کے سفر پر تو انہوں نے الگ سے سفر نامہ بھی لکھا ہے۔ ممبئی کی فلمی دنیا اور فلمی بستیوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ وہ اپنے کرم فرماؤں کو کبھی نہیں بھولے ہیں۔ اور ان کا بار بار ذکر کرتے ہیں۔ ان کرم فرماؤں میں ان کے مرحوم والد بھی ہیں جس نے اپنے بیٹے پر ساری دولت لٹا دی۔ اپنی کتابوں کی اشاعت اور انور شیخ نمبر پر ہوئی سیاست کا تذکرہ کرنا بھی نہیں بھولے۔ آج کل کے پروفیسر حضرات پر انہوں نے بڑا طنز کیا ہے کہ مطالعے کے بغیر ہی بڑی بڑی کرسیاں سنبھالے رہتے ہیں۔ اپنی زندگی پر نظر ڈالتے ہوئے وہ لکھتے ہیں۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

مجھ کو مٹانے والے بھلا کیا مٹائیں گے
دنیا میرے خلاف ہے لیکن خدا نہیں

اس آپ بیتی میں سیفی سرونجی کی شفاف شخصیت کھل کر سامنے آتی ہے۔ زبان و بیان کی فصاحت و بلاغت اور اسلوب کی ندرت اس تصنیف کو چار چاند لگاتی ہے۔ البتہ ایک چیز جو کھٹکتی ہے وہ ہے انگریزی الفاظ کو اردو میں غلط طریقے سے لکھنا۔ مثلاً سسپنٹ (سسپنڈ Suspend) رموڈ کنٹرول (رموٹ کنٹرول (Remote Control)، اکسرے (ایکس رے X-Ray)، طریقۂ اظہار (Way of Expression) یا سمجھانے کا طریقہ (Way of Explanation)، اودی (اوٹی، Ooty) وغیرہ۔ مجھے امید ہے کہ ڈاکٹر سیفی آئندہ شائع ہونے والی کتابوں میں اس طرف توجہ دیں گے۔ مجموعی طور پر یہ سوانح عمری قاری کے ذہن پر خوشگوار اثر چھوڑ جاتی ہے۔ سیفی سرونجی نے اس کتاب میں رنگین نادر تصویریں شامل کر کے کتاب کو اور بھی دلکش بنایا ہے۔

❖ ❖ ❖

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ترا ممنون ہوں

ڈاکٹر بانو سرتاج

''پاگل سب سے اچھے طنز نگار ہوتے ہیں۔ پاگل ہو کر وہ دنیا پر ظاہر کر دیتے ہیں کہ یہ دنیا ہوش مندوں کے رہنے کے لائق نہیں۔''

'ترا ممنون ہوں' کا مذکورہ اقتباس بانو سرتاج کی عمیق سوچ اور مشاہدے کا نتیجہ ہے۔ طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا یہ مجموعہ ایک ایسے لیکھک کے قلم سے نکلا ہے جو سالہا سال سے اردو ادب کو اپنے زرّیں افسانوں، ڈراموں، مضامین اور ادبِ اطفال سے مالا مال کرتی آئی ہیں۔ اس کتاب سے پہلے موصوفہ کی آٹھ تصانیف منظرِ عام پر آ چکی ہیں؛ دائروں کے قیدی، اُس کے لیے، ذرا سی کمی (افسانے)؛ ایک بیمار سوانار (یک بابی ڈرامے)؛ مجھے شکایت ہے (بچوں کے لیے ڈرامے)؛ جنگل میں منگل (بچوں کے لیے ناول) مرغے میاں کی ککڑوں کوں (بچوں کے لیے نظمیں)؛ اور قومی یکجہتی اور اردو (مضامین)۔ بانو سرتاج کے افسانے بے انتہا مقبولیت سے سرفراز ہو چکے ہیں۔ اس لیے ان کا یہ کہنا کہ ''جیسے بگڑا شاعر مرثیہ گو بن جاتا ہے ویسے ہی ناکام نثر نگار طنز نگار بن جاتا ہے'' کم سے کم ان پر لاگو نہیں ہوتا۔ بہر حال میں ان کی اس بات سے سہمت ہوں کہ ''اردو میں طنزیہ ادب کو ادب ہی نہیں مانا جاتا''۔ شاید اس کی یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ اردو میں اکثر و بیشتر قلمکار مشاعروں میں واہ واہ بٹورنے کی غرض سے اپنی ساری قوت شاعری پر صرف کرتے ہیں

ناشر: نرالی دنیا پبلیکیشنز، ۳۵۸۔اے، بازار دھلی گیٹ، دریا گنج، نئی دھلی، ۱۱۰۰۰۲ سن اشاعت: ۲۰۰۴ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

جن لوگوں کی طبیعت موزوں نہیں ہوتی وہ نثر کی طرف راغب ہوتے ہیں۔ چند لوگوں کو پیشے کی مجبوری کے سبب تنقید و تحقیق کا دامن تھامنا پڑتا ہے تاکہ وہ ڈاکٹر کہلائیں یا پھر اوروں کو ڈاکٹر بنا کر ترقی کے زینے طے کرلیں۔ سچ تو یہ ہے کہ طنز و مزاح کو گنے چنے قلمکاروں نے ہی سنجیدگی سے اپنایا ہے اور اس صنف میں اعلیٰ پایہ کا ادب پیدا کیا ہے پھر بھی اردو ادب میں کسی نے ابھی تک گلورس ٹراولز Gullivers travels یا انیمل فارم Animal Farm جیسی تصانیف قلم بند نہیں کی ہیں۔

زیر نظر کتاب کا پہلا مضمون 'کنویں کا مینڈک' نظام تعلیم کو طنز کا حدف بناتا ہے۔ مثلاً ایک لڑکا اس لیے میڈیکل یا نان میڈیکل سبجکٹس نہیں لیتا کیوں کہ اسے معلوم ہے کہ ڈاکٹری یا انجینئرنگ میں دھاندلیوں کی وجہ سے اس کو داخلہ نہیں مل سکتا۔ سکولوں میں والدین کا انٹرویو اس لیے رواج پایا ہے کیونکہ اب سکولوں میں پڑھائی ہوتی ہی نہیں اس لیے یہ ضروری ہے کہ والدین کو پرکھا جائے کہ وہ بچوں کو گھر پر کام کرا سکتے ہیں یا نہیں۔ اور پھر ایک بچے کو یہ خدشہ لاحق ہو جاتا ہے کہ اس کی ماں اسے سیکس ایجوکیشن کیسے دے سکتی ہے۔ اس مضمون میں سب سے بھاری چوٹ اساتذہ پر کی گئی ہے کہ وہ سال میں تین چار مہینے چھٹی مناتے ہیں اور باقی وقت میں یا تو اپنا ٹائم یوں ہی گزارتے ہیں یا پھر بچوں کو غلط سلط تعلیم دیتے ہیں۔ بچے اور ان کے والدین اس لیے چپ رہتے ہیں کہ کہیں وہ بچے کا کیریئر خراب نہ کردے۔ 'دیکھن میں چھوٹے لگیں' میں شعبے کے ٹھنگنے ہیڈ پر طنز کے تیر چلائے گئے" کیونکہ وہ اپنے احساس کم تری کے باعث اذیت رسانی کا سہارا لیتے ہیں۔ 'شکشک دین' بھی نظام تعلیم کے حوالے سے لکھا گیا ہے جس میں املا کی غلطی کے سبب مضمون کا مطلب ہی بدل جاتا ہے اور مقرر ٹیچرس ڈے کے بدلے غریب ٹیچر پر لکچر دیتا ہے۔ اس مضمون میں بانو سرتاج فرماتی ہیں ''درس و تدریس کا پیشہ ایسا واحد پیشہ ہے جس میں کام کرنے پر تو پیسہ ملتا ہی ہے، کام نہ کرنے پر بھی پیسہ ملتا ہے''۔ اسی حوالے سے ایک اور مضمون 'داستانِ ریفرشر کورس' ہے جس میں آئے دن ہو رہے تربیتی کورسز پر طنز کیا گیا ہے۔ ایک ریسرچ اسکالر کے لیے تحقیق کے دوران سوالنامے کے جوابات حاصل کرنے میں جو مصیبتیں پیش آتی ہیں ان کا بیان '...لانا جوئے شیر کا' میں بڑے ظریفانہ انداز میں کیا گیا ہے۔ '...تو کیا نام نہ ہوگا' میں طنز نگار نے اس راز کو افشا کیا ہے کہ آج کی صارفی دنیا میں ان پڑھ لوگ جن کو تعلیم کے ساتھ دور کا بھی واسطہ نہیں ہے بے شمار تعلیمی ادارے چلاتے ہیں جس سے تعلیم کے نیک اور اعلیٰ مقاصد فوت ہو جاتے ہیں۔ 'مونچھیں' میں مزاح نگار نے مونچھوں کو ان کے وضع قطع کے حساب سے تقسیم کیا ہے اور عجیب و غریب نام دیے ہیں جیسے کٹیلی مونچھیں، چلبلی مونچھیں، گھپلی

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

مونچھیں یا پھر کہیں کہیں پر وہ داڑھی میں اپنا وجود ہی کھو بیٹھتی ہیں۔ مضمون 'بڑے بے آبرو ہو کر...' میں طنز نگار نے ان عورتوں کو اپنی طنز کا نشانہ بنایا ہے جو شوہر کا نام کبھی زبان پر نہیں لاتیں چاہے وہ نماز پڑھنے کا وقت ہو یا پھر ڈاکٹر کی دکان پر پرچہ بنوانے کا وقت۔ 'کتے' میں رائٹر نے جہاں کتوں کی مختلف قسموں کو بیان کیا ہے جیسے دیسی، بدیسی اور دوغلے، چھوٹے اور بڑے، دُم دار اور بغیر دُم کے، بھونکنے والے، کاٹنے والے، خونخوار اور پاگل کتے، کلاکار، شکاری اور کھوجی کتے، وہیں ہمارے معاشرے اور اس میں شامل انسانوں کی خصلت کی جانب بھی اشارے ملتے ہیں جیسے کتوں کی طرح ہڈی چوسنا یا باس کے پیچھے کتے کی طرح گھومنا وغیرہ۔ مراقیت (Hypochondria) پر لکھے گئے مضمون 'نسخہ بلڈ پریشر کا' میں ایک عورت آئے دن رسالوں میں پڑھ کر اس پریشانی میں مبتلا ہوتی ہے کہ اسے بلڈ پریشر ہو گیا ہے اور ٹیسٹ کرنے اور گورنمنٹ ہسپتال کے ڈاکٹر کے تسلی دینے کے باوجود وہ اس وہم سے چھٹکارا نہیں پا سکتی۔ گورنمنٹ اسپتالوں کی کارکردگی کے بارے میں طنز نگار یوں رقم طراز ہیں۔ ''ان کی کارکردگی قابلِ اعتماد نہیں ہوتی۔ ضرور ان لوگوں نے قارورے اور خون کی جانچ ٹھیک سے نہیں کی ہوگی۔ ایکسرے کی پلیٹ برابر نہ لگائی ہوگی۔ ای سی جی کے آلات صحیح مقام پر نہ لگائے ہوں گے۔'' 'چائے' میں بھی مزاح نگار نے جہاں چائے کی قسموں اور ان کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے وہیں ان کو بطور طنزیہ علامتوں کے بھی پیش کیا ہے۔ 'بارے مسافر کا کچھ بیاں ہو جائے' میں جہاں بانو سرتاج نے سفرنامے لکھنے والوں پر چوٹ کی ہے وہیں مضمون 'کھانا' میں لفظ 'کھانا' کی مختلف اور حیراں کن تاویلات پیش کی ہیں۔ 'پاگل پُران' میں مصنفہ نے چند واقعات کا ذکر کیا ہے جب انہیں پاگلوں سے واسطہ پڑا تھا۔ ڈاکٹر بانو سرتاج نے 'دیواریں' کے توسط سے انسانوں، طبقوں اور ملکوں کے بیچ کھڑی دیواروں پر طنز کیا ہے البتہ وہ دل اور رشتوں کی دیواروں کو بھول گئی ہیں۔ 'ہم بھی فسانہ، لوکی بھی کہانی' میں لوکی کی کاشت اور ہماری زندگی سے اس کی معنویت کا خلاصہ کیا گیا ہے۔ 'اُف! یہ بورڈ میں' اشتہاری بورڈوں اور ان پر لکھی عبارتوں پر طنز کیا گیا ہے جن کا مدعا کچھ ہوتا ہے اور مطلب کچھ اور نکلتا ہے۔ 'آؤ پڑوسن جھگڑا کریں' ان عورتوں کی روداد ہے جو ہمیشہ لڑائی کرنے کی تاک میں رہتی ہیں اور کسی بھی بات کو نفرت کا رنگ دینے میں کامیاب ہوتی ہیں۔ مصنفہ نے 'نہ لکھے نہ پڑھے نام محمد فاضل' میں ان لوگوں پر طنز کیا ہے جن کے نام اور شخصیت میں تضاد ہوتا ہے۔ بغاوت کو کچلنے کے لیے آدمی یا سماج غصے میں کیا کچھ کر جاتا ہے، اس کی تفصیل 'تندوری مردہ' میں ملتی ہے۔ لوگوں کو ٹالنے کے لیے ہم کیا کیا طریقے استعمال کرتے ہیں اس کی تصویر 'بائی صاحب باتھ روم میں ہیں!' میں ملتی ہے۔ ریسرچ مقالوں

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

میں اظہار تشکر کرنے کی روایت، چاہے ان لوگوں کا اس مقالے میں کوئی یوگدان رہا ہو یا نہیں، 'ترا ممنون ہوں' میں ملاحظہ کیجیے۔ 'آخری مضمون 'ہوا سفید رنگ کا' میں بانو سرتاج نے موڈرن لائف پر طنز کے تیر برسائے ہیں کہ اب سفید چیزوں مثلاً آٹا، بالائی، نمک وغیرہ استعمال کرنے ہی سے ڈر لگتا ہے۔

جہاں تک کردار نگاری کا سوال ہے بانو سرطاج نے کئی کرداروں کی بڑی خوبی کے ساتھ پیکر تراشی کی ہے۔ 'دیکھن میں چھوٹے لگیں' میں ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ کے بارے میں لکھتی ہیں:

''ہمارے ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ تھے چھوٹے لال۔ قد سوا چار فٹ۔ صورت شکل ایسی کہ بدن پر اگر بال ہوتے تو چمپانزی کا گماں ہوتا۔ عادات وخصائل اسی صنف کے دوسرے بندروں سے مشابہ۔ فرق صرف اتنا تھا کہ بندر ہمہ وقت اپنا جسم کھجاتے تھے، چھوٹے لال کا زیادہ وقت دوسروں کو نوچنے میں گزرتا۔ موٹی فٹ بال بیوی کی جوتیوں کے طفیل سر کے آدھے بال غائب تھے۔ بھوری آنکھیں کوّے کی طرح حریص، جو ہر دم کہیں سے کچھ اڑا لینے کی فکر میں رہتا ہے۔ کچھ نہ ملے تو ڈھور کے مرنے کی دعا مانگتا ہے۔ زبان کٹھ پھوڑے کی طرح تیز جو لکڑی میں سوراخ کر دیتی ہے۔ چھوٹے لال کے بول بھی مخاطب کو چھید کر رکھ دیتے۔ ذہانت میں لومڑی تھے تو گرفت چیتے کی گرفت تھی۔ ایک مرتبہ جس کو دبوچ لیا اس کا آزاد ہونا محال۔ جونک جیسے تمام خون چوس لینے کے بعد پٹ سے گر پڑتی ہے اسی طرح چھوٹے لال جب تک اپنے مخالف کو زیر نہ کر لیتے اس سے چمٹے رہتے۔ فخریہ اعلان کرتے کہ مجھ سے بگاڑ کرنے والا چین سے نہیں رہ سکتا۔'' (ص ۲۸)

'پاگل پُران' میں مصنفہ ایک اور کردار کو یوں پیش کرتی ہیں:

''ہماری پڑوسن بڑی باکمال خاتون ہیں۔ ماشاءاللہ بلند آواز کی مالک ہے اور خاوند، بچوں اور ملازمہ پر گرجنے برسنے کی شائق بھی۔ تمام دوپہر فُل اسپیڈ پر ریڈیو چلا کر زنانہ، مردانہ، دونوں آوازوں میں سُر ملا کر گایا کرتی ہیں۔ خوش مزاج بھی بھلا کی واقع ہوئی ہیں۔ ایسے بلند بانگ قہقہے لگاتی ہیں کہ پوچھیے نہیں۔ ان کی گرج، چمک اور چہک پر آپ ہی کی طرح اور لوگ بھی انہیں پاگل کہتے ہیں''۔ (ص ۷۴)

بانو سرتاج کی زبان میں روانی بھی ہے اور شیرینی بھی جو میٹھی چھری کا کام کرتی ہے۔ طنز کے نشتر

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

سیدھے قاری کے دل میں پیوست ہوتے ہیں۔ وہ محاوروں کا برمحل استعمال کرتی ہیں جو سونے پر سہاگہ کا کام کرتا ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو بانو سرتاج کی تصنیف 'ترا ممنون ہوں' ہمارے سماج خصوصاً تعلیمی نظام میں ہو رہی دھاندلیوں کے بارے میں ہماری آنکھیں کھول دیتی ہے اور ہمیں اس کا سدّباب ڈھونڈنے کے لیے اکساتی ہے جو اس کتاب کے مقصدی پہلو کو اجاگر کرتا ہے۔ امید ہے آگے بھی موصوفہ یوں ہی اردو ادب میں بیش بہا موتی جڑتی رہیں گی۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

چہرے یاد رہتے ہیں

منوّر رانا

منوّر رانا بنیادی طور پر شاعر ہیں اور وہ بھی غزل کے شاعر مگر کبھی کبھی وہ نثر میں بھی اپنا قلم آزماتے ہیں۔ نتیجہ ہمارے سامنے 'چہرے یاد رہتے ہیں' کی شکل میں آیا ہے۔ بقول مصنف اس کتاب کے مضامین نہ تو کسی کی توصیف اور نہ ہی تضحیک کے لیے لکھے گئے ہیں۔ مذکورہ کتاب میں ایک طرف مختلف شخصیات کی پیکر تراشی کی گئی ہے جو صرف تاثرات پر مبنی ہے اور دوسری طرف چند شہروں جیسے کولکاتا، ممبئی، حیدرآباد اور ریاست بہار کا ذکر بڑی صاف گوئی سے کیا گیا ہے۔ کولکاتا کے بارے میں لکھتے ہیں: ''کلکتے کی کئی پوجا بہت مشہور ہیں۔ درگا پوجا، کالی پوجا اور کرسی پوجا..... کرسی پوجا میں جھوٹ بولنا، تعریف، کرنا اور غیبت سے منہ جھوٹا کرنا ضروری ہوتا ہے۔'' اسی طرح اردو کے تین مراکز دہلی، لکھنؤ اور بنگال کا موازنہ یوں کرتے ہیں۔ ''حالاں کہ اہالیان لکھنؤ اور دہلی پہلے تو بادشاہوں اور نوابین کو خوش کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ اب اپنے سیاسی آقاؤں کے دربار میں سجدہ ریز رہتے ہیں۔ اس کے برعکس بنگال کا ادنیٰ سے ادنیٰ صحافی بھی اپنی قلندرانہ روش، انا پسندی، فقیرانہ طرز حیات اور کردار کی پختگی کے سہارے بڑے بڑے دربار میں سر اٹھائے ہوئے داخل ہوتا ہے اور کسی بھی برسر اقتدار شخصیت سے نظر ملاتے ہوئے خفت محسوس نہیں کرتا ہے۔''

ناشر: مژگاں پبلی کیشنز، ۵۸، جے توپسیا روڈ، کولکاتا ۷۰۰۰۲۹ سن اشاعت: ۲۰۰۷ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

اردو ادب اور تنقید کے حوالے سے منوّر رانا نے کئی مضامین قلمبند کیے ہیں۔ اردو ادب کی کسمپرسی اور ادیبوں کی گمنامی کی ذمے داری وہ بلا واسطہ طور پر نقادوں کے سر پر ڈالتے ہیں۔ چنانچہ 'ہمارے ملک میں اردو کا کاروبار ہوتا ہے' میں لکھتے ہیں کہ اردو ادب میں کمزور شاعروں اور ادیبوں کو تارہ بنانے کے لیے ہر چھتری کے آس پاس کچھ کبوتر بیٹھے رہتے ہیں (مراد کبوتر بازی میں بھڑکی دینے سے ہے) جنہیں عرف عام میں نقاد کہا جاتا ہے۔ ایک اور جگہ فرماتے ہیں: ''تبصرے کے لیے آئی کتابوں کا سودا کسی کتب فروش سے اس طرح کیا جاتا ہے کہ جس ورق پر برائے تبصرہ لکھا ہوتا ہے اس ورق پر سفید روشنائی سے صاف کتاب کی تحریر مٹا کر فوٹو کاپی کروائی جاتی ہے پھر اس ورق کو سلیقے سے کتاب میں چپکا کر سرکاری اداروں میں یا لائبریریوں میں سپلائی کر دیا جاتا ہے۔ یعنی اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی کے نام پر اس طرح مظلوم اردو زبان کی جسم فروشی ہو رہی ہے:

زبانیں بھی تجارت کا ذریعہ بن گئیں رانا
ہمارے ملک میں اردو کا کاروبار ہوتا ہے

نقادوں کے بارے میں چند اور تاثرات:

- اردو والوں نے تحقیق سے زیادہ تنقیدی کھسر پھسر میں اپنا قیمتی وقت ضائع کیا ہے۔
- انٹرنیٹ کی مدد سے انگریزی ادب کے دو چار بے ربط، لیکن بھاری بھرکم جملوں کا ترجمہ کر کے اردو ادب میں فرضی رعب گانٹھنے والے فارمی انڈوں کی طرح اتنے ناقد پیدا ہو رہے ہیں کہ تنقید سے ادب کو فائدے کا امکان ہی ختم ہو گیا ہے۔

(ھمارے ملک میں اردو کاکارو بار ھوتاھے)

- اردو زبان کے حوالے سے چند اہم تاثرات:
- عظیم ہندوستان وہ آئینہ خانہ ہے جس میں دنیا کی مہذب قومیں اپنا سراپا دیکھ سکتی ہیں۔ اور اردو ہندوستانی نسل کی وہ لڑکی ہے جو آج اپنے سلونے حسن اور مٹھاس بھرے لہجے کی بدولت ساری دنیا میں مقبول و محبوب ہے۔ (موت لے جاکے خداجانے کھاں چھوڑتی ھے)
- اردو زبان و ادب کی حفاظت، اس کی پرورش، سلامتی اور اس کی ترویج و ترقی کے لیے کائستھوں نے ہر زمانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔

(موت لے جاکے خدا نے کھانی چھوڑتی ھے۔)

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

- مشاعرہ کبھی ادب کی ترسیل اور نوعمروں کی ذہنی ترتیب کی جگہ تھا لیکن اب صرف جذبات بھڑکانے کا ذریعہ ہے۔ (مشاعرے میں لیے پھرتے ھیں جسے شاعر)
- زبان سے محبت کرنے والے ہر سنجیدہ شخص کو اس بات کا بے حد دکھ ہے کہ وہ اردو زبان جو کبھی تہذیبی سرفرازی اور عالمانہ لب و لہجے کی ضامن تھی، اب صرف روزی روٹی کمانے کا ذریعہ بن کر رہ گئی ہے۔ (اک گیت گارھا ھے کسی اور گاؤں میں)

منور رانا نے کئی ادیبوں کے فن اور ان کی شخصیت پر مجمل نظر ڈالی ہے تاکہ قارئین ان کی تخلیقات سے براہ راست مستفید ہو سکیں۔ ان قلمکاروں کے نام گرامی یوں ہیں۔ کرشن بہاری نورؔ، فنا نظامی، امین صاحب، خمار بارہ بنکوی، بیکل اتساہی، ساغرؔ اعظمی، ممتاز راشد، احسن مفتاحی، حاجی نیاز احمد، قرۃ العین حیدر اور افضل صاحب۔ رانا کو اس بات کا احساس ہے کہ ان میں سے بیشتر ادیبوں کی اتنی پذیرائی نہیں ہوئی جتنی ہونی چاہیے تھی۔

منور رانا کی زبان میں شاعرانہ مٹھاس ہے۔ اسلوب میں طنز کی کاٹ اس درجہ شامل ہے کہ قاری سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ سیاست کے حوالے سے چند اقتباسات درج ذیل ہیں۔

- ہندوستان غالباً دنیا کا واحد ملک ہے جہاں بڑے بڑے سیاسی نفرت کدوں کے باوجود آج بھی ہزاروں غیر مسلم نہ صرف یہ کہ روزہ رکھتے ہیں بلکہ روزہ داروں کے لیے افطاری اور سحری کا انتظام بھی کرتے ہیں۔ (کون رمضان میں غالب سے ملاقات کرے)
- ویسے تو ہندوستان کا الیکشن اب صرف جمہوریت کے جھوٹے اشتہار سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ (مشاعرے میں لیے پھرتے ھیں جسے شاعر)

گھریلو زندگی پر بھی موصوف نے طنز کے تیر برسائے ہیں۔ ملاحظہ ہو چند اقتباسات:

- کیسا بے غیرت زمانہ آ گیا ہے کہ بہویں اپنے ہاتھ میں دبے ریموٹ (remote) سے شوہر اور ٹی وی (TV) دونوں کو قابو میں رکھتی ہیں۔ (ھم اٹھتے تھے اذانوں سے بھی پہلے)
- یہ ڈبوں کے دودھ کی دین ہے کہ پیدا بعد میں ہو رہے ہیں، شوگر پہلے ہوئی جا رہی ہے۔ (ھم اٹھتے تھے اذانوں سے بھی پہلے)
- میاں فی زمانہ یا تو زمینوں کی قیمتیں بڑھی ہیں یا کمپنیوں کی۔ (شادی کے گھر میں پیارے تھے دولھا بنے ھوئے)
- جب سے یہ موا موبائیل آ گیا ہے، سسرال کی پل پل کی خبریں دشمن کے ہیڈ کوارٹر

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

یعنی اپنے مانگے پہنچاتی رہتی ہیں اور مانگے والے بھی اتنے بدذات ہیں ہر وقت تازہ کمک کے ساتھ یہاں پر آدھمکنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ (ہم اٹھتے تھے اذانوں سے بھی پہلے)

زیر نظر کتاب میں بہت سارے اشعار درج کیے گئے ہیں جن میں سے میں نے تین اشعار چن کر یہاں نقل کیے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

ے کشمیر کی وادی میں بے پردہ جو نکلے ہو
کیا آگ لگاؤ گے برفیلی چٹانوں میں (ساغر اعظمی)

ے مر بھی جاؤ تو نہیں ملتے ہیں مرنے والے
موت لے جا کے خدا جانے کہاں چھوڑتی ہے (کرشن بہاری نور)

ے جلتے ہوئے مکان سے باہر نکل کے آ
اس وقت یہ نہ سوچ کہ معمار کون ہے

مجموعی طور پر 'چہرے یاد رہتے ہیں' نثری ادب میں گراں مایہ اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ساتھ ہی ان ادیبوں کے خاکے بھی آنے والی نسلوں کے لیے چھوڑ جائے گی جن کا ذکر اس کتاب میں آچکا ہے۔ اس خوبصورت کوشش کے لیے منور رانا مبارکباد کے مستحق ہیں۔

❖ ❖ ❖

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

خونخوار تیندوے

ـــــ نقشبندی قمر نقوی

اردو زبان وادب میں آئے دن شعری اورافسانوں مجموعے شائع ہوتے ہیں مگر سائنس، تکنالوجی اورزندگی کے دوسرے شعبوں پر بہت کم لکھا جارہا ہے۔اس تناظر میں شکارنامہ 'خونخوار تیندوے' کا شائع ہونا بہت اہمیت رکھتا ہے۔نقشبند قمر نقوی نہ صرف نامور شکاری ہیں بلکہ ایک بلند پایہ قلمکار بھی ہیں۔انہوں نے شکاریات اور فکشن پر کئی کتابیں قلمبند کی ہیں۔حال ہی میں ان کا دلچسپ ناول 'یہ پھول خاموش ہے' شائع ہو چکا ہے جبکہ شکاریات پر ایک اور کتاب 'شیر اور وہ بھی آدم خور' طباعت کے مراحل سے گزر رہی ہے۔اس بارے میں وہ خود ہی رقم طراز ہیں۔

> ''میں واحد ادیب ہوں جس نے شکار کی داستانوں کو ادب کا اعلیٰ ترین مقام عطا کیا ہے۔میرا اسلوب بیان، میری زبان، میری منظر کشی، شکوہِ الفاظ سب منفرد میرے اپنے ہیں۔''

زیر نظر کتاب میں چار جو کھم بھرے شکاری قصے درج ہیں۔(۱) بھان متی کا کنبہ (۲) آدم خور تیندوا (۳) ہلواڑے کا آدم خور (۴) قطب شمالی کے سائے میں۔ان میں سے تین قصے تیندووں کے شکار سے تعلق رکھتے ہیں اور ایک گرزلی ریچھ (Grizzly Bear) کے بارے میں ہے۔نقشبند قمر نقوی کا خیال ہے کہ عام لوگ

ناشر:انتساب پبلی کیشنز، سرونج ، ایم پی،
سن اشاعت:۲۰۰۸ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

شیر اور تیندوے میں فرق نہیں کر پاتے۔ اسی لیے آدم خور کے ہر شکار کو شیر سے منسوب کرتے ہیں۔ وہ خود ان معاملوں میں جلد بازی سے کام نہیں لیتے۔ البتہ اپنی مہم میں بڑے صبر و استقلال سے جٹے رہتے ہیں جب تک کہ انہیں کامیابی نہیں ملتی۔ آدم خور شیر یا تیندوے کے ماگھ (پنجوں کے نشان) پہچان کر ہی وہ اس پر حملہ کرتے ہیں کیونکہ بقول ان کے ''میں بحمد اللہ تعالیٰ شکاری ہوں..... ظالم نہیں۔'' ان کے شکاری جسم میں جب ادیب کا دل بولتا ہے تو ان کے قلم سے مندرجہ ذیل فقرے بہہ نکلتے ہیں۔

''میں جانور گارے کے لیے باندھتا ہوں، اور ان پر مجھے رحم بھی آتا ہے۔ بیچارے جنگل ویرانے میں رات بھر بندھے موت کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ اس یقین کے ساتھ کہ کسی بھی لمحے ملک الموت ان کو دبوچ لے گا، لیکن ایک بھینسے، گدھے یا بکرے کی جان قربان کرنے سے نہ جانے کتنے انسانوں کی جانیں بچ جاتی ہے!''

اپنی زندگی کے بارے میں قمر نقوی فرماتے ہیں:

''میں نے ۱۹۴۲ء میں شکار کی ابتدا کی، ۱۹۴۷ء تک کا سارا وقت اسی مشغلے میں گزارا، تعلیم بھی حاصل کرتا رہا۔ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۶۳ء تک صرف شیر اور تیندوؤں کے شکار میں مصروف رہا اگرچہ دوسرے قابل شکار جانوروں کو بھی نہیں چھوڑا۔ اس عرصے میں کم از کم چالیس شیر اور بڑی تعداد میں تیندوے شکار کیے۔''

قمر نقوی نے تقسیم ملک کے بعد پاکستان ہجرت کی مگر آدم خور جانوروں کے شکار کے سلسلے میں وقتاً فوقتاً حکومت ہند کی درخواست پر ہندوستان آتے رہے۔ ۱۹۶۹ء سے ۱۹۸۰ء تک ایران میں اعلیٰ عہدے پر فائز رہے اور UNWWF کے ساتھ وابستہ رہے۔ اس کے بعد امریکا میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اپنی صلاحیت کے بارے میں مزید فرماتے ہیں:

''شاید میں آخری شکاری ہوں جو اس قدر وسیع شکاری تجربے اور اتنی متنوع ادبی استعداد کا حامل ہے، میرے بعد اس وسعت و کمال کے شکاری ہونا مشکل ہے اس لیے کہ وقت بدل چکا..... اب جنگلی جانوروں کی بقا اور حفاظت ہی ایک مسئلہ بن گئی ہے۔''

زبان کی روانی اور اسلوب بیان کی ندرت کے باعث نقوی کا شکار نامہ محض روزنامچہ بن کر نہیں رہ گیا ہے بلکہ انہوں نے قصوں کو دلآویز طریقے سے یوں بیان کیا ہے کہ قاری کی دلچسپی اول سے اخیر تک برقرار رہتی ہے۔ بقول نقوی ''شکار۔ صحرا نوردی۔ مناظر۔ اتفاقات۔ حادثات۔ اچھے مواقع۔ برے لمحات۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

یہ سارے میں بہ آسانی صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیتا ہوں اللہ تعالیٰ سبحانہٗ نے مجھے قلم عطا فرمایا ہے اور اس میں روانی بھی دی ہے، یہ قلم ابھی تک رواں دواں ہے۔'' موصوف جائے واردات کی منظر کشی بھی اسی فنکاری سے کرتے ہیں جس ہنرمندی سے وہ جانوروں کی پیکر تراشی اور ان کی عادتوں و خصلتوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ وہ مقامی لوگوں کے رہن سہن پر بھی گاہے بہ گاہے روشنی ڈالتے ہیں اور کبھی کبھی اپنے شکاری دوستوں، ہمسفروں اور مددگاروں کے خاکے بھی دلکش انداز میں کھینچتے ہیں۔ 'قطب شمالی کے سائے میں' میں شکاری قمر نقوی نے رائفل کے بدلے اپنے خامے سے الاسکا کے دلکش قدرتی مناظر اور وہاں کے باشندوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے جس کو پڑھ کر قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ شکار نامہ نہیں بلکہ سفر نامہ پڑھ رہا ہے۔ قوموں اور ملکوں کے بارے میں لکھتے ہوئے قلمکار اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں بڑے پتے کی بات چٹکیوں میں کہہ جاتے ہیں۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

- ''ہوشیاری کی بھی انسان نے حد کر دی۔ جانوروں کی تو علیحدہ چکمہ دیتا ہے، انسان تو انسان کو بھی وہ چکمے دیتا ہے کہ ہوش اڑ جائیں اور غلط فہمی کی انتہا یہ کہ خود اپنے خالق باری تعالیٰ کے ساتھ دھوکے بازی سے باز نہیں آتا! پہلے تو لوگ، شیطان سے ڈرتے تھے، اب یہ عالم ہے انسان انسان سے اتنا ڈرتا ہے کہ ابلیس کی تو حیثیت ہی نہیں۔ انسان اب شیطان کا استاد بن گیا ہے۔''
- ''برصغیر میں متعدد ایسے شکاری گرزے ہیں جن کے کارناموں کے سامنے سارے انگریز شکاریوں کے کارنامے ہیچ ہیں۔ یہی قصہ جو میں اردو میں لکھ رہا ہوں اگر انگریزی میں ہو اور میری پشت پر کچھ انگریز اسے پروموٹ کرنے کی درپے بھی ہوں تو زیادہ وقیع اور مقبول ہو جائے گا!''
- ''جو انگریز ہندوستان آتا ان کی تعداد کثیر تھی وہ اپنی پہلی فرصت میں شیر اور چیتوں کے شکار پر نکلتا، نہ اسے محنت کرنا پڑتی، نہ پسینہ بہانا ہوتا اور کالے لوگ اس کے لیے شیر سامنے لا کر کھڑا کر دیتے اور یہ بزدل گورا اسے مار لیتا۔''
- بہر حال ان کالے رنگ کے مصنوعی گوروں (انگریزی تعلیم یافتہ ہندوستانی افسروں) نے شیروں اور چیتوں کی بربادی میں دل کھول کر حصہ لیا اور اپنے کو شکاری ثابت کرنے کے زعم اور اپنے اختیارات اور عہدے کے غلط استعمال کے ذریعے اعتدال کی حدود سے

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

تجاوز کرتے رہے۔

- دراصل پاکستان میں قابل شکار جانوروں کی کمی کا باعث خود وہ شکاری ہیں جو خلاف قانون شکار کر کے جانوروں کی تباہی کرتے ہیں اور شکار جیسے شریفانہ اور مہذب شغل کو بدنام کرتے ہیں۔ ہندوستان میں بھی یہی صورت حال ہے، وہاں انگریزوں نے شیر چیتوں کی تباہی مچائی اور ان کو روکنے والا کوئی نہیں تھا.....!
- پاکستانی پولیس والوں کی عادت ہے شریف، کمزور اور معقول لوگوں کو ضرور تنگ کرتے ہیں۔
- عرب تمام رات بالعموم جاگتے ہیں.....رت جگا مناتے ہیں اور نہایت جم کر ٹی وی دیکھتے ہیں، گانا بجانا کرتے ہیں، تفریح اور عیش کرتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں اور سحر کے بعد سو جاتے ہیں، جب تک دل چاہے سوتے ہیں، جب اٹھے تو تھوڑی دیر کے لیے کام پر گئے، وہاں کام کوئی نہیں کیا اور واپس آ گئے۔ (ماہ رمضان کا معمول)

نقشبند قمر نقوی شکاری کے اوصاف اور شکار کے اصول بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

- شکاری کے اوصاف میں 'صبر' اہم ترین صفت ہے۔ جس شکاری کے مزاج میں صبر کا مادہ نہ ہو اس کو شکار میں ناکامی کا یقین رکھنا چاہیے۔
- شکاری کے اخلاق وتہذیب کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ اپنے شکار کو کم از کم اذیت پہنچا کر مارے۔ کسی جانور کو دیر تک کی تکلیف میں مبتلا کرنا نامناسب ہے!
- میں شکار کے دوران کبھی کھلی جگہ حتی الامکان نہیں نکلتا۔ جس شکاری نے اس اصول سے روگردانی کی اس کی کامیابی کا امکان نہایت قلیل رہ گیا۔ شکار میں کامیابی کے لیے، خصوصاً درندوں کے مقابلے میں اپنے کو چھپائے رکھنا لازمی ہے۔
- مچان باندھی جانے کے مقام کی شرائط ہیں۔ جیسے چوبیس فٹ سے زیادہ اونچی ہو، دو تین شاخوں کے اتصال پر ہو.....، درخت کے تنے سے کم از کم دس بارہ فٹ دور ہو۔
- شکار میں صرف ایسا شخص ساتھ ہونا چاہیے جو جری ہو، ہمت والا ہو، بے غرض ہو، بامروت اور روادار ہو اور محتاط و مہذب ہو۔
- کسی جانور کا نشیب سے بلندی کی طرف بھاگنا یا حملہ کرنا بہت ہی دشوار کام ہے۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

حیوانوں کے خصائص پر روشنی ڈالتے ہوئے موصوف فرماتے ہیں:

- وہ جانور جو میدانی علاقوں میں ہوتے ہیں ان کی دور کی نظر بہت تیز ہوتی ہے اور نزدیک کی نظر بالکل ناکارہ۔
- ہر شیر اپنی ایک ملکیت تشکیل دیتا ہے۔ اس مملکت میں بلاشرکت غیرے حکمرانی کرتا ہے، وہ مملکت جس پر ایک شیر حکمران ہوتا ہے اس کا رقبہ بیس مربع میل ہوتا ہے، کم وبیش یہ اتنا بڑا علاقہ نہیں کہ شیر کی تلاش ناممکن ہو جائے۔
- عام طور سے شیر انسان سے مزاحمت نہیں کرتا لیکن اتفاق تو ہر وقت ممکن ہے بھوکا شیر یا کسی داب میں آیا ہوا جانور یا اچانک اپنے دفاع پر مجبور ہو جانے والا شیر، کسی کو بھی ہلاک کر سکتا ہے۔
- شیر طویل دوڑ دوڑنے کے لیے نہیں بنا ہے، وہ شکار کو پکڑنے کے لیے دوڑتا ہے بلکہ برق رفتاری سے حملہ آور ہوتا ہے۔ لیکن اس وقت جب شکار زیادہ سے زیادہ تیس گز پر ہو۔
- کبھی ایسے موقع (شکار پر حملہ کرنے کا) پر شیر دھاڑتا بھی ہے۔ اس دھاڑ کا مقصد مطلوبہ جانور کے اعصاب کی حرکت کو معطل کرنا ہوتا ہے۔ آواز ایسی وحشت ناک ہوتی ہے کہ سننے والے کے حواس خمسہ بری طرح متاثر ہو جاتے ہیں۔ جسم کی کوئی حرکت باقی نہیں رہتی۔ جسمانی تعطل یا انجماد۔
- شیر جانور کی پشت پر چڑھ کر اپنے چار پانچ انچ لانبے ناخن اس کے پوست میں گاڑ کر گویا اس کو مہمیز دیتا ہے۔ ساتھ ہی گردن جھٹکے سے پیچھے کھینچ لیتا ہے۔ بھاگتا ہوا جانور ناخنوں کی چبھن سے گھبرایا ہوا قدم آگے بڑھاتا ہے اور انجانے میں اس کی گردن پیچھے کھینچ جاتی ہے۔ گردن کی ہڈی فوراً ہی ٹوٹ جاتی ہے اور موت واقع ہوتی ہے۔
- کچھ پرندے شیر کا تعاقب کرتے ہیں اور جہاں تک وہ نظر آتا رہے وہاں تک اس کے ساتھ ساتھ شور کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ شیر ہی ان سے تنگ آ جاتا ہے۔ اسی لیے وہ دن کے وقت باہر نہیں نکلتا۔ آدم خور دن کے وقت نکلتا ہے لیکن اس طرح جھاڑیوں اور جنگل کا سہارا لیے رہتا ہے کہ کوے، مینائیں اور چڑیاں اس کو نہ دیکھ سکیں۔ یہی سب سے زیادہ شور کرنے والے پرندے ہیں۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ادبی گفتگو

اسلم عمادی

''میں نے اردو شاعری کو قدم بہ قدم پڑھا تھا۔ آب حیات سے شروع ہو کر، میر، مومن، انشاء، سودا، ذوق، غالب سے اقبال تک، مجاز سے ساحر تک، تصدیق حسین خالد سے میراجی، ابن انشاء سے جیلانی کامران تک، بہت سے شاعروں کے کلام کو اس کے نظریے اور سوانح کی روشنی میں پڑھا تھا اور اسی لیے جب راشد سے منیب الرحمٰن تک آیا تو نئی شاعری مجھے اب نیا رجحان لگا جو میرے مزاج سے ہم آہنگ تھی اور اس لیے نئی شاعری مجھے تلخ طور پر نہیں بلکہ اردو شعر و ادب کی نئی جہت کی طور پر ملی۔

(اسلم عماری ۔زینہ زینہ راکھ پر تبصرہ)

اسلم عمادی اردو کے ایسے نامور شاعر و ادیب ہیں جنہوں نے ملازمت کے سلسلے میں خلیجی ممالک میں رہ کر بھی اردو سے ناتا نہیں توڑا اور جیسا کہ زیر نظر کتاب 'ادبی گفتگو' سے ظاہر ہے ان کے درون میں اعلیٰ پایہ کا انتقادی جوہر موجود ہے اور ان کی نظر ہمیشہ عصری منظر نامے پر رہی ہے۔ محمد اسلم عمادی ۱۵ دسمبر ۱۹۴۸ء کو پیدا ہوئے، بی ای میکانیکل کی ڈگری ۱۹۷۰ء میں حاصل کی اور پھر کویت، لیبیا اور ہندوستان میں مختلف کمپنیوں میں بحیثیت انجینئر کام کرتے رہے۔ ان کی پانچ تصانیف اب تک منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔

ناشر: مرزا فرحت اللہ بیگ اکیڈمی، اے سی گارڈز۔ حیدر آباد ۴ سن اشاعت: ۲۰۰۷ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

(۱) نیا جزیرہ ۱۹۷۴ء (۲) اجنبی پرندے ۱۹۷۹ء (۳) اگلے موسم کا انتظار ۱۹۸۴ء (۴) قریۂ فکر ۱۹۹۵ء [شاعری] اور (۵) ادبی گفتگو ۲۰۰۷ء [نثر]

مندرجہ بالا اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلم عمادی کو جدید شاعری سے بے حد لگاؤ رہا ہے۔ وہ شعر میں آمد کو خاصی اہمیت دیتے ہیں۔ حالانکہ وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ جدید شاعر کو موضوعاتی شاعری سے انحراف کرنا چاہیے پھر بھی 'جدید شاعری کے چند نئے موضوعات' کے تحت انہوں نے نئی شاعری کے سفر پر اپنے تاثرات قلمبند کیے ہیں۔ مصنف کے مطابق نئی شاعری میں تنہائی کا کرب، مثالی شخص اور حقیقی شخص کا تصادم، انفرادیت کی شکست، اینٹی ہیرو اور absurd کردار کا وجود، ٹوٹتے اور لایعنی رشتوں جیسے موضوعات کو خاص طور پر برتا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ذات (ذات کا شعور، ارتفاع ذات)، بے معنویت (مشیئیت، غیر حقیقی حقائق کا احساس)، موت (موت سے خوف، موت سے عشق)، مستعمل اقدار سے اختلاف، انسانی مسائل کو سمجھنے کی کوشش اور کثیف ماحول سے آزاد ہونے کی کوشش کو بھی جدید شاعروں نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ جدید شاعر کے بارے میں عمادی فرماتے ہیں کہ: ''جدید شاعر زندگی کے کسی بنے ہوئے رسمی معیار زندگی سے اتفاق نہیں کرتا'' جبکہ ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ: ''وہ انسان کی انسانیت سے مایوس نہیں بلکہ انسان کی بدلتی ہوئی ہیئت سے پریشاں ہے کہیں اس کے خون میں زہر تو نہیں سما گیا ہے۔''

'فن شعر اور ترسیل' میں رائٹر فرماتے ہیں: ''فن لطیف انسانی جذبات اور آرٹسٹک حسیت کے اظہار کا واسطہ ہے۔ اسی لیے اس کا تعلق جمالیات اور جذبات سے ہے۔ ہر فن کار کچھ نہ کچھ کہنا چاہتا ہے اور ہر کہنے والا اپنے سننے والے تک پہنچنا چاہتا ہے۔'' شاعری کے لیے آمد، ریاض، نظریہ، عبقریت اور رجحان کی اہمیت کو موصوف نے اجاگر کیا ہے۔ بقول مصنف موضوعات کی کمی کی تلافی کے لیے صنائع، بدائع، فصاحت، بلاغت، لفاظی اور ترتیب و ترکیب پر وقتاً فوقتاً زور دیا گیا۔ الفاظ سے اظہار کی سرمد شروع ہو جاتی ہے لیکن الفاظ افکار و جذبات کے اظہار کے لیے کمزور وسیلہ ہیں۔ الفاظ سے دو قدم آگے لفظیات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد تشبیہات و استعارات پر فوکس کیا جانے لگا۔ جس کی موڈرن صورتیں تجریدی (abstract) اور علامتی وسیلۂ اظہار ارادی ابہام اور پنکچویشن ہیں۔

''ترسیل شعر کا مقصد خوابوں کا فصل بونا بھی نہیں ہے اور نہ ہی صحافتی زبان کا تماشا ہے۔ زبان اور انداز ترسیل ایسے ہوں کہ شعر کے اندر چھپے ہوئے افکار کسی نادر انداز میں چھلکیں اور فنکاری کی رعنائی

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

محسوس ہو'' ..... ''غیر ضروری مصنوعیت اور لفاظی اصل کرب یا نشاط یا تصور کے ابلاغ میں حارج ہو جاتی ہے۔'' اس باب میں ترسیل کی ناکامی السانی اور اسلوب کے ارادی اور غیر ارادی تجربات اور علامتی نظام پر بھی بحث کی گئی ہے۔

تیسرے مضمون کا عنوان ہے 'شاعری کے ابعاد'۔ اسلم عمادی نے تین ابعاد کی نشاندہی کی ہے (۱) خارجی (بہترین منظر کی تلاش) (۲) داخلی (درونی کرب یا فرحت کا اظہار) اور (۳) صوری تجربے حواس خمسہ کے ذریعے حاصل ہوتے ہیں جبکہ داخلی عنصر کے بغیر شاعری صرف بیانیہ ہو جاتی ہے۔ ''شاعری کا اصلی حسن اس کا داخلی کرب اور شاعر کا وہ جلتا ہوا احساس ہے جو بادلوں سے باہر آنے کے لیے تڑپتا ہے۔'' ایک اور جگہ عمادی رقم طراز ہیں۔ ''ایک اچھا شعر وہ ہے جو وجدان سے جنم لیتا ہے اور خیال اور منظر دونوں کچھ اس طرح ملے ہوئے ہوتے ہیں کہ دونوں کو علاحدہ کرنے اور دونوں میں تقدم دریافت کرنے کے لیے ایک کیمیائی عمل درکار ہوتا ہے۔''

فصل 'بحث و تمحیص' کے تحت اسلم عمادی نے 'نئی غزل پر چند باتیں' اور 'نئی زندگی اور نئی اردو شاعری' پر مضامین لکھے ہیں۔ موصوف کا خیال ہے کہ غزل شاعری کی ایک مہذب شکل ہے اور اس کا رشتہ ایک کلچر سے ہے۔ چنانچہ ماضی میں بیشتر شعراء نقارۂ خلقِ خدا بن کر مروجہ روایات سے ہمکنا اور اپنے واقعی جذبات کے اظہار سے تہی دامن رہے، اسی لیے اچھے شاعروں کی ہمیشہ کمی محسوس کی گئی۔ اس کے باوجود غزل کے فکر، ہیئت اور فارم میں تبدیلیاں ہوتی رہیں، کرخت اور بے ڈول الفاظ کا تصرف ہونے لگا، لمحاتی اظہار پر زیادہ زور دیا جانے لگا اور لفظیات میں بھی نمایاں فرق نظر آنے لگا۔ اسی طرح 'نئی زندگی اور نئی اردو شاعری' میں رائٹر نے موجودہ زندگی کے ان مسائل پر روشنی ڈالی ہے جو نئی شاعری میں جگہ پا چکے ہیں۔ جیسے اقدار کی شکست وریخت، خوش آئند مستقبل کی آرزو، نئی صنعتی زندگی میں فرد کی کم اصلیت اور اس کی وجودی اہمیت کا زوال، تھکے ہوئے واماندہ اشخاص کا محض بے نام اکائیاں بن کر رہ جانا، تعلقات کا بے لوث اور بے حس ہونے کا المیہ، اور مسئلہ جات کا کوئی ایک حل دستیاب نہ ہونا۔

اسلم عمادی نے 'خصوصی مطالعے' کے تحت پانچ موضوعات پر اپنی رائے ظاہر کی ہے۔

(۱) غالب کا غیر متوقع لہجہ۔ بقول عمادی لہجے کا فرق ہی غالب کو اپنے ہم عصروں سے متمیز کرتا ہے۔

(۲) راز کی تحریر (خورشید احمد جامی)۔ ان کی شاعری میں استعارہ، تشبیہ اور اشارہ پر زور، مصوری سے لگاؤ اور شب و روز کا تفاوت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ انہیں خوبصورتی سے عشق ہے۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

چند اشعار:

ے بڑے دلچسپ دعوے تھے بڑے رنگین دھوکے تھے
گلوں کی آرزو میں زندگی شعلے اٹھا لائی

ے حالات کی آنکھوں میں ذرا جھانک کے دیکھو
اس طرح سمندر کبھی صحرا نہ بنے تھے

(۳) گھنی بھنویں سوچتی آنکھیں (قاضی سلیم)۔ بے روزگاری اور بیکاری کے مسئلے، فرد اور کائنات کا تفاوت، شاعری میں نشاط غم اور لذت کرب نے جگہ لی ہے، تحریک و جنبش کے عاشق اور ارتعاش کو منتخب کرتے ہیں۔ نمونہء کلام:

ے مسیح وقت تم بتاؤ کیا ہوا؟/ دیو علم کے چراغ کا/ کیوں بھلا بپھر گیا؟/ دھواں دھواں بکھر گیا
/سنو کہ وقت چیختا ہے: ''کام ــــ کام ــــ کوئی کام۔'' (مسیح وقت)

ے نیند سے نکلو/ چلو بیچ جواں خوابوں کے/ بانجھ یادوں میں کہیں دفنا دیں/ کوئی اگتا ہے نہ پھلتا ہے یہاں/ صرف سائے ہیں/ گھنے جنگل ہیں..... (چلو یوں ہی سہی)

(۴) دھند میں لہراتا شعلہ (حسن فرخ)۔ تلخی حالات تبسم کی جگہ لی ہے۔ مخاطب چاہے ہم نشین ہو یا چاہے سنگ و نخل ہوں، شاعر بالواسطہ اپنے آپ سے محو کلام ہے۔ ان کے یہاں شعری حسیت، انسان دوستی اور بغاوت پسندی نظر آتی ہے۔ خیالات تشکیک زدہ انسان کے ہیں جبکہ انسانیت پرستی کسی نظریاتی یا مذہبی کمٹ مٹ کی دین نہیں بلکہ حیاتی حسیت سے متعلق ہے۔

(۵) خاموش سی چیخ (سلیمان اریب)۔ انسانی عارف جو ہر کردار میں خود کو پوشیدہ کرتا ہے پھر سوچتا ہے۔ موت کو ابدیت کا علامیہ مانتا ہے۔ اپنی کہانی نہیں بلکہ اپنے کرداروں کی کہانی کہتے ہیں جو اذیت پسند بھی ہیں اور اذیت کے خلاف بھی۔ ان کے یہاں انسانی درد کا اظہار ملتا ہے۔ ان کی نظمیں نثری اور پر مواد ہیں مگر غزلیں اسی قدر غنائیہ۔ نمونۂ کلام:

ے کس چہرے سے کام ہے تم کو/ کن آنکھوں سے بات کرو گے/ تم جو چہرہ دیکھ رہے ہو/
اس میں ہیں کتنے ہی چہرے/ جن کو لگائے میں پھرتا ہوں/ تم کس سے ملنا چاہو گے؟

(تم کس سے ملنے آئے ہو۔)

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ہزاروں خضر مرے ساتھ ہیں اندھیرے میں
بھٹک رہا ہوں کوئی روشنی تو دے مجھ کو

'تجزیاتی مطالعے' کے تحت اسلم عمادی نے ن م راشد کی ایک نظم، عزیز قیسی کی نظم 'نئے لوگ' اور زیب غوری کی ایک غزل کا تجزیہ کیا ہے جبکہ جائزہ کے تحت انہوں نے حیدرآباد میں اردو شاعری ۱۹۶۰ء تا ۱۹۷۱ء پر طائرانہ نظر ڈالی ہے۔ اس کارواں میں جو شاعر شامل ہیں ان کے اسمائے گرامی یوں ہیں۔ مخدوم محی الدین، خورشید احمد جامی، سلیمان اریب، عزیز قیسی، شاز تمکنت، راشد آذر، وقار خلیل، تاج مہجور، انور معظم، مغنی تبسم، کنول پرشاد کنول، حکیم یوسف حسین خان، اختر حسن، اقبال متین، رؤف خلش، صلاح الدین نیر، مسعود عابد، حسن فرخ، اکمل حیدرآبادی، مصحف اقبال توصیفی، شفیق فاطمہ شعریٰ، غیاث متین، علی الدین نوید، رحمٰن جامی، سلیمان اطہر جاوید، تقی علی خاں ثاقب، قطب سرشار، غیاث صدیقی، رؤف خیر، علی ظہیر اور باذل عباسی۔ چند منتخب اشعار پیش خدمت ہیں۔

ے یہ شہر اپنا عجب شہر ہے، کہ راتوں میں/ سڑک پہ تو چلے سرگوشیاں سی کرتا ہے/ بلا کے زخم دکھا ہے/..... / راز دل کی طرح/ دریچے بند، گلی چپ نڈھال دیواریں/ کواڑ مہر بلب/ گھروں میں میتیں ٹھہری ہوئی ہیں برسوں سے/ کرایہ پر.....!! (اپنا شہر۔ مخدوم محی الدین)

ے میں جیتا ہوں اس مٹی پر/ جس سے گھر بنتے نہیں/ جس سے قبریں بنتی ہیں/ جس کا ذرہ ذرہ اوروں کا ہے/ ان کا جس میں ''میں'' ہوں جو مجھ میں ہیں۔ (میں۔ عزیز قیسی)

ے وقت بھی اب تیری چوکھٹ پہ پہنچ کر اکثر
اپنے کھوئے ہوئے لمحوں کو صدا دیتا ہے
(اختر حسین)

ے میں نے ہر غم کو جلا بخشی ہے/ دل گیتی کو دھڑکنے کی ادا بخشی ہے/ اک کلی مجھ سے مگر پوچھتی ہے/ تم میں پہلی سی وہ معصومیت اب کیوں نہ رہی؟ (سوال۔ حسن فرخ)

ے ہر صبح میں پتھر کی طرح سخت بنا ہوں
ہر شام میں شیشے کی طرح ٹوٹ گیا ہوں
(علی الدین نوید)

ے چلا ہوں آج بھی صحرا کی دھوپ میں تنہا
یہ حال ہے کہ تعاقب میں کوئی سایہ نہیں
(نقی علی خاں ثاقب)

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ہم اپنے قتل کا اب کس سے خوں بہا چاہیں ہر آئینے میں تو قاتل ہمیں دکھائی دیے

(رؤف خیر)

اس کے علاوہ مصنف نے 'تعارف' کے تحت چار مضامین، 'یاد' کے تحت دو مضامین اور 'ادبی تبصرے' کے تحت گیارہ تبصرے رقم کیے ہیں جن میں علی سردار جعفری اور خلیل الرحمٰن اعظمی پر لکھے گئے مضامین قابل ذکر ہیں اور تبصروں میں حرمت الاکرام کی 'شہر' اور جگن ناتھ آزاد کی کتاب 'اقبال کے مغربی مفکرین' پر لکھے گئے تبصرے کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ جدیدیت پسند ہونے کے باوجود عمادی کوتاہ نظر نہیں ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں ''ترقی پسند تحریک کی سب سے بڑی قوت مستقبل سے امید رہی ہے۔ مصنف کو ایقان کامل ہے کہ آنے والا کل خوش آئند ہے۔ جس میں آج کی کلفتوں اور اذیتوں کے داغ دھل جائیں گے گویا اس شب تار کی صبح روشن اور تازہ ہوگی۔''

بقول عمادی وزیر آغا کی تصنیف 'اردو شاعری کا مزاج' جدید شاعری کو سمجھنے کے لیے کلیدی حیثیت رکھتی ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ زیر نظر کتاب وزیر آغا کے خیالات کو توسیع کا درجہ رکھتی ہے اور نئی شاعری کو سمجھنے کے لیے کافی مددگار ثابت ہوسکتی ہے۔ اسلم عمادی نے بغیر کلیشے کا استعمال کیے اپنے خیالات کو بے لاگ ولپٹ صفحہ قرطاس پر اتارا ہے اور اس کوشش میں وہ پوری طرح کامیاب ہو چکے ہیں۔

❖ ❖ ❖

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

شعورادب

ڈاکٹر انورظہیر انصاری

'ساحرلدھیانوی۔حیات اور کارنامے' کے بعد شعورادب ڈاکٹر انورظہیر انصاری کی دوسری تصنیف ہے جو ان کی تحقیقی وتنقیدی بصیرت کی آئینہ دار ہے۔ تحقیق وتنقید کے میدان میں جس محنت، لگن، سنجیدگی اور دقیقہ شناسی کی ضرورت ہوتی ہے وہ انورظہیر کی شخصیت میں موجود ہے۔اس کا اندازہ کتابیات اور حوالہ جات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ترقی پسند تحریک سے گہرا رشتہ ہونے کے باعث موصوف نے جوش، مجاز، فیض، ساحر اور مجروح جیسے شاعروں پر سیر حاصل اور مبسوط مضامین قلمبند کیے ہیں۔تفحص وتجزیے کے فن میں انہیں یدطولیٰ حاصل ہے کیونکہ وہ اپنی بات کو پوری دلیل وثبوت کے ساتھ قاری کے دل ودماغ میں اتارتے ہیں۔

کتاب کا پہلا مضمون 'مجروحؔ سلطان پوری۔غزل کے کلاسیکی لہجے کا البیلا شاعر' ہے جس میں تنقید نگار نے مجروحؔ کی رومانی حقیقت پسندی، ترقی پسندی، فلسفیانہ انداز نظر، سیاسی شعور، اعلیٰ اقدار اور رجائیت کو اجاگر کیا ہے۔مجروحؔ نے زمانے کے فیشن کے خلاف غزل کو نظم پر ترجیح دی۔ان کی شاعری میں غنائیت، تغزل، نادر استعارات اور انفرادی انداز بیاں ملتا ہے۔بقول ڈاکٹر انصاری ''مجروحؔ کے یہاں شاعری موضوعات کا انتخاب نہیں بلکہ زندگی کے اظہار کا نام ہے۔'' چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ناشر:مصنف،ایم ۴، ادھیاپک کُٹیر، پرتاپ گنج وڑودرہ، گجرات۳۹۰۰۰۲ سن اشاعت:۲۰۰۷ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ے میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

ے ستونِ دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

ے دیکھ زنداں سے پرے رنگ چمن جوشِ بہار رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

'ساحر لدھیانوی۔ شاعر آشفتہ مزاج' میں ناقد فرماتے ہیں کہ عشق ساحر کی شاعری کا بنیادی پہلو ہے۔ ڈاکٹر انور ظہیر نے ساحر کی شاعری میں رومانیت، غنائیت، موسیقیت، انقلابی آہنگ، حقیقت پسندی، دل شکستگی اور نشاط و کرب کے متوازن امتزاج، احساس عدم تحفظ اور تشکیک اور اسلوب کے تنوع اور رچاؤ کی نشاندہی کی ہے۔ ساحر کی شاعری نہ صرف ذات بلکہ ملکی اور عالمی مسائل کا بھی احاطہ کرتی ہے۔

ے دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

ے مانا کہ اس زمیں کو نہ گل زار کر سکے کچھ خار کم تو کر گئے گزرے جدھر سے ہم

ے ہر قدم مرحلۂ دار وصلیب آج بھی ہے جو کبھی تھا وہی انساں کا نصیب آج بھی ہے

تم ہی تجویز صلح لاتے ہو/تم ہی سامان جنگ بانٹتے ہو/تم ہی کرتے ہو قتل کا ماتم/تم ہی تیر و تفنگ بانٹتے ہو۔ (نظم بڑی طاقتیں)

[مذکورہ نظم آج بھی اتنی ہی معنویت رکھتی ہے جتنی ساحر کے دور میں]

ڈاکٹر انصاری نے فیض کی شاعری کا مختصراً تجزیہ اپنے مضمون 'فیض احمد فیض۔ امیدوں اور آرزوؤں کا شاعر' میں کیا ہے۔ بقول ناقد فیض کی ابتدائی شاعری میں، جس کو پروفیسر محمد حسن نے 'ربودگی کا دور' کہا ہے، میں رومانیت، حسن پرستی، ہجر و وصال، درد و کرب اور دل شکستگی کا اظہار کیا ہے۔ آگے جا کر طبقاتی تضاد، سماجی ناہمواری، ترقی پسند تحریک سے وابستگی اور سیاسی شعور کی پختگی فیض کی شاعری کو نیا انقلابی موڑ عطا کرتی ہے حالانکہ پھر بھی وہ نعرہ بازی اور پروپیگنڈ سے احتراز کرتے ہیں۔ بقول انور ظہیر انصاری ''چنانچہ فیض کی شاعری حیات و حالات کے گوناگوں مسائل کی عکاس ہونے کے ساتھ اجتماعی کرب کی ہی نہیں انفرادی اضطراب کی بھی آئینہ دار بن گئی ہے لیکن کرب و اضطراب کی یہ ٹیسیں زندگی سے بے نیاز یا مایوس نہیں کرتیں بلکہ رجائیت کے احساس کے ساتھ مستقبل کے امکانات کی طرف رہنمائی بھی کرتی ہے۔''

ے اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

ے مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

ے زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

'مجاز لکھنوی۔ اندھیری رات کا تنہا مسافر' میں یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ اُردو شاعری کے کیٹس، مجاز کی ابتدائی شاعری عشقیہ، جذباتی اور انبساطی شاعری تھی جبکہ دھیرے دھیرے یہ ترقی پسندی انقلاب، آزادی اور انسان دوستی کی طرف مائل ہوگئی۔ مجاز کا اسلوب رواں، نغمہ بار، دلکش اور مترنم ہے اور وہ علامتوں واستعاروں کا برمحل استعمال کرتے ہیں۔ بقول فیض ''مجاز کی شاعری شمشیر، ساز اور جام سے عبارت ہے۔''

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن — تو اس آنچل سے اک پرچم بنالیتی تو اچھا تھا

تو انقلاب کی آمد کا انتظار نہ کر — جو ہوسکے تو ابھی انقلاب پیدا کر

اب یہ ارماں کہ بدل جائے جہاں کا دستور — ایک اک آنکھ میں ہو عیش وفراغت کا سرور

مصنف نے مجاز لکھنوی کی نظم آوارہ کا بھی الگ سے تجزیہ کیا ہے جس میں ذاتی کرب اور اجتماعی کرب کی ایک ساتھ عکاسی کی گئی ہے۔ اس نظم میں انسان کی بے بسی ایک طرف اور عزم محکم اور انقلاب وبغاوت کی خواہش دوسری طرف شاعر کو الجھن میں ڈالے ہوئے ہے۔

'ولی اورنگ آبادی/ دکنی/ گجراتی، بلبل باغ وفا، شاعر ہجر ووصال' میں مضمون نگار تحریر کرتے ہیں کہ ولی کی غزلوں کا اثر نہ صرف شمالی ہند بلکہ گجری ودکنی شعروادب پر بھی پڑا۔ ان کی شاعری میں خالص ہندوستانی پن ہے جس کا باعث بقول مضمون نگار یہ ہے کہ ''ولی کی غزلوں میں سراپا نگاری اور محبوب کی تصویر کشی کا جو عنصر غالب ہے وہ مثنوی کی خارجیت اور ہندی گیتوں کی داخلیت کا پرتو ہے۔'' مضمون نگار مزید لکھتے ہیں کہ ''ولی کا معشوق زندہ متحرک اور نسائی بانکپن کے ساتھ ابھرا ہے جبکہ شمالی ہند کے شعرا کے یہاں عام طور سے خیالی اور تصوراتی رہا۔

عشق میں جل جل کر سب تن کوں کیا کاجل — یہ روشنی افزا ہے انکھیاں کوں لگاتی جا

مفلسی سب بہار کھوتی ہے — مرد کا اعتبار کھوتی ہے

جسے عشق کا تیر کاری لگے — اُسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے

مضمون 'مولانا ابوالکلام آزاد کا صحافتی سفر' آزاد کی صحافتی زندگی پر مختصر طور پر روشنی ڈالتا ہے۔ یہ سفر ۱۹۰۱ء باضابطہ طور پر میں المصباح سے شروع ہوتا ہے حالانکہ اس سے پہلے وہ ۱۸۹۹ء میں ماہنامہ گلدستہ نیرنگ عالم، جس میں صرف شعری کلام چھپتا تھا، کے ساتھ وابستہ رہے۔ مولانا آزاد نے ابتدا ہی سے اپنی نثر نگاری کے جوہر دکھائے۔ ان کا دوسرا پڑاؤ تھا 'ہفت روزہ احسن الاخبار' جس میں تعزیہ داری کی بدعت پر

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

لکھے گئے مضمون نے ہنگامہ برپا کیا تھا۔ اس کے بعد وہ کچھ دیر کے لیے 'ایڈورڈ گزٹ شاہجہاں پور' کے مدیر گئے مگر اب مولانا کے مضامین معتبر اخباروں میں چھپنے لگے۔ ۱۹۰۳ء میں 'لسان الصدق' کا اجرا کیا جس کے ''مضامین کا معیار'' بقول مالک رام 'معتبر اور بلند تھا''۔ ۱۹۰۵ء میں علامہ شبلی نعمانی کے 'ماہنامہ الندوہ' کے معاون مدیر بنے اور پھر 'دو روزہ وکیل' کے ساتھ جڑ گئے۔ بیچ میں 'ہفتہ وار اخبار دار السلطنت' سے بھی مختصر وقفے کے لیے وابستہ رہے۔ مولانا آزاد نہ صرف مسلم قوم کے ذہنی جمود کو توڑنے اور انہیں راہ فلاح پر بے خوف وخطر رواں ہونے کی ترغیب دے رہے تھے بلکہ ان کو روایت پسندی، توہم پرستی اور نفس پرستی سے دور لے جا کر ترقی پسند خیالات اور عقلیت پسندی کی طرف گامزن کرنے کے کوشاں رہے۔ مولانا مسلمانوں کو اپنے وطن کے تئیں فرائض کا بھی احساس دیتے رہے۔ اس دوران میں ان کے تعلقات مختلف انقلابی گروپوں سے بھی بڑھ چکے تھے مگر انہوں نے مہاتما گاندھی کے دکھائے ہوئے راستے کو کبھی تک نہیں کیا اور کئی بار جیل بھی چلے گئے۔ اس کوشش میں مولانا آزاد کے اخبار 'الہلال' کا بھی بہت بڑا ہاتھ رہا۔

ڈاکٹر انور ظہیر نے 'فضا ابن فیضی کی شعری وسعتیں۔ سفینۂ زرگل کی روشنی میں، میں موصوف کی شاعری کے مختلف العباد اور فنی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے اور یہ انکشاف کیا ہے کہ کبھی کبھی تنقید نگار ہنر مند شاعروں کو نظر انداز کر کے اردو زبان کے ساتھ ظلم کرتے ہیں۔ فضا ابن فیضی کی غزلیہ شاعری میں نئی رمزیت، نیا آہنگ، مطالعے کی عمق، اجتماعی زندگی کی محرومیاں، تہذیبی اقدار کا ٹکراو، اور انسانی زندگی کا بکھراو نمایاں طور پر نظر آرہا ہے۔ علامتوں اور استعاروں کا بھی خاصا دخل ہے مگر وہ شعر کو مہمل نہیں بننے دیتے۔

ہزار ہم سفراں پھر بھی زندگی تنہا — یہ رہ گزر ہے کچھ ایسی کہ رہ گزر نہ لگے

میں کوئی برف نہیں ہوں کہ پگھل جاؤں گا — واسطہ وقت کے سورج کو پڑا ہے مجھ سے

ہنستے لبوں، دمکتی جبینوں کے درمیاں — ہر شخص ایک درد کا صحرا دکھائی دے

'دہلی اور فورٹ ولیم کالج۔ اجمالی جائزہ، تقابلی مطالعہ' میں مضمون نگار نے فورٹ ولیم کالج اور دہلی کالج کا موازنہ کیا ہے اور یہ باور کرنے کی کوشش کی ہے کہ فورٹ ولیم کالج کو حکومت کی سرپرستی حاصل تھی مگر اس ادارے کا مقصد اردو کے فروغ کے بجائے ہندوستانی کو رابطے کی زبان بنانا تھا تاکہ انگریز آسانی سے ہند پر حکومت کر سکیں۔ اُردو کی ترقی جو کچھ بھی ہوئی وہ ضمنی (Bye Product) تھی جبکہ نجی کوششوں سے بنا دلی کالج اردو کی ترقی کے لیے مفید ثابت ہوا اور تہذیبی تحریک کا داعی بنا۔ اس کالج کی وجہ سے آساں، سلیس اور رواں اُردو کی نیو پڑی اور اُردو میں مضمون نگاری اور صحافت مقبول ہوئی۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

'ارسطو کی تنقیدی فکر میں ہیتی عناصر' میں شاعری کی مبادیات پر بحث کی گئی ہے اور افلاطون واس کے شاگرد ارسطو کے فکر ونظریے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ چنانچہ ابتدا میں شاعری اور ڈرامہ میں زیادہ فرق نہیں کیا جاتا تھا اس لیے قدیم یونان میں المیہ کو طربیہ اور رزمیہ پر فوقیت حاصل ہوئی۔ المیہ کی خصوصیات، تزکیۂ نفس (کتھارسس) اور المیہ کی جزئیات کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔

'موسیقار اعظم نوشاد کی فنی وفکری جہتیں' عام روش سے ہٹ کر ہے۔ اس مضمون میں نوشاد کی زندگی کا سفر، تلاش معاش کی صعوبتیں اور آخر کار اس کی کامرانی کا ذکر ملتا ہے۔ یہ نوشاد ہی تھا جس نے لوک گیت، علاقائی گیت اور شاستریہ سنگیت کو اپنی موسیقی میں سمویا اور فلمی موسیقی میں ایک نیا انداز پیدا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی دھنوں پر سامعین سر دھنتے ہیں۔ نوشاد کے بہت سارے گیت آج بھی اتنے ہی مقبول ہیں جتنے اس زمانے میں تھے۔ نوشاد نے نہ صرف فلموں کو اپنی موسیقی سے سنوارا بلکہ فلمی دنیا کو کئی ایسے چہرے دیے جن پر فلم انڈسٹری ناز کرتی ہے۔ مثلاً ثریا، محمد رفیع، لتا منگیشکر، اوما دیوی، مہندر کپور وغیرہ۔ بقول مضمون نگار ''نوشاد رنگ وآہنگ کے دلدادہ تھے۔''

مذکورہ کتاب میں چند ایک نظموں کے تجزیے بھی شامل ہیں۔ 'آوارہ' کا ذکر تو پہلے ہی آچکا ہے۔ اس کے علاوہ جوش ملیح آبادی کی نظم 'بدلی کا چاند' اور اختر الایمان کی نظم 'ایک لڑکا' کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔ بقول تجزیہ نگار ''جوش نے انسان کی تڑپتی فطرت کو کاوش نور وظلمت اور قید وآزادی کے صفات سے مزین کر کے پیش کیا ہے..... یہ نظم اس اعتبار سے بھی منفرد ہے کہ یہ محض جوش کے نظریۂ انسان اور فلسفۂ حیات کو ہی اُجاگر نہیں کرتی بلکہ مشاہدے کی قوت، تجربے کی وسعت اور جذبے کے خلوص کو بھی معتبر کرتی ہے۔' اختر الایمان کی نظم 'ایک لڑکا' کا لڑکا علامیہ ہے اس آزاد منش، جرأت مند اور باغی ضمیر کا جو معاشرے کی بدعنوانیوں کا خاتمہ کرنا چاہتا ہے مگر نفس کے تقاضے، حالات کی مجبوریاں اور پیٹ کی آگ اُسے رام کرتی ہے اور وہ سُدھے ہوئے جانور کی طرح زندگی کے سرکس میں شامل ہو جاتا ہے۔

'شعور ادب' پر مجموعی نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر انور ظہیر انصاری نے اپنے عمیق مطالعے کے باعث سمندر سے گہر نکال کر لائے ہیں۔ مضامین کا انتخاب بھی عمدہ ہے۔ ان کے یہاں معروضیت اور رجائیت صاف نظر آتی ہے جس کی وجہ سے مضامین خطیبانہ کے بجائے منطقی اور معقول لگتے ہیں۔ ڈاکٹر انور ظہیر انصاری ترقی پسند تنقیدی اسکول، جس کے رکن احتشام حسین، آل احمد سرور اور ڈاکٹر محمد حسن ایسے نقاد رہے ہیں، کی معاصر اور معتبر آواز ہیں۔

❖❖

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

زرِنقد

ـــــ محمد شاهد پٹھان

سولہ مضامین پر مشتمل 'زرنقد' تنقیدی بصیرت اور ادراک کی دستاویز ہے۔ محمد شاہد پٹھان نے جہاں ایک طرف اردو کے نامور نقادوں کی کاوشوں کا تجزیہ کیا ہے وہیں دوسری طرف انہوں نے ہم عصر شاعروں کے کلام پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ مولانا حالی، رشید احمد صدیقی، امداد امام اثر، عبدالرحمٰن بجنوری، مولوی عبدالحق نہ صرف تنقید نگار ہیں بلکہ اپنے آپ میں مکتب فکر بھی ہیں۔ اسی طرح مخمور سعیدی، اکبر جے پوری، شباب للت، علقمہ شبلی، عقیل شاداب، مضطر صدیقی اور لکشمی نارائن فارغ اردو شاعری میں اپنے لیے ایک مقام بنانے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے شاہد پٹھان نے بے لاگ ولپٹ اپنے تاثرات پیش کیے ہیں۔ انہوں نے ادیبوں کی مدح سرائی بھی کی ہے اور تنقید بھی، دیگر محققوں اور نقادوں کے حوالے بھی دیے ہیں اور اپنے خیالات بھی قلمبند کیے ہیں۔

محمد شاہد پٹھان حالؔی کو اولین نظر ساز نقاد مانتے ہیں اور 'مقدمہ شعر و شاعری' کو اردو تنقید کی بوطیقا گردانتے ہیں۔ بقول حالؔی شاعری اور سوسائٹی میں گہرا رشتہ ہے۔ بری شاعری سے قومی اخلاق کو گھن لگ جاتا ہے اور وزن اور قافیہ/ردیف کی ناگزیریت مشرقی شاعری کو کم مایہ بناتی ہے۔ حالؔی کی شاعری پر مغربی مفکروں افلاطون، کولرج اور ملٹن کے تاثرات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ پٹھان حالی کی نظریاتی تنقید کو دو مثلثوں

ناشر: مصنف، ۲۶-۱۶۲۵، ہادی منزل، کامیلا اسٹریٹ، جے پور-۳۰۲۰۰۴ سن اشاعت: مارچ ۲۰۰۹ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

کی دین سمجھتے ہیں: (۱) تخیل، مطالعہ کائنات اور تفحص الفاظ (۲) سادگی، اصلیت اور جوش ,Passion')
sensuous, simple'-Miltion) الطاف حسین حالی لکھنؤ سکول کی لفظی بازیگری اور بیان وبدیع کی
صناعی کو شاعری ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ البتہ 'لفظ ومعنی' کے سلسلے میں حالی کبھی لفظ کو اور کبھی معنی کو فوقیت
دیتے ہیں۔ اس میں کوئی دورائے نہیں کہ حالی خیال وفکر کے تنوع اور بلندی کے خواہاں ہیں۔ اور الفاظ
واسلوب کی اہمیت تسلیم کرنے کے باوجود شاعر کو مطالعہ کائنات اور تخیل کے تخلیقی تفاعل سے استفادہ
کرنے پر زور دیتے ہیں۔

رشید احمد صدیقی (طنزیات ومضحکات، جدید غزل، غالب کی شخصیت اور شاعری، اقبال کی شخصیت
اور شاعری، رشید احمد صدیقی کے مضامین وغیرہ) نے رومانونیت، ترقی پسند اور جدیدیت کی تحریکوں کو دیکھا
اور پرکھا ہے۔ ''وہ تخلیقی عمل کو ذمے دارانہ کام اور تخلیق کار کو زندگی، سماج اور اس کی اعلیٰ اقدار وافکار کا حامل
اور محافظ'' گردانتے ہیں۔ وہ تخلیق اور تنقید دونوں کو یکساں اہمیت دیتے ہیں اور تعمیری وموقر ادب کی تخلیق
میں فنکار کے تنقیدی شعور کے فیضان کے قائل ہیں اس ضمن میں رشید احمد صدیقی طنزیہ انداز میں یوں سوال
اٹھاتے ہیں کہ ''اردو تنقید کے جتنے نظریے کتابوں اور نقاد بازاروں میں ہیں اردو میں اتنے شاعر اور لکھنے
والے ہیں یا نہیں۔'' وہ شاعر اور ادیب پر نقاد کی بہت زیادہ گرفت کے منفی اثرات سے آگاہ کرتے ہیں
انہوں نے ترقی پسندی اور جدیدیت کو بھی ہدفِ ملامت بنایا ہے۔ قدامت پسند یا تاثراتی ناقد کا لیبل لگانے
کے بجائے محمد شاہد پٹھان، رشید احمد صدیقی کی مشرقی اقدار، مذہب اور اخلاقیات کا علمبردار مانتے ہیں۔
بقول رشید احمد صدیقی ''غزل کو میں اردو شاعری کی آبرو سمجھتا ہوں۔ ہماری تہذیب غزل میں اور غزل
ہماری تہذیب میں ڈھلی ہے۔'' غزل تہذیب وثقافت کا مظہر ہے اس لیے انہوں نے غزلوں کو اردو شاعری
کا معیار ووقار قرار دیا ہے جبکہ کلیم الدین ایجاز بیانی کو کاہلی سے تعبیر دیتے ہیں۔

غالبؔ رشید احمد صدیقی کے پسندیدہ شاعر ہیں جبکہ اقبالؔ اور فانیؔ بدایونی جن کو وہ یاسیت کا امام کہتے
ہیں پر بھی انہوں نے اظہار خیال کیا ہے۔ بقول صدیقی ''غالبؔ، اقبال اور ٹیگور ہندوستانی تہذیب وثقافت
کے ترجمان ہیں اقبالؔ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ''اقبال نے اپنی غزلوں میں ہم کو یہ محسوس کرایا کہ عشق
ومحبت دل ہی کا ماجرا نہیں ذہن کا بھی ہے..... اقبال اپنے سامنے ایک مقصد رکھتے ہیں۔'' چنانچہ رشید احمد صدیقی
طنز ومزاح نگار اور انشا پرداز بھی ہیں انہوں نے سودا، اکبر الٰہ آبادی، ملا رموزی، شوکت تھانوی، مرزا عظیم
بیگ، پطرس اور مرزا فرحت اللہ بیگ پر بھی خامہ فرسائی کی ہے۔ ''وہ کسی نام نہاد دبستان نقد سے وابستہ نہیں

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

رہے البتہ حالی اور شبلی کے انتقادی اثرات ان کے یہاں ہر دور میں قائم رہے ہیں۔ حالانکہ ان کا اپنا انفرادی اسلوب انتقاد بھی ہے جس کو پروفیسر عبدالحق 'ثقافتی تنقید' سے موسوم کرتے ہیں۔

تیسرے مضمون کا عنوان ہے 'امداد امام اثر کا اسلوب نقد'۔ امداد امام اثر تقابلی تنقید کے بانی ہیں (کاشف الحقائق)۔ انہیں اردو، فارسی، عربی، انگریزی، ہندی اور سنسکرت کا علم تھا اس لیے مصر، یونان، روم، اٹلی اور عرب کی شاعری کا مقابلہ اردو اور فارسی شاعری سے کرتے رہے۔ بقول مصنف وہ شاعری کو وحی والہام سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں: ''ہر ملک میں شعرا موردِ الہام ہوا کرتے ہیں۔'' شاعری کی تعریف، تحسین اور ماہیت پر اثر نے درحقیت حالی اور شبلی سے زیادہ واضح اور جامع روشنی ڈالی ہے۔ ان کے مطابق شاعری، موسیقی و مصوری میں باہمی مجانست اور مماثلت پائی جاتی ہے۔ ان کے باہمی روابط اور ان کے فنی مضمرات پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ اثر نے فطری شاعری اور غیر فطری شاعری، عالم خارجی اور عالم داخلی، خارجیت اور داخلیت کی تخصیص کو واضح کیا ہے۔ بقول شاہد پٹھان، ''ٹھیک اسی طرح اثر کے نزدیک غیر فطری مبالغہ پردازی بھی مذموم ہے۔ تقریب سلطانی نے اسے پروان چڑھایا اور اس مرض میں مبتلا ہو کر کئی عالی خیال شعرا برباد ہو گئے۔'' اثر معنی کو اولیت دیتے ہیں۔ اس بارے میں فرماتے ہیں۔ ''ایک عبارت دوسری عبارت سے محض اس لیے فوقیت حاصل کر لیتی ہے کہ وہ معنی کے اعتبار سے زیادہ جاندار ہوتی ہے۔ نثری مخاطبے (Prose poetry) کو بھی وہ شاعری مانتے ہیں بشرطیکہ اس میں درد، تاثیر اور فطرت کی تبعیت کی پابندی کی گئی ہو۔'' اس طرح وہ بلا قافیہ اور ردیف نثری اور آزاد نظم کی ترقی کے موید اور مبلغ تھے اور جدت آشنا و ترقی پسند طبیعت اور ذہنیت کے ترجمان بھی۔ شاہد پٹھان ان کے بارے میں مزید فرماتے ہیں کہ ''اثر مغرب سے استفادہ کرنے کے مخالف نہیں ہیں۔ وہ دراصل اس احساس کم تری اور گمراہی کیخلاف ہیں جو انیسویں صدی کے آخر تک عام ہو چکی تھی اور اس سلسلے میں بتدریج اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔'' اثر غزل میں اخلاقی مضامین اور پند و موعظت کے بیان کے خلاف ہیں کہ یہ ایک داخلی صنف ہے۔ اور اس میں ناصحانہ مضامین کی گنجائش نہیں ہے۔ اثر میر تقی میر کو داخلی شاعر اور غزل کا عظیم فنکار مانتے ہیں مگر ان کے تمام تر کلام کو قابل قدر نہیں مانتے۔ اس لیے اس میں انتخاب کو ضرورت سمجھتے ہیں۔ بقول اثر غالب میر سے متاثر ہیں مگر ویسی سادگی ان میں نہیں ہے جیسی میر میں ہے۔ غالب کی پیچیدگی اور استعاراتی انداز و اسلوب کو وہ مستحسن نہیں سمجھتے۔ شاہد پٹھان کا خیال ہے کہ اثر کا غزل کے سلسلے میں موضوعاتی حد بندی کرنے کا خیال صحیح نہیں ہے۔ ان کے یہاں زیادہ تر تاثراتی اور جمالیاتی میلان ملتا ہے۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

پر بھی روشنی پڑتی ہے۔'' مولوی عبدالحق کو اردو و فارسی لٹریچر اور شاعری پر مکمل گرفت ہے۔ خصوصاً کلاسیکی لٹریچر پر۔ مغربی لٹریچر سے بھی وہ بخوبی واقف ہیں۔ فکری سطح پر وہ حالی سے اور اسلوب و بیان میں حالی و شبلی دونوں سے متاثر ہیں جبکہ ایلیٹ کی طرح جدیدیت اور جدت میں خیال و اسلوب کی سطح پر روایت کے تاب کار و صالح عناصر کی شمولیت کو ناگریز سمجھتے ہیں۔ ان کے اندازِ فکر میں توازن ہے، خیال و اسلوب میں تازہ کاری کے قائل ہیں مگر بے راہ روی اور بھونڈے پن کو معیوب سمجھتے ہیں۔ وہ ادب کو سماجی و قومی ذوق و ذہن کی تہذیب و ترقی کا جمال آفریں ذریعہ تصور کرتے ہیں۔ 'نیا ادب میری نظر میں' میں انہوں نے ادب کے ارتقاء کی نشاندہی بھی کی ہے۔ عبدالحق کی طرز تنقید کو اسلوبیاتی، ہیئتی اور تحقیقی تنقید کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ باغ و بہار کا مقدمہ تحقیقی تنقید کا بہترین نمونہ ہے۔ میر تقی میرؔ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ''میرؔ کی وضع داری نے کمال کی لاج رکھ لی۔ انہوں نے شاعری کو ذریعہ عزت یا وسیلہ معاش نہیں بنایا۔ مولوی عبدالحق دبستان حالیؔ کے علم بردار ہیں اور ان کے خیال میں ''ادبی اور تنقیدی افکار و اسلوب میں شعر و ادب کی معنویت و مقصدیت کے ساتھ فن کے جمال آفرین عناصر کو بھی بڑی حیثیت حاصل ہے۔''

پروفیسر حامد اللہ افسر میرٹھی کے حوالے سے مضمون 'تنقیدی اصول اور نظریہ۔ ایک مطالعہ' بھی زیر نظر کتاب میں شامل ہے۔ افسر میرٹھی کی تنقید نظری و عملی تنقید کا مظہر ہے۔ وہ معروضی اور سائنسی طریق نقد کے قائل ہیں۔ پروفیسر صاحب کی نظر مغربی ادبی و انتقادی افکار و نظریات اور قدیم یونانی و سنسکرت کے اصول تنقید دونوں پر ہے۔ اس کتاب میں فن تنقید کی غرض و غایت، اصول تنقید اور تاریخ ارتقائے تنقید، اسلوب میں توازن و تہذیب اور ادب میں بصیرت، افادیت، جمالیت و مسرت پر بحث کی گئی ہے۔ وہ ادبیات کے تین اہم خصوصیات گردانتے ہیں۔ مواد، صورت، تفریح طبع علاوہ ازیں وہ ارنلڈ کے قول کہ ''شاعری تنقید حیات ہے'' پر لبیک کہتے ہیں۔ مزید فرماتے ہیں۔ ''اس کے علاوہ تنقیدی ادب بجائے خود کسی طرح تخلیقی ادب سے کم دلچسپ نہیں ہے۔'' بقول افسر میرٹھی، ''شاعری کا اصل مقصد نہ جذبات کا برانگیختہ کرنا ہے اور نہ ذہنی مسرت بہم پہنچانا، بلکہ اس کا مقصد ان دونوں باتوں سے بلند تر ہے۔ وہ انسان کو زندگی سے ہم ساز کر دیتی ہے، وہ زندگی کا مفہوم سمجھا دیتی ہے۔ اس کی گتھیاں سلجھا دیتی ہے کہ کیوں کر زندگی بسر کرنا چاہیے۔ پروفیسر حامد اللہ افسر نے مختلف ادوار کی شاعری پر (خصوصاً میرؔ، سوداؔ اور دردؔ، غالبؔ اور مومنؔ، ذوقؔ اور حالیؔ کے حوالے سے) روشنی ڈالی ہے۔ غزل اور نظم کے علاوہ دوسرے اصناف مثلاً مثنوی اور قصیدہ پر بھی بحث کی ہے۔ ان کے خیال میں ''جو شاعری جلب منفعت اور طلب مال و منال کی غرض سے کی جائے وہ فطری

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

اکبر جے پوری شخصیت اور شاعری کے عنوان سے محمد شاہد پٹھان نے ان کی حیات اور فن پر سیر حاصل مضمون لکھا ہے۔ اکبر جے پوری کشمیری النسل تھے مگر جے پور میں زندگی کا بیشتر حصہ گذارا۔ وہ نہ صرف شاعر تھے بلکہ بہت اچھے آرگنائزر بھی تھے چنانچہ کشمیر میں اس میدان میں کافی فعال رہے۔ مگر انہوں نے زندگی میں کافی اتار چڑھاؤ دیکھے جس کے سبب آخر کار انہیں گوشہ نشینی اور تنہائی اختیار کرنی پڑی۔ انہیں زود گوئی اور فی البدیہہ شعر کہنے کا ملکہ حاصل تھا۔ ان کی غزل میں اصلاً تغزل کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ شاعری میں رومانیت پسندی، طنز و مزاح اور بزلہ سنجی نظر آتی ہے۔ بقول تنقید نگار ''اکبر جے پوری کے یہاں بھی آزادی ملک کے دوران ابھرنے والے سماجی مسائل و مصائب کا کسی قدر احساس موجود ہے۔'' اس کے باوجود ترقی پسندی سے غیر وابستہ رہے۔ ذاتی انقلاب کے سبب ان کی شاعری شکست ذات، اجنبیت، یاسیت، احساس تنہائی، یاس آمیز اور کرب انگیز کیفیت اور خوف کا احساس موجزن ہے۔ بقول پٹھان ''ان کا معاشقہ اپنے محبوب کے فراق دوام پر منتج ہوتا ہے..... اکبر کی شاعری ایک اعتبار سے ان کی زندگی کے نشیب و فراز، سرد و گرم، رنج و راحت اور کیف و کرب کی سرگذشت ہے لیکن اس میں اجتماعی احساسات و تجربات کا عکس و نقش بھی ہویدا ہے۔'' ان کا اسلوب سادہ، براہ راست مگر پرکار ہے۔ انہوں نے کلاسیکی علامات، استعارات اور تلازمات سخن سے بھی استفادہ کیا ہے، نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

ہر چیز تری راہ محبت میں لٹادی ۔۔۔ آرام وسکوں، قلب ونظر دین اور ایماں

ہر کلی سہمی ہوئی ہے آج کل ۔۔۔ باغباں آمادۂ تخریب ہے

آبلہ پا زندگی ہے آج کل ۔۔۔ دھوپ میں جھلسے ہوئے ہیں راستے

آنکھوں سے ایک نظر شاداب لے گیا ۔۔۔ اکبر خزاں نصیب بہاروں کا قافلہ

کل تک تھی دلوں میں جس کی خلش وہ خاربیاں آج بھی ہے ۔۔۔ ناداریِ مزدور آج بھی ہے، مجبوریِ انسان آج بھی ہے

تعمیر کے زریں خوابوں میں تخریب کا سامان آج بھی ہے ۔۔۔ لب پر ہیں محبت کے نغمے اور دل میں ہوس کے انگارے

میرے ہمسائے مجھے یاد کیا کرتے ہیں ۔۔۔ روز پتھر مرے آنگن میں گرا کرتے ہیں

حق کو ہم نے حق کہا ہے خنجروں کے درمیان ۔۔۔ کاروانِ فکر کا ہم رخ بدل سکتے نہیں

'ڈاکٹر شاب للت کے شعری امتیازات' کے تحت ڈاکٹر شاب للت (شعری مجموعے۔۱۲) پر سیر حاصل مضمون رقم کیا گیا ہے۔ موصوف کسی ادبی تحریک سے وابستہ نہیں رہے مگر ادب اور زندگی کے رشتے

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

کو ہمیشہ قائم رکھا۔ انہیں غزل اور نظم دونوں اصناف پر قدرت حاصل ہے۔ وہ حیات و کائنات کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کرتے ہیں۔ ان کے مثبت انداز فکر اور تعمیری تخلیق نے انہیں اعلیٰ مقام سے نوازا ہے۔ ان کے یہاں کلاسیکی غزل کی آگہی اور سوچ میں ترقی پسندی ملتی ہے۔ غزلیہ شاعری کے علاوہ انہوں نے نعتیہ کلام، رباعی اور قطعات بھی رقم کیے ہیں۔ ان کی شاعری عہد کے بدلتے ہوئے انسانی کردار، ٹوٹتے ہوئے رشتوں اور دم توڑتی ہوئی انسانی و اخلاقی اقدار کا اظہار ہے۔ مادی و مشینی معاشرے میں انسان کے بدلتے ہوئے مزاج اور کردار کے معیوب و منفی پہلو کو انہوں نے بڑی ہنرمندی سے پیش کیا ہے۔ چند اشعار:

- حق نوازی ہم نہ چھوڑیں گے شباب — آزمائش کی گھڑی آئی تو ہے
- جس نے الفت کی نہ ہو، فنکار ہو سکتا نہیں — آگ لگتی ہے کہیں تو دل میں اٹھتا ہے دھواں
- ہمارا سحرِ سخن یہی ہے، ہماری معراج فن یہی ہے — شعور انسان نکھار دینا، دلوں میں ذوق جمال رکھنا
- ہم نے سورج کی طرح جس کی پرستش کی تھی — وہ تو کم بخت اندھیروں کا سمندر نکلا
- مقتل وقت میں آج تیغ سیاست — حق نواؤں کا پھر امتحان لے رہی ہے
- مانگا تھا ہم نے دن وہ سیہ رات دے گیا — سورج ہمیں اندھیرے کی سوغات دے گیا
- کس نے گلشن سے انہیں حکم جلاوطنی دیا — آشیانوں سے بھلا بے دخل طائر کیوں ہوئے
- امیر و ہوگا تمہارے پاس کچھ اس کا جواب — آج ہم اپنے وطن میں ہی مہاجر کیوں ہوئے

(کشمیر کے حوالے سے)

- ہماری نسل بھی دیکھے گی وہ دور کہ جب — وطن سے ختم یہ دہشت کا سلسلہ ہوگا

'علقمہ شبلی کا آہنگ غزل' سے یہ واضح ہوتا ہے کہ علقمہ شبلی (چار شعری مجموعے) غزل کی کمیت پر نہیں بلکہ اس کی کیفیت اور معنویت پر توجہ دیتے ہیں۔ انہیں اختصار و ایجاز کا ادراک ہے۔ ان کی شاعری کے موضوعات تنہائی، خاندانوں کی تقسیم، ہم مزاج انسانوں کی قحط، مشینی عہد کی صارفانہ و تاجرانہ ذہنیت، سماج میں بڑھتی ہوئی مسابقت، خود پروری، رنجشیں، مصلحت اندیشی وغیرہ ہیں۔ شبلی نے ترقی پسندی اور جدیدیت کے رجحانات کے مثبت و صالح عناصر کو انگیز کیا ہے۔ چند اشعار:

- بیاں کرے وہ غریب اپنا کرب کیا جس کو — وطن میں بھی جسے رہ کر کبھی وطن نہ ملا
- جس کا ہر لفظ ہے خوں بار وہ نوحہ ہوں میں — جس میں گم درد کی صدیاں ہیں وہ لمحہ ہوں میں
- چشم دیوار سے جس کی نہ ٹپکتا ہو لہو — شہر میں ایک بھی گھر ایسا دکھاؤ لوگو

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ے اجنبی سی جب نظر آتی ہے اپنی ذات بھی
زندگی میں بارہا آتے ہیں ایسے ثانیے

ے یوں تو بن کر خدا لوگ ملتے رہے
کاش ملتا کوئی آدمی کی طرح

مندرجہ بالا مضامین کے علاوہ کتاب میں جو مضامین شامل ہیں ان کے عنوانات اس طرح ہیں:۔
تفہیم داغؔ کی ایک تازہ کوشش، مثنوی 'جہیز کی لعنت' کا تنقیدی جائزہ، عقیل شاداب' بے آب سمندر' میں، 'تحفۂ راجستھان' پر ایک طائرانہ نظر، مضطرؔ صدیقی کی غزلیہ شاعری اور تلمیذِ سیماب۔ لکشمی نارائن فارغ۔ طوالت کے سبب ان مضامین پر تاثرات لکھنے سے پرہیز کر رہا ہوں۔ البتہ ان شاعروں کے چند اشعار یہاں پر درج کر رہا ہوں تا کہ ان کی طرف بھی توجہ دلا سکوں۔

عقیل شاداب:

ے شردھا بن پتھر، پتھر ہی رہتا
ہر پتھر میں رام نہیں ہوتا جاناں

ے بکھر بکھر کر قسطوں میں جینا پڑتا ہے
نفس نفس پر لمحوں کے پہرے ہوتے ہیں

ے بلاوا رزق کا برتر ہے ہر تعلق سے
پرندے اپنا نشیمن بھی چھوڑ جاتے ہیں

مضطر صدیقی:

ے دنیا میں میرے بعد کوئی غم نہیں رہے
ہر غم کو اپنے ساتھ لیے جا رہا ہوں میں

ے سرد ہوتے ہی نہیں میری نگاہوں کے چراغ
میں نے دیکھے ہیں سلگتے ہوئے محشر کتنے

ے خدمت خلق میں حاصل ہوئے آخر مجھ کو
کل مقاصد جو فرشتوں کی عبادات میں تھے

لکشمی نارائن فارغ:

ے نہ خود سری کا نتیجہ نہ سرکشی کی دلیل
مذاق سعیٔ مسلسل ہے زندگی کی دلیل

ے ہمیشہ رکھتا ہوں رخت سفر میں ساتھ اپنے
ہے میرے ساتھ غم روز گار صحرا میں

ے خون معصوم سے دیواروں پر
غم کا افسانہ لکھا جاتا ہے

ے فارغ تھی جن کے دست شفا کی جہاں میں دھوم
وہ بھی علاجِ گردشِ دوراں نہ کر سکے

مجموعی طور پر اس کتاب کو پڑھ کر مجھے محسوس ہوا کہ محمد شاہد پٹھان میں اردو ادب نے ایک اچھا اور معتبر تنقید نگار پایا ہے۔ انہیں نہ صرف تنقیدی شعور حاصل ہے بلکہ تنقید کی تحقیق پر بھی انہوں نے بہت محنت کی ہے۔ مجھے امید ہے وہ اسی میدان پر مکمل فوکس کریں گے اور انتقادیات میں رونما ہوئی خلیج کو کم کرنے کی کوشش کریں گے۔

❖ ❖ ❖

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

نثر۔ رنگ و آہنگ

ــــ شہناز انجم

شہناز انجم کی کتاب 'نثر۔ رنگ و آہنگ' تحقیقی، تنقیدی و تاثراتی مضامین پر مشتمل ہے۔ یہ مضامین نہ صرف معتبر جرائد میں شائع ہو چکے ہیں بلکہ ریڈیو پر بھی نشر ہو چکے ہیں۔ اس سے قبل ۱۹۸۵ء میں مصنفہ کی تصنیف 'اردو کی ادبی نثر کا ارتقاء (شمالی ہند میں ۱۸۰۰ء سے ۱۸۵۷ء تک) شائع ہو چکی ہے جس کی خوب پذیرائی ہوئی۔ مزید تین اور کتابوں 'خیال در خیال' گرتو برا نہ مانے (انشائیے) اور فیچر اور خاکے، مستقبل میں منظر عام پر آنے کی امید ہے۔

اردو کے بہت کم قلم کار شاعری کی جگہ نثر کو ترجیح دیتے ہیں کیونکہ شعر کہنے اور پھر شاعری پر تنقید و تحقیق کرنے میں اتنی عرق ریزی درکار نہیں ہوتی جتنی نثر لکھنے اور اس کی تنقید و تحقیق پر۔ اس حساب سے شہناز انجم مبارکباد کی مستحق ہیں کہ انہوں نے نثر کو ہی اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے۔ زیر نظر مجموعے میں ۹ مضامین شامل ہیں جن میں مختلف نثری اصناف کا احاطہ کیا گیا ہے۔ 'اردو نثر اور سرسید تحریک' میں انہوں نے سرسید سے قبل اردو نثر کے ارتقاء، فورٹ ولیم کالج کی کارکردگی، سرسید کی علی گڑھ تحریک اور سرسید کی تحریروں کا ان کے ہم عصروں اور آنے والی نسلوں پر اثر جیسے موضوعات پر روشنی ڈالی ہے۔ ایم اے کالج علی گڑھ کے بانی سرسید مسلم قوم کے ریفارمر تھے۔ اس لیے مختلف اخباروں اور رسالوں کے توسط سے اس معاشرے میں پنپ رہی توہم پرستی، عقائد کی فرسودگی، روایات کی قید و بند، رسم و رواج کی بے جا بندشوں کے خاتمے کے لیے کوششیں کرتے رہے۔ انہیں جدید نثر کا معمار اور عملی نثر کا موجد مانا جاتا ہے۔ اسی کے زیر اثر جدید اصناف جیسے

ناشر: مصنفہ، ۱۷۴۷، میر جملہ لین، لال کنواں دہلی ۱۱۰۰۰۶

سن اشاعت: ۲۰۰۴ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ناول، انشائیہ اور تنقید نے اردو میں جڑیں پکڑ لیں۔ وہ ادب کو برائے زندگی سمجھتے تھے۔ اس لیے علامتی اور استعاراتی زبان سے پرہیز کر کے بلاواسطہ نثر کا استعمال کرتے تھے۔ انہوں نے نہ صرف ہمعصروں بلکہ آنے والی نسلوں کے ایک بہت بڑے کارواں کی رہنمائی کی۔ ایسی شش جہت شخصیت پر ایک مکمل مضمون لکھنا سمندر کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہے اور اس کوشش میں شہناز انجم سرخرو ہو چکی ہیں۔

'اُردو نثر کا ارتقاء فکشن کے حوالے سے' دکنی ادب خصوصاً اسد اللہ وجہی کی 'سب رس' سے لے کر اردو نثر کے سفر کی نشاندہی کرتی ہے جس کے اہم سنگ میل یوں ہیں: مہارانی پرتھابائی کا خط، مذہبی رسالے، کربل کتھا، مذہبی کتابوں کے ترجمے، سبیل ادب کا دیباچہ، قواعد ولغات، فورٹ ولیم کالج کے ترجمے، رانی کیتکی کی کہانی اور دیگر داستانوں کا ہجوم، انیسویں صدی میں اردو نثر کی کروٹ، اخبارات کی آمد، غالب کی نثر، سرسید، حالی، شبلی اور آزاد کا یوگدان، اردو میں مغربی اصناف کی آمد اور ارتقاء مثلاً افسانے، ناول وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ اتنے بڑے اور عمیق موضوع کا اس مضمون میں سرسری جائزہ ہی لیا جا سکتا ہے کیونکہ اس پر تفصیل سے لکھنے کے لیے کئی جلدیں درکار ہوں گی۔ اس اعتبار سے شہناز کا مضمون ہمہ گیر دکھائی دیتا ہے جو نہ صرف قاری کو اس لمبی سڑک کے مناظر سے آشنا کراتا ہے بلکہ اس میں مزید جاننے کا تجسس بھی پیدا کرتا ہے تاکہ وہ دیگر حوالہ جاتی کتابوں سے اپنی تشنگی مٹا سکے۔

اگلے دو مضامین میں شہناز انجم نے اردو کی معروف خواتین افسانہ نگاروں، حاجرہ مسرور اور جلانی بانو کے فکر وفن پر بحث کی ہے۔ حاجرہ مسرور، بقول مضمون نگار ''ترقی پسند رہیں اور اس تحریک کی کھری ناقد بھی''۔ شہناز انجم کا خیال ہے کہ ''ان کے تمام افسانوی مجموعوں مثلاً ہائے اللہ چرکے، چھپے چوری، وہ لوگ، اندھیرے اجالے اور تیسری منزل میں شامل تمام افسانے زندگی اور وقت کی بدلتی ہوئی کیفیات، حقیقت کی تلخیوں اور شیرینیوں، چھوٹے بڑے حادثات اور واقعات سے عبارت ہیں''۔ جیلانی بانو کے بارے میں رائٹر فرماتی ہیں کہ ''ان کے افسانوں میں زندگی کی عظمت اور اہمیت بھی ہے، اس کی کج ادائیاں بھی..... وہ عورت کی عظمت وجرأت کی شیدائی اور پرستار ہیں اور اس جذبے کو اکثر اپنی کہانیوں میں پیش کرنے کی کوشش کرتی ہیں''۔ جیلانی بانو کی تصانیف جو شائع ہو چکی ہیں ان کے نام یوں ہیں: روشنی کے مینار، نروان، جگنو اور ستارے، نغمے کا سفر، ایوان غزل (ناول) پرایا گھر، کیدارم اور ملیالم افسانے۔

شہناز انجم نے راجندر سنگھ بیدی کی مشہور ناولٹ 'ایک چادر میلی سی' کا بڑی دقیقہ شناسی سے جائزہ لیا ہے۔ اس ناولٹ کے بارے میں وہ فرماتی ہیں۔ ''زندگی کی یہ میلی سی چادر صرف میلی ہی نہیں ہے۔ اس میں جگہ جگہ

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

مفاہمتوں، مصلحتوں اور سمجھوتوں کے پیوند بھی لگے ہوئے ہیں۔ انہوں نے راجندر سنگھ بیدی کے فن کو اس ناولٹ کے پس منظر میں پرکھا ہے اور ان کے اسلوب، کردار نگاری اور سماجی شعور کو سراہا ہے۔

'پریم چند۔ تحقیقی وتنقیدی کتب اور مضامین کی وضاحتی فہرست' بھی مصنفہ کی محنت اور لگن کا آئینہ ہے۔ انہوں نے اردو فکشن کے سب سے بڑے ادیب کی تصانیف پر لکھے گئے مقالوں، مضامین، رسائل اور تنقیدی و تحقیقی کتابوں کا حروف تہجی کے مطابق وضاحتی فہرست ترتیب دی ہے۔ جو ہر اس شخص کے لیے مفید ہوگی جو پریم چند کی ہمہ جہت شخصیت اور ان کے فکر وفن کا مطالعہ کرنے کا آرزومند ہو۔

ساتویں باب کا عنوان ہے 'ادب اور سماجی معنویت۔ پروفیسر محمد مجیب کے ڈراموں کے تناظر میں۔ بقول شہناز انجم ''پروفیسر مجیب اچھے مورخ ہی نہیں اپنے دور کے دانشور بھی تھے۔ اس لیے ان کی نظر اپنے عہد کے تمام سیاسی اور سماجی کیفیات پر تھی..... مجیب صاحب کی ڈرامہ نگاری کا زمانہ (۱۹۳۰ء تا ۱۹۵۷ء) چونکہ ہندوستان میں قومی تحریکات کے عروج، سیاسی شعور کی بیداری اور اصلاح معاشرہ کی کوششوں کا دور تھا۔ اس لیے مجیب صاحب نے بھی اپنے ڈراموں میں ان مسائل پر زیادہ توجہ دی جو انسانی اقدار کے فروغ اور آزادی کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں۔'' ان کے ڈراموں کے نام ہیں: 'کھیتی' (۱۹۳۱)، 'دوسری شام'، 'انجام'، 'ہیروئن کی تلاش'، 'خانہ جنگی'، 'آزمائش'، 'حبہ خاتون' وغیرہ۔ تنقید نگار نے اس مضمون میں پروفیسر مجیب کے ڈراموں کی تکنیک، کردار نگاری، اسلوب اور معنویت پر بحث کی ہے جس سے مجیب صاحب کے ڈراموں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اسی مضمون کی توسیع (extension) آٹھواں باب ہے جس کا عنوان ہے۔ 'دانشورانہ مکالمہ۔ مجیب صاحب کے ڈراموں کی روشنی میں'۔ اس مضمون میں ڈرامہ نگار کی دانشورانہ فکر کو فوکس کیا گیا ہے۔ ان کے مکالمے خاص طور سے سماجی بدعنوانیوں اور بے ضابطگیوں پر کاری ضرب لگاتے ہیں۔

مجموعے کا آخری مضمون رشید احمد صدیقی کی خطوط نویسی ہے جس میں صدیقی صاحب کے مزاج، کردار اور ان کے مختلف دینی رویوں کو دوست احباب کے نام ان کے خطوط سے سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ رشید احمد صدیقی کے مکاتیب اردو ادب کا گرانقدر سرمایہ ہیں۔

'نثر۔ رنگ وآہنگ' کا مطالعہ کرنے سے خود شہناز انجم کے فکر وفن پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ان کا مطالعہ وسیع اور مشاہدہ عمیق ہے۔ زبان میں سلاست بھی ہے اور فصاحت بھی ہے۔ مضامین لکھتے وقت وہ اپنے موضوع سے بھٹکتی نہیں ہے۔ انہوں نے اردو کے نامور نثر نگاروں پر اپنے خیالات قلمبند کر کے ادب کی بڑی خدمت کی ہے۔

❖ ❖ ❖

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

زاویۂ نقد ونظر

ڈاکٹر محبوب راہی

تحقیقی وتجزیاتی مضامین پر مبنی ڈاکٹر محبوب راہی کی کتاب 'زاویۂ نقد ونظر' حال ہی میں منصۂ شہود پر رونما ہو چکی ہے۔ ڈاکٹر راہی اچھے شاعر بھی ہیں اور اچھے نثر نگار بھی۔ مشمول مضامین کے تنوع کو دیکھ کر لگتا ہے کہ مصنف نے سمندر کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش کی ہے۔ زاویۂ نقد ونظر تحلیل وتفحص، وسیع مطالعے اور گہرے مشاہدے کی دستاویز ہے۔ فرسودہ بلند وبانگ اصطلاحات سے پاک، سلیس اور رواں زباں میں تحریر کی گئی یہ تحقیقی وتنقیدی کتاب کہیں پر بھی اکتاہٹ پیدا نہیں کرتی۔ مذکورہ کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا، جس میں مضمون نگار نے خود اپنے فن اور شخصیت پر روشنی ڈالی ہے مثلاً میری پہچان، یہ کتاب، میں کیوں لکھتا ہوں، اور میرا تخلیقی سفر۔ دوسرا، جس میں اساتذہ کے فن کا جائزہ لیا گیا ہے۔ تیسرا، جس میں اردو زبان وادب اور تاریخ کو موضوع بنایا گیا ہے اور چوتھا۔ جس میں ہم عصر ادیبوں پر خامہ فرسائی کی گئی ہے۔

بقول محبوب راہی ان کے دل میں شعر فہمی کی چنگاری بچپن ہی میں ان کے استاد محترم نے ڈالی تھی۔ ۱۹۵۷ء میں ڈی ایڈ کے دوران انہیں پہلی بار مشاعرے میں حصہ لینے کا موقعہ ملا۔ ان کی پہلی غزل ۱۹۶۲ء

ناشر: مصنف، بارسی ٹاکلی، اکولہ، مہاراشٹر
سن اشاعت: ۲۰۱۰ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar

Digitized By eGangotri

میں اردو ٹائمز میں چھپی تھی جو حب الوطنی کا آئینہ تھی۔ محبوب راہی کی ۱۸ تصانیف پہلے ہی شائع ہو چکی ہیں جبکہ سات اور تصانیف زیر ترتیب ہیں۔ مظفر حنفی۔ حیات، شخصیت اور کارنامے پر انہیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض ہوئی۔ اپنی انتقادی تحریروں کے بارے میں خود ہی فرماتے ہیں۔ ''میں کسی بھی فن پارے کے منفی پہلوؤں سے صرف نظر کر کے اس کے مثبت پہلو اُجاگر کرنے کی امکانی کوشش کرتا ہوں۔'' اور پھر لکھنے کا جواز بھی یوں بیاں کرتے ہیں۔ ''کیوں لکھتا ہوں کا ایک جواب شاید یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لکھنا میری مجبوری ہے، میری ضرورت ہے۔ اگر نہ لکھتا تو کیا کرتا۔ سوائے لکھنے کے دوسری کوئی صورت جینے کی میری پاس نہیں۔'' ان کے لیے لکھنا اپنے وجود کی تکمیل کرنا ہے۔ ملاحظہ ہو چند اشعار:۔

راہی عوام جس بھی روش پر نکل پڑے — ہم نے قسم خدا کی وہ رستہ بدل دیا

سکوں میں شعر ہونے کو تو ہوتے ہیں مگر راہی — غزل کا لطف تو جذبوں کی طغیانی میں ہوتا ہے

غالب، اقبال، ابوالکلام آزاد، سرسید اور جوش پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے مگر ڈاکٹر راہی نے ان کے فن کو نئے زاویوں سے پرکھا ہے اور ان کے بارے میں کئی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ غالب کی شاعری کی عصر حاضر میں معنویت کے بارے میں فرماتے ہیں۔ ''غالب کی شاعری کی یہی تشکیک، بے یقینی، یاسیت، شستگی، لاحاصلی، محرومی اور ناآسودگی انہیں عصر حاضر کی شاعری کا سرخیل ثابت کرتی ہے۔'' اس مضمون میں انہوں نے غالب کے فکر و نظر کی بازگشت ہم عصر شاعری میں ڈھونڈ نکالی ہے۔

اقبال کے تصور عشق پر بھی موصوف نے سیر حاصل بحث کی ہے کیونکہ بقول اسلوب احمد انصاری ''یہ حیاتیاتی سے زیادہ روحانی اور آفاقی مضمرات کی طرف ذہن کو منتقل کرتا ہے۔'' اقبال نے اسی عشق کی آگ کو بھڑکا کر تمام عمر قوم اور ملت کو بیدار کرنے کی سعی کی۔ جہاں تک مولانا ابوالکلام آزاد کا تعلق ہے، وہ صحافت، سیاست، خطابت، انشا پردازی کے میدان میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ان کی تحریر و تقریر کا بنیادی مقصد بقول راہی ''مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح اور زبان و ادب کی وسعت'' تھا۔ سجاد انصاری تو یہاں تک کہہ گئے کہ ''اگر قرآن نازل نہ ہو چکا ہوتا تو ابوالکلام کی نثر اس کے لیے منتخب کی جاتی یا اقبال کی نظم۔'' سرسید احمد خان کے بارے میں محبوب راہی یوں رقم طراز ہیں: ''سرسید احمد خان کا شمار مصلحین قوم و ملت میں سرفہرست ہوتا ہے جن کی اصلاحات کا دائرہ کار زندگی کی کم و بیش تمام امکانی جہتوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔'' سرسید نے سوچ و فکر کا ایک بڑا کارواں تیار کیا جو ان کے بعد ان کے مقصد حیات کو آگے بڑھاتا رہا۔ ان کی کامیابیوں کو دیکھ کر ان کے رقیب اکبر الہ آبادی کو بھی یہ کہنا پڑا۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں، سید کام کرتا تھا　　نہ بھولو فرق ہے جو کہنے والے کرنے والے میں

جوش ملیح آبادی کی شاعری میں ان کی شخصیت کی طرح انا پرستی، بغاوت، روایت شکنی اور تغیر کا جذبہ حاوی ہے۔ انہوں نے جہاں انگریزوں کو للکارا وہاں آزاد ہند اور پاکستان کے حکمرانوں کو بھی آڑے ہاتھوں لیا۔ یہی وجہ تھی کہ انہیں اکثر اذیتیں جھیلنی پڑیں۔ جوش کے دشمنوں نے انہیں کافر، ملحد اور دشمن اسلام کے لیبل چپکائے۔ ڈاکٹر راہی نے اپنے مضمون میں انہیں سچا مسلمان ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں میں یہ بات کہنے کی جسارت کرتا ہوں کہ اگر کوئی شخص دہریت پسند یا منکر خدا ہے تو کیا وہ اچھا شاعر، اچھا ادیب یا پھر اچھا انسان نہیں ہوسکتا ہے؟ یہ مشرقی سوچ وفکر کی سب سے بڑی کمزوری ہے جبکہ مغربی لٹریچر میں برٹرینڈ رسل جیسے خدا کو نہ ماننے والے بھی خدا پرست دانتے اور ملٹن کی طرح اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔

ہندوستانی جمالیات میں بھی مصنف نے اپنی کوتاہ نظری اور محدودیت کا ثبوت دیا ہے۔ تنقید نگار کا اپنا طرز خیال کچھ بھی ہو اسے ایسے موضوعات کو معروضی حقائق کے پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔ ادب میں اکثر وبیشتر حسن وجمال کارفرما رہتے ہیں۔ وہ شاعر ہو یا فکشن نگار، مصور ہو یا بت تراش، دنیا کی ہر حسین شئے اس کے لیے باعث وجد وانبساط ہوتی ہے۔ چنانچہ عورت کا حسن اس کے حواس خمسہ کو سب سے زیادہ متاثر کرتا ہے اور اس کے جذبات کو انگیز کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ اس حسین شئے کی پیکر تراشی میں کوئی کسر باقی نہیں رکھتا۔ رہا سوال اقبال کی اس رائے کا کہ اُردو شاعروں کے اعصاب پر عورت چھائی ہوئی ہے اس مفروضے میں سماجی اور سیاسی مصلحت تھی کیونکہ اقبال شاعر سے زیادہ فلسفی تھے اور اس سے بھی زیادہ قوم وملت کے مصلح۔ 'تاریخ ہند کے دور روشن باب عہد مغلیہ اور اردو' میں بھی مضمون نگار نے خطیبانہ طرز انداز اپنایا ہے۔ راہی صاحب اگر مغلوں سے پہلے کے فن تعمیر کو دیکھیں گے یا پھر اے ایل باشام کی کتاب 'دی ونڈر دیٹ واز انڈیا' (The wonder that was India) کا بغور مطالعہ کریں گے تو شاید اپنی رائے بدل دیں۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ مغلوں نے ہندوستان کو تاج محل دیا مگر یہ تحریر کرنا مبالغہ ہوگا کہ ہندوستان میں اس سے قبل فن تعمیر اعلیٰ پایہ کا نہیں تھا۔ اسی طرح یہ مفروضہ کہ مغلوں نے ہندوستان کو اُردو دیا، غلط ہے۔ لشکری زبان اردو مسلمان فوجوں اور ہندوستانی عوام کے تعمل سے وجود میں آئی۔ اسے مبلغوں اور اولیاء نے پروان چڑھایا اور بنا کسی کی سرپرستی کے یہ عوام میں پھیلتی چلی گئی۔ ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ مغلوں نے اس زبان کو حکومت کی سرپرستی سے نوازا، اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا (دربار مغلیہ میں فارسی کا چلن تھا) یا پھر فورٹ ولیم کالج یا عثمانیہ کی طرح دارالترجمہ قائم کیا تاکہ اردو کو فروغ مل سکے ماسوائے آخری

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

مغل کے جو اپنی شکست وریخت کا اظہار اردو زبان میں کرنے لگا۔ مغلوں سے کہیں بہتر دکن اور اودھ کے حکمران تھے جو اردو شاعروں اور ادیبوں کی حوصلہ افزائی کرتے رہے۔

مضمون 'ماں بچوں کی شاعری میں' میں محبوب راہیؔ نے ان شاعروں کے کلام پر روشنی ڈالی ہے جنہوں نے اپنی شاعری میں 'ماں' کو موضوع بنایا۔ ماں ایک ایسی شکتی ہے جس کی محبت اور ایثار کا کوئی بدل نہیں اور جس کی جدائی کا غم دائمی غم بن کر رہ جاتا ہے۔ چند چنندہ اشعار:

ماں ہے تو زندگی ہے، خوشی ہے بہار ہے — ماں کا وجود رحمت پروردگار ہے

ماں کی گود میں میٹھی نیندیں — ماں کی گود میں راحت ہے

ماں کی گود میں ہمدردی ہے — ماں کی گود میں چاہت ہے

اردو کی موجودہ صورت حال پر ڈاکٹر محبوب راہیؔ پریشاں تو ہیں مگر امید کا دامن نہیں چھوڑتے۔ ان کے دل سے فغاں اٹھتی ہے: ''کاش اُردو والے میری اس بلبلاہٹ کو محسوس کریں''۔

ہم عصر ادیبوں کے فن کا تجزیہ کرتے ہوئے تنقید نگار نے مختصراً ان کے کوائف اور ان کے فن کی خوبیاں درج کی ہیں۔ ناطق گلاوٹھی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ داغ دہلوی کے چند نامور شاگردوں میں سے تھے جو اشعار کو زندگی اور جاودانی عطا کرنے کی مہارت رکھتے تھے۔ ''مہارت زبان، پاکیزگیٔ بیاں، محاورہ بندی، منفرد تشبیہاتی واستعاراتی نظام، مضامین کی ندرت، طرز اظہار کی انفرادیت، کیا نہیں ہے ان اشعار میں۔'' ملاحظہ ہو چند اشعار:۔

عدم کا زندہ نمونہ ہوں میں یہاں ناطقؔ — وجود مانگ کے لایا ہے مستعار مجھے

ان کا حریم ناز، مرا پردۂ نگاہ — چھپتے ہیں اس ادا سے کہ دیکھا کرے کوئی

کچھ ہم پہ اہل دیں نے عنایت تو کی ضرور — کافر بنا دیا جو مسلماں نہ کر سکے

ڈاکٹر راہیؔ ظفر گورکھپوری کو زمین کے قریب کا شاعر گردانتے ہیں جن کی شاعری ذاتی تجربات اور ان کی اپنی محسوسات کی شاعری ہے۔ سات شعری مجموعوں کے خالق، ظفر گورکھپوری کا شمار بقول راہیؔ ''ترقی پسندوں میں کیا جاتا رہا ہے لیکن سچائی یہ ہے کہ ان کی شاعری کو کوئی خاص لیبل نہیں لگایا جا سکتا۔'' وہ غزل، نظم، قطعات، گیت اور دوہے سبھی اصناف میں طبع آزمائی کر چکے ہیں۔ نمونۂ کلام:

ہماری زندگی، بیوہ دلہن، بھیگی ہوئی لکڑی — جلیں گے چپکے چپکے سب، دھواں کوئی نہیں دے گا

میں ظفرؔ مٹی ہوں اس کے ہاتھ میں — چاک اس کا اور صورت گر وہی

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ساتھ ہے، ملنا اگر چاہوں تو ملتا بھی نہیں — ایک گھر میں اتنی دیواریں کہاں سے آگئیں

گھر والی کو رات دن منی آرڈ کی آس — ماتا اپنے لال کی چٹھی بنا اداس

غلام مرتضیٰ راہیؔ کے بارے میں مجبوب راہیؔ لکھتے ہیں: ''جدید شاعری کا بیحد اہم اور نمایاں نام ہونے کے باوجود جس نے اپنی کلاسیکی روایات سے بھی یکسر انحراف نہیں کیا۔'' ان کے چاروں مجموعوں کا نام 'لا' سے شروع ہوتا ہے۔ بقول محبوب راہیؔ ''یہ وہی 'لا' ہے اللہ کی وجودیت کے اقرار واثبات سے قبل باطل سے نفی کا برملا اظہار واعلان ہے۔'' مرتضیٰ راہی کی شاعری میں فلسفیانہ نکتہ آفرینیاں، نئی اور تازہ ترکیبیں، اور ندرتِ خیال جابجا ملتا ہے۔ مگر انہوں نے ابہام واہمال کو دور ہی رکھا۔

اجل کے فرشتے نے اک پل کی خاطر — مجھے زندگی بھر پریشان رکھا

آگ تیزی پکڑنے سے دھواں مدھم ہوا — روشنی پاکر حقیقت کی گماں مدھم ہوا

بھنک کسی نہ کسی طرح پاگئے پتھر — شجر میں پھل نہیں آیا کہ آگئے پتھر

انسانوں کے وہ وہ روپ نظر آئے — گرگٹ تک نے رنگ بدلنا چھوڑ دیا ہے

چار مجموعوں کے خالق قمر سنبھلی عمر بھر صحافت کے ساتھ جڑے رہے۔ بقول مصنف ان کے مجموعے 'روشن روشن حرف' میں شامل حمد ومناجات اور نعتیہ اشعار میں ایک نوع کے موضوعاتی تسلسل کی خوش ترتیبی ہے۔''

قمر سمیٹ لو منظر تم اپنی آنکھوں میں — کہ اس حیات دو روزہ کا کیا بھروسہ ہے

مرے قلم کی سیاہی بھی نور سے اس کے — ہر اک سخن میں مرے ہے جمال بھی اس کا

ملک زادہ منظور احمد شاعر، ادیب، نقاد، محقق، مدیر، ناول نگار، سوانح نگار اور ان سب سے بڑھ کر ناظم مشاعرہ ہیں جن کی سنجیدہ، عالمانہ اور برجستہ نظامت مشاعروں کی جان رہی ہے۔ شاہد پٹھان ''اپنے غزلیہ اشعار کے وسیلے سے حیات وکائنات کی سچائی رقم کرنے لگے۔'' وہ بقول رائٹر ''اپنے عمیق مطالعے، علمی آگہی اور تخلیقی تجربے کی روشنی اور شعور وادراک کی کامل رہنمائی میں اپنے تخلیق شعر کے لیے چند ضابطے متعین کر لیتے ہیں اور پر اعتماد لہجے میں اس کا اظہار کرتے ہیں۔''

ہوئے ہیں کتنے ہی چنگیز، کنس اور یزید — کبھی نہ ختم جہاں میں ستم کا باب ہوا

ہمارا نام بھی ہجر زدوں میں لکھ لینا — ہم اپنے دیس میں بھی اجنبی سے پھرتے ہیں

دامن صبح پہ زخموں کی حنا بندی ہے — اب تو ہر شب یہاں خوں ریز نظر آتی ہے

تو نے تو ایک حرف نفی میں دیا جواب — کیا کیا قیامتیں مرے دل پہ گزر گئیں

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

وکیل نجیب کے بارے میں ڈاکٹر راہی تحریر کرتے ہیں کہ انہوں نے کئی اصناف میں کمال حاصل کرلیا ہے مگر وہ بچوں کے ادیب کے طور پر زیادہ شہرت پا گئے۔ بقول حیدر بیابانی۔ ''وکیل جو کچھ لکھتے ہیں اسے پڑھ کر قاری حیرت واستعجاب کے سمندر میں ڈوبتا ابھرتا ایک خوش گوار سفر طے کر کے کنارے آ لگتا ہے۔''

عطا عابدی کی شاعری میں بقول راہی ''زندگی کی تفہیم کے راستے ملتے ہیں۔ چونکہ انہوں نے حقائق زندگی کو سمجھا ہے اس لیے ان کی غزلوں میں انحراف نہیں بلکہ خود احتسابی کا رویہ ملتا ہے جو انسان کو اصل منزل تک پہنچانے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔''

- سنگ حقائق سے ٹکرا کر زخمی سارا خواب ہوا — پھر بھی دل کو یہ ڈھارس ہے پورا کس کا خواب ہوا
- ہم سب امن وامان کے داعی لیکن کیسی حکمت ہے — گلشن گلشن مقتل دیکھیں، پھولوں کو شمشیر کریں
- سر پہ سورج ہو مگر سایہ نہ ہو ایسا نہ تھا — پہلے بھی تنہا تھے لیکن اس قدر تنہا نہ تھا
- کہہ رہا ہے اہل ساحل سے سمندر کا وجود — مجھ میں جو غوطہ لگائے گا گہر لے جائے گا

مرزا رفیق شاکر کے فن پر ڈاکٹر محبوب راہی یوں رقمطراز ہیں۔ ''ان کے اسلوب کی انفرادیت، لب ولہجہ کی ندرت کے ساتھ عصری حسیت، ذات سے کائنات تک سفر، فکری صلابت، تخلیقی بصیرت رمزیت اور ایمائیت، فنی رچاؤ، لہجہ کے بے ساختگی، خوش گفتاری، طہارت فکر، موضوعاتی رنگارنگی، سلاست وشگفتگی، انسان دوستی، اعلیٰ اقدار کی پاسداری، سوز وگداز، دل گرفتگی، احساسات کی رعنائی، جذبات کی توانائی، شعور کی پختگی اور اظہار کی بلاغت جیسے صحت منداور لازوال عناصر کی نشاندہی'' ہوتی ہے۔

- کون سے دور میں یزید نہیں — کس جگہ کربلا نہیں ہوتی
- وہ جن کے سر پہ رکھا ہم نے تاج عزت کا — وہ ہی ہیں قوم کی پگڑی اچھالنے والے

محمد خورشید اکرم سوز کے مجموعے 'سوز دل' پر تبصرہ کرتے ہوئے راہی لکھتے ہیں۔ ''روایت کی سوندھی سوندھی مٹی میں رچی بسی بھینی بھینی خوشبو سے معمور جدید لب ولہجے اور ترقی پسندانہ بلند آہنگی کی متوازن، معتدل اور خوش گوار آمیزش سے تخلیق شدہ ان کے اشعار انہیں ہم عصر شعری ادب میں ایک مخصوص شناخت عطا کرنے کا سبب ہیں۔''

- عمل سے زندگی بنتی ہے لیکن — مقدر کا بھی کچھ لکھا ہوا ہے
- کبھی جو چڑھتے دریا کی طرح تھا — اب اپنی ذات میں سمٹا ہوا ہے
- یارو کتنے لوگ یہاں جس دریا سے سیراب ہوئے — جانتے ہو وہ دریا اپنی تہہ میں کتنا پیاسا ہے

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ے دل لہو روتا نہیں ترکِ وفا پر ان دنوں — یاد کرتا ہوں تجھے اب بھول جانے کے لیے

مشاعروں کو اپنے بلند آہنگ اور بے باک اشعار سے لوٹنے والے، افلاس میں پلے بڑھے، خوش گفتار شاعر خلیل فرحت نے نہ روایتوں سے گریز کیا نہ بغاوتوں پر وعید ہوئے بلکہ ان کی شاعری حدیث دل ہو کر رہ گئی۔

ے اے داور محشر ہمیں فردوس عطا ہو — دنیا میں جہنم کی سزا کاٹ چکے ہیں

ے بہاروں کو ترس جائے گا گلشن ہم نہ کہتے تھے — خزاں پروردہ ہاتھوں میں جہانِ رنگ و بو کب تک

ے جس شہر کو دنیا نے مرے نام سے جانا — اس شہر میں آپ اپنا پتہ پوچھ رہا ہوں

ے میں نے غیروں کے بھی زخموں پہ لگایا مرہم — مجھ کو بدلے میں یہ رستے ہوئے ناسور ملے

ضیاء زخمی کھام گانوی کے 'تنہائی کی بھیگی رات' (چوتھا شعری مجموعہ) پر تبصرہ کرتے ہوئے راہی فرماتے ہیں۔ ''اس میں جا بجا ضیاء زخمی کے تخیل کی تازہ کاری، فکر و نظر کی وسعت، ذہن کی شادابی، احساس کی شگفتگی، اظہار ابلاغ کی پاکیزگی، ترسیل کی فراوانی، زبان کی شائستگی، نیز بیاں کی شستگی کے خوبصورت اور دلکش نمونہ دامن دل کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔''

ے ریشمی آنچل کس کا ہاتھ آیا ہے مگر — سوچتا ہوں خواب ہے یا خواب کی تعبیر ہے

ے پلکیں تو انتظار سے بوجھل ہوئیں مگر — آنکھوں سے تیرے خواب کے منظر نہیں گئے

ے جب نہیں طرز بیاں کوئی سمجھنے والا — خامشی اپنی تکلم سے بھی ہے کہ نہیں

ے ہر جگہ سر کو جھکانا میرا دستور نہیں — ہر کوئی میرا خدا ہو مجھے منظور نہیں

بقول محبوب راہی ''احمد امام کی شاعری میں جو احتجاج ہے وہ معاشی ناہمواریوں پر، ان کی جھلاہٹ ہے سیاسی بدعنوانیوں پر، ان کا غصہ ہے سماجی عدم مساوات پر، اسباب و عوامل کی غیر مساویانہ تقسیم پر، ان کے باغیانہ جذبات ہیں اقتدار کی بندر بانٹ پر بھائی بھتیجاواد پر، مستحقین کے حقوق کے غاصبانہ استعمال پر، احباب کی منافقت پر، اپنوں کی غیریت پر اور حالات کی نامساعدت پر لہٰذا ان سب پر وہ اپنی خفگی کا جوشیلے اور جذباتی اشعار کے وسیلے سے بے باکانہ اور غیر مصلحت پسندانہ انداز میں برملا اور دوٹوک اظہار کرتے ہیں۔

ے لہو اپنے چراغوں میں جلانے کا نتیجہ ہے — زمانے بھر کی یہ جو تیرگی حصے میں آئی ہے

ے کبھی صرف نظر آتی ہے یہ دنیا محاسن سے — کبھی غربت تلب جاتے ہیں جوہر بہت سارے

ے لب دریا کھڑا ہوں تشنگی حصے میں آئی ہے — بڑی خود داریوں کی زندگی حصے میں آئی

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

معروف افسانہ نگار، ناولسٹ، ڈرامہ نویس طنز ومزاح نگار اور محقق بانو سرتاج نے سنجیدگی سے بچوں کے لیے نظمیں (مرغے میاں کی ککڑوں کوں)، مختصر کہانیاں اور نثری مضامین لکھے ہیں جن سے ان کے وسیع مطالعے اور گہرے مشاہدے کا پتہ چلتا ہے۔ بچوں کے لیے کہانیاں اور نظمیں لکھتے وقت وہ ان کے فطری مطالبے اور نفسیاتی تقاضے کا خاص خیال رکھتی ہیں۔ گو ان کی تخلیقات میں نصیحت پوشیدہ ہوتی ہے مگر وہ براہ راست ناصح بننے سے گریز کرتی ہیں۔ جلیل ساز کے بارے میں محبوب راہی لکھتے ہیں کہ ''وہ جہاں ایک اچھے شاعر تھے وہیں نثر نگاری میں بھی انہیں درجہ کمال حاصل تھا۔ ان کی لذت تقریر سے سامعین محظوظ بھی ہوتے تھے، متاثر بھی اور مسرور وسرشار بھی۔''

- خود فریبی میں مبتلا ہیں سبھی — آپ کے شہر میں خدا ہیں سبھی
- درس گاہوں کے جال پھیلے ہیں — پھر بھی کتنی جہالتیں ہیں یہاں
- ڈال کر سو گئے ہم روح پہ نیندوں کا کفن — اور فتنے ہیں کہ بیدار نظر آتے ہیں
- پھر یہ ہوا کہ خود کو ہمیں ڈھونڈنا پڑا — چاہا تھا ربط وضبط بڑھے خاص وعام سے

اختر آصف برہانپوری کی یاد تازہ کرتے ہوئے مصنف یوں رقم طراز ہیں۔ ''سچ تو یہ ہے کہ اختر آصف جتنا اچھا شاعر تھا اس سے زیادہ اچھا انسان بھی تھا۔ مشاعروں کی بے پناہ شہرت ومقبولیت کے باوجود رعونت یا غرور اسے چھو کر بھی نہیں گزرا تھا۔''

- حاسد سے یہ کہتے ہیں کہ باز آئے حسد سے — دشمن کو بھی ہم آگ میں جلنے نہیں دیتے
- قتل کرنے کو کہاں زہر دیا جاتا ہے — ان دنوں بس نظر انداز کیا جاتا ہے
- جانچ کر چاند کی مٹی کو بھلا کیا حاصل — اپنی مٹی کو تو انسان نے پرکھا ہی نہیں
- ایسے تو نہیں لوگ کہ گرتے کو سنبھالیں — ایسے ہیں کہ گرتے کو سنبھلنے نہیں دیتے

ڈاکٹر راہی صاحب نے اس کتاب میں مدیر شاداب قمرالدین صابری اور بچوں کے ادیب صدر بیابانی کی شخصیت اور فن پر بھی اپنے تاثرات قلمبند کیے ہیں۔ صدر بیابانی کی نظموں میں کائنات کی رنگا رنگی، پرندوں، جانوروں اور پیڑ پودوں کا ذکر ملتا ہے جو بچوں کو بہت پیارا لگتا ہے۔ ان کی شاعری میں ماحولیات کے تحفظ کا درس بھی جا بجا ملتا ہے۔

مجموعی طور پر 'زاویہ نقد ونظر' اُردو ادب کے لیے ایک بیش بہا تحفہ ہے جس میں رائٹر نے بے روک ٹوک اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس کی خوب پذیرائی ہوگی۔ ❖ ❖ ❖

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

نظر و قدر

ڈاکٹر انوار احمد انصاری

ڈاکٹر انوار احمد انصاری کی تازہ تصنیف 'نظر و قدر' حال ہی میں شائع ہوئی ہے جس میں ۲۵ تنقیدی مضامین شامل ہیں۔ یوں تو تحقیق، افسانہ نگاری اور طنز و مزاح کے حوالے سے ان کی کتابیں، 'پنجاب کا طنزیہ و مزاحیہ نثری ادب'، 'ہتھیار'، 'زندگی کی تلاش میں' اور 'ادیب و غریب' پہلے ہی منظر عام پر آ چکی ہیں لیکن زیر نظر کتاب سے ان کی شخصیت کا ایک اور پہلو اُجاگر ہوا ہے۔ ان کی تحقیقی کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد ہی میں نے ان کی تنقیدی صلاحیت کی نشاندہی کی تھی جو اب سچ ہو کر ہمارے سامنے آئی ہے۔

کتاب کے پیش لفظ میں ڈاکٹر انصاری صنف تنقید پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

تنقید میں برابر اپنا ہویا پرایا
یعنی قلم کو میں نے سچ بولنا سکھایا

جہاں تک میرا خیال ہے تنقید نگار کے لیے سچ بولنا بہت مشکل کام ہے کہ اسے آبگینوں کو ٹھیس پہنچنے کا احتمال ہوتا ہے۔ پھر تنقید نگار کے اپنے تعصّبات بھی ہوتے ہیں اور ان سے بچ کر نکلنا مشکل ہوتا ہے۔ تاہم ڈاکٹر انصاری نے حتی الامکان اپنے تنقیدی مضامین میں اعتدال اور غیر جانبداری سے کام لیا ہے اور فن کار کے چشمے سے دیکھا ہے اس پر اپنی عینک چڑھانے کی کوشش نہیں کی ہے۔

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۱۱۰۰۰۶۔ سن اشاعت: ۲۰۰۹۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

انوار احمد انصاری نے جہاں ایک جانب عصر حاضر کے فکشن نگاروں جیسے کیول دھیر، دیپک بُدکی، محمد بشیر مالیر کوٹلوی، ڈاکٹر نریش، ڈاکٹر رینو بہل، کفایت اللہ انصاری، سالک جمیل براڑ اور عابد علی خان کے فن کو اپنی کسوٹی پر پرکھا ہے وہیں سردار پنچھی، انجم قادری، ڈاکٹر محمد رفیع، عزیر بگھروی، خالد کفایت، حاجی انوار احمد خان نشنہ اور ڈاکٹر ریاض خلجی کی شاعری کو بھی میزان پر تولا ہے۔ طنز و مزاح تو خیران کا شغل خاص ہے ہی اس لیے فلک پیما، پطرس بخاری، شوکت تھانوی، مختار ٹونکی، ڈاکٹر بیتاب علی پوری کی ظرافت پر بھی اپنے تاثرات قلم بند کیے ہیں۔ اس کے علاوہ موصوف نے کچھ متفرق موضوعات جیسے گاندھی جی کا نظریۂ تعلیم، پیغام اقبال اور ہماری ذمہ داریاں، گورو ہرگوبند جی۔ باطن فقیر ظاہر امیر اور افسانہ کیا ہے پر بھی اپنے خیالات کا اظہار یا ہے۔ سلطان عمان قابوس بن سعید کی سوانح پر لکھا ہوا تبصرہ بھی کتاب میں شامل ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو کتاب میں مشمول مضامین اکثر و بیشتر پنجاب خاص کر مالیر کوٹلہ سے وابستہ قلم کاروں پر لکھے گئے ہیں جو ایک خوش آئند بات ہے کیونکہ اس علاقے نے برسوں سے اردو کی آبیاری کی ہے۔ تنقیدی مضامین دلچسپ بھی ہیں اور وقیع بھی۔ زبان رواں دواں ہے اور اصطلاحات وکلیشے کا استعمال بہت کم کیا گیا ہے۔ مضامین کو پڑھ کر قاری میں تجسس کی شمع فروزاں ہوتی ہے، بجھ نہیں جاتی۔

افسانہ نگاروں پر لکھے گئے مضامین میں سے چند اقتباسات درج کرنا ضروری سمجھتا ہوں تا کہ ان کے فن کا اندازہ ہو سکے۔

- ان کا فن رومان و محبت کی حسین وادیوں سے گزرتا ہوا سیاسی ثقافتی اور ادبی ندیوں کے پانی سے چھن کر سماجی دریاؤں کی دلدوز لہروں میں بہہ کر حب الوطنی، آپسی بھائی چارے اور انسانیت کے سمندر کی بے پناہ وسعتوں میں سما جاتا ہے جہاں وہ شفاف آسمان کے عکس میں ضم ہو کر رفعتوں کا حامل ہو جاتا ہے۔

(عصر حاضر کا کرشن چندر..... ڈاکٹر کیول دھیر ۱۹)

- وہ اپنے خیالات کے ترنم اور جملوں کی طراوت سے ہمارے حواس و اعصاب میں موسیقیت و غنایت پیدا کر دیتے ہیں اور دل و دماغ میں تازگی، توانائی اور طرفگی کا ایک سیل رواں بہا دیتے ہیں۔ جب تک ان کا افسانہ ختم نہیں ہوتا قاری اس وقت تک بے چین رہتا ہے۔

(دل کو چھولینے والا افسانہ نگار، دیپک بدکی۔ ۲۵)

- بشیر صاحب کی عقابی نگاہ سماج کے ہر شعبہ پر جاتی ہے۔ سماجی، سیاسی، معاشی

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

اور ثقافتی بدعنوانیوں کو وہ ہاتھوں ہاتھ لیتے ہی ہیں البتہ بے روزگاری جیسے مسائل سے بھی وہ کم آشنا نہیں۔ (پتھریلے راستوں کا مسافر۔ محمد بشیر مالیر کوٹلوی ص ۲۷)

- ڈاکٹر نریش ناسٹلجیائی دنیا میں گم رہتے ہیں وہ تقسیم وطن کی لکیر کو مٹا دینا چاہتے ہیں۔ ان کا دل تقسیم سے پہلے کا مشترک تہذیبی ہم آہنگی کا ماحول دیکھنے کو بیقرار ہے۔

(ڈاکٹر نریش کے افسانوں پر ایک نظر ۴۱)

- اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ رینو بہل متوازن اور معتدل سوچ کی مالک ہیں جو جانبداری سے کام نہیں لیتیں اور ایک سچے فنکار کا یہی وصف نمایاں ہے۔

(ڈاکٹر رینو بھل 'آنکھوں سے دل تک' کے آئینے میں ۹۶)

- کفایت اللہ انصاری کے تقریباً تمام افسانے چونکا دینے والے ہیں۔ ان کو جذبات نگاری پر ملکہ حاصل ہے۔ نفسیات کے گہرے ادراک سے انہوں نے کرداروں کے باطن سے شناسائی حاصل کی ہے۔ (کفایت اللہ انصاری کی افسانہ نگاری، ص ۱۱۱)

- وہ بے باک اور نڈر قلمکار ہے جو بڑوں بڑوں سے پنگا بھی لے لیتا ہے۔ اس کے کچھ افسانے مخصوص شخصیات پر ہیں جو تہذیب یافتہ سماج میں قابل قبول نہیں۔

(لمحوں کی خطاؤں کا محاسب سالک جمیل براڑ ۱۲۴)

- عابد علی خاں ایک صاف ستھرے اور پاکیزہ معاشرے کے کردار تخلیق کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جو ایک نوجوان ادیب کے لیے بہت ہی بڑی بات ہے۔ ان کے افسانوں میں مقصدیت مجروح ہوتی دکھائی نہیں دیتی۔

(خوابوں کی خوشبو پھیلانے والا افسانہ نگار۔ عابد علی خان ۱۲۸)

اسی طرح طنز و مزاح نگاروں پر لکھے گئے مضامین کے جلی سرخیاں (Highlights) بھی پیش کرتا ہوں جن سے ان کے فن کے ادراک میں آسانی ہو سکتی ہے۔

- ''فلک پیما کے طنز کی اپیل کچھ اس قسم کی ہے جیسے کوئی شخص کسی بزم میں ایک لطیفہ سنے مگر اس کی سمجھ میں نہ آئے۔ پھر جب وہ گھر جا کر اپنے بستر پر لیٹے تو یکا یک اسے لطیفے کی لطافت کا سراغ ملے اور وہ تنہائی میں ہنسنے لگے۔ بظاہر بے موقع مگر دراصل نہایت جائز موقع پر۔''

(احمد ندیم قاسمی کا قول بحوالہ میاں عبدالعزیز فلک پیما۔ ایک فکر، ایک طنز نگار ۷۶)

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

➢ پطرس نے مزاح کے تمام حربوں اسلوب، موازنہ، مبالغہ، کردار اور واقعہ سے کام لیا ہے۔ لیکن واقعہ کی مدد سے انہوں نے مزاح پیدا کرنے میں کمال حاصل کیا۔ انہوں نے اپنی مزاح نگاری کو صورت واقعہ پر استوار کیا ہے۔

(پطرس بخاری اور ان کی مزاح نگاری ص۸۱)

➢ شوکت ہمیشہ الفاظ و جملوں کے الٹ پھیر سے کام لے کر مسرتیں بکھیرتے رہتے ہیں۔ آپ کی دوربین اور دقیقہ رس نگاہیں زندگی کے ہر شعبے پر پڑتی ہیں۔ آپ کی تحریروں میں متنوع خیالات کی منظر کشی ہے جن میں آپ نے اپنے فن، ذہنی ترنگ، زندہ دلی، بے قید تخیل آفرینی، رنگین مزاجی، برجستگی، فن کاری، صناعی کی جولانیاں دل کھول کر دکھائی ہیں اور بے تکلف ہو کر دلوں کو مسحور کیا ہے۔ (شوکت تھانوی اور ان کی مزاح نگاری ۸۹)

➢ ان کے دو مجموعے میری نظر سے گزرے ہیں۔ اوٹ پٹانگ اور لغویات۔ ان دونوں کتابوں کے مطالعے سے یہ حقیقت واشگاف ہوتی ہے کہ مصنف نے اپنی ساری عمر کے ہر لمحے سے خوشیاں چرائی ہیں اور اس کا عرق تیار کر کے ہمارے روبرو پیش کیا ہے۔

(مختار ٹونکی کی مزاح نگاری ۹۹)

➢ ڈاکٹر بیتاب علی پوری نام ہی کے بیتاب نہیں بلکہ مضمون میں بھی بے تاب ہو جاتے ہیں۔ ان کے اندر کا طنز نگار بسمل پرندے کی مانند پھڑ پھڑانے لگتا ہے اور اس کے مداوا کے لیے فریاد کرتا ہے۔ طنز و مزاح نگار کا قہقہہ اس وقت فضا میں گونج پیدا کرتا ہے جب اس کے آنسو خشک ہو جاتے ہیں۔ (ڈاکٹر بیتاب علی پوری بحیثیت طنز و مزاح نگار، ۱۰۷)

مضمون 'افسانہ کیا ہے' میں تنقید نگار نے افسانے کی مبادیات پر روشنی ڈالی ہے مگر چونکہ افسانہ ایک سو سال میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے، انہوں نے اس کی ارتقائی منزلوں کو نظر انداز کیا ہے۔ گاندھی جی کے نظریۂ تعلیم، کو ایک چھوٹے سے مضمون میں سمونا دریا کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہے۔ بنیادی تعلیم کے نظریہ باز، گاندھی جی نے اپنی مٹی کی مجبوریوں پر نظر رکھ کر اس نظریہ کو پیش کیا تھا مگر افسوس ان کا یہ نظریہ سامراجی نظام تعلیم کے سامنے دم توڑ گیا۔ ڈاکٹر انصاری نے گاندھی جی کے نظریے کا خاکہ کھینچنے کی حتی المقدور کوشش کی ہے۔ اقبال کی شاعری پر تو آئے دن کچھ نہ کچھ لکھا جا رہا ہے تاہم انصاری صاحب کا اقبال پر لکھا ہوا مضمون ان کی شاعری کے تناظر میں ہماری اپنی ذمہ داریوں کی نشاندہی کرنے میں

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

کامیاب ہوا ہے۔ گورو ہرگوبند جی پر لکھے گئے مضمون میں رائٹر نے ان کی سوانح اور اس وقت کے حالات پر مختصر روشنی ڈالی ہے اور اس رہنما کی عظمتوں سے اردو قارئین کو روشناس کرایا ہے۔

شاعروں پر لکھے گئے مضامین کی جلی سرخیاں:

● **سردار پنچھی** روح کو تڑپانے والے شاعر، ۱۲ شعری مجموعوں کے خالق جن کا کلام ایک گلستان کی مانند ہے۔ چند اشعار:

ے میری شاعری ہے ندی کی روانی — کسی جھیل کا ٹھہرا پانی نہیں ہے
ے کٹی ہوں زبانیں لبوں پہ ہوں تالے — ادیبوں کے پھر بھی قلم بولتے ہیں
ے اک سمادھی پر تھا میلہ سائے میں سنگین کے — ہم بہت تھے دور بس آنسو چڑھا کر آ گئے
ے وعدوں کا اسے اپنے نہیں پاس ذرا بھی — محبوب مرا وقت کی سرکار لگے ہے

● **انجم قادری** (مجموعہ کلام شہر وحشت) روایت کے پاسدار بھی ہیں اور جدیدیت سے ہم کنار بھی۔ نمونۂ کلام:

ے میرا تو عزم ہے گھر گھر دیے جلانے کا — ہوا کا اور ارادہ ہے کیا کیا جائے
ے بے حسی پھیل گئی روح کے اندر کیسی — اب ہے جینے کی طلب اور نہ مرنا چاہوں
ے وضع داری کا مجھے پاس ادب ہے ورنہ — کرچیاں بن کے ہر اک سمت بکھرنا چاہوں

● **ڈاکٹر رفیع** اچھے اسٹیج ایکٹر، ڈرامہ نگار اور تجربہ کار ناظم ہیں۔ اس کے ساتھ ہی بہت اچھے شاعر بھی ہیں۔ ان کے یہاں موضوعات کی بوقلمونی، خوبصورت احساسات کی فراوانی بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان کا ایک شعر اور ایک ماہیا ملاحظہ فرمائیں:

ے بے لباسی کی اذیت کو چھپانے کے لیے — لال پیلی نیلی کاریں اوڑھ کر گھومیں گے سانپ
ے دعویٰ بھی نہیں کوئی / جس راہ سے ہم گزرے / اگزرا بھی نہیں کوئی (ماہیا)

● **عزیز بگھروی** خارجی تجربات، متنوع موضوعات اور زندگی کے وژن سے ان کی شناخت قائم ہوئی ہے۔ نمونۂ کلام:

ے یوں تو دیدہ ور بھی ہے اور صاف کردار بھی — آدمی ہے کب بہک جائے بھروسہ کچھ نہیں
ے قاتلوں پر نہ کیا تبصرہ کوئی تم نے — مرنے والوں پہ تو کی مرثیہ خوانی برسوں
ے پیدا کیا گیا ہوں تو مٹایا بھی جاؤں گا — میرا وجود میرے [illegible]

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ے اس عہد ریا کار سے اللہ بچائے — اب خود سے بھی ملتے ہیں تو ہم سوچ سمجھ کے

● **خالد کفایت** مصور غم ویاس، داخلی احساسات کا غماز، روایت اور جدیدیت کا سنگم۔ ان کی شاعری میں رمزیت اور استعارات بھی جا بجا ملتے ہیں۔

ے سچ قتل ہو رہا تھا اجالوں کا شہر میں — میں چیختا رہا سرحد شب پر کھڑا ہوا

ے جب زندگی رہن غم ذات ہوگئی — ہر رہ گزر پہ خود سے ملاقات ہوگئی

ے اس قدر بے چہرہ کر ڈالا غموں کی دھوپ نے — ایک بہروپ مجھ کو روز ہی بھرنا پڑا

● **حاجی انوار احمد خان تشنہ** سیاست دان بھی ہیں اور اچھے شاعر بھی۔ غریب عوام کے غم میں شریک رہتے ہیں اور حق وصداقت کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔

ے غم زندگی سے نگاہیں ملا کر — اگر پھر یونہی مسکراؤ تو جانیں

ے کتنے جلتے ہوئے منظر ہیں نگاہوں میں کہ اب — بستیاں، شمع جلاتا ہوں تو ڈر جاتی ہیں

ے بک رہی ہیں عصمتیں تہذیب کے بازار میں — آج ہیں اہل ہوس ماحول پر چھائے ہوئے

● **ڈاکٹر ریاض خلجی** نے احترام حسن کے ساتھ وقارِ عشق کو بھی ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ نمونۂ کلام۔

ے کون جانے وہ حالات کا مارا انسان — بزم احباب سے کیا سوچ کے تنہا نکلا

ے رودادِ غم عشق رقم کرتے رہیں گے — ہم خونِ جگر نذر قلم کرتے رہیں گے

ڈاکٹر انوار احمد انصاری کی زیر نظر کتاب انتقادیات میں ایک گراں مایہ اضافہ ہے۔ ڈاکٹر انصاری کے یہاں معروضیت بھی ہے اور تجزیاتی فکر وعمل بھی، اس لیے تنقید کا میلان ان کی طبیعت سے فطری بات ہے۔ اگر وہ اس میدان پر مزید فوکس کر لیں اور انتقادیات کے جدید رجحانات کا گہرا مطالعہ کریں تو اردو ادب میں اپنی مہر ثبت کر سکتے ہیں۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

تفہیم وتوازن

ڈاکٹر انوار احمد انصاری

'نظر وقدر' کے بعد ڈاکٹر انوار احمد انصاری کی تبصروں پر مبنی دوسری کتاب 'تفہیم وتوازن' حال ہی میں منظر عام پر آچکی ہے۔ ان کے علاوہ موصوف کے دو افسانوی مجموعے (ہتھیار اور زندگی کی تلاش میں)، ایک طنزیہ مضامین کا مجموعہ (ادیب وغریب) اور ایک تحقیقی مقالہ (پنجاب کا طنزیہ ومزاحیہ نثری ادب) شائع ہو چکے ہیں۔ اپنے فن کے بارے میں خود ہی فرماتے ہیں:۔

''میری ادبی زندگی کا چشمہ طنز ومزاح کے بطن سے پھوٹا۔ طنز ومزاح اور افسانے لکھنے کا شوق بھی ساتھ ساتھ پروان چڑھتا رہا اور میری تخلیقات اس عرصہ میں مختلف النوع اخبارات وادبی رسائل میں شائع ہوتی رہیں۔ میں بنیادی طور پر نثر نگار ہوں لیکن ذائقہ بدلنے کے لیے تھوڑی بہت شاعری بھی کر لیتا ہوں۔''

زیر نظر مجموعہ میں اکاون تصانیف پر کیے گئے تبصرے شامل ہیں۔ ان تبصروں کی عمدگی اس بات سے ثابت ہوتی ہے کہ پروفیسر ساحل احمد جیسے برگزیدہ قلمکار نے ان کے تبصروں کو سراہا ہے۔ اشرف محمود نندن، مدیر پرواز ادب ان تبصروں کے بارے میں پیش لفظ میں یوں رقم طراز ہیں:

''میں شروع سے ہی تحقیقی وتنقیدی بصیرت کا قائل ودلدادہ ہوں۔ ڈاکٹر انصاری کا تنقیدی وتخلیقی شعور تبصرہ کرتے وقت کتاب کا مکمل جائزہ اور تعارف پیش کر دیتے ہیں۔

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس لال کنواں، دھلی۔ ۱۱۰۰۰۶ سن اشاعت: ۲۰۱۰ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ان کی طرف سے کیا گیا تبصرہ مختصر اور جامع اور عرق ریز ہوتا ہے۔''

ڈاکٹر انصاری نے جن کتابوں پر تبصرے کیے ہیں اُن میں شاعری، افسانوں، طنز و مزاح اور تنقیدی مضامین کے مجموعے، ادب اطفال اور تحقیقی مقالے سبھی شامل ہیں جو ان کی علمیت اور متنوع دلچسپی کی دلیل ہے۔ ان میں ترقی پسند تحریریں بھی ہیں اور جدیدیت پسند تحریریں بھی۔ صاف ظاہر ہے کہ ڈاکٹر انصاری کو اُردو کے مختلف اصناف پر کافی دسترس ہے اور وہ بے لاگ و لپٹ تصانیف پر اپنے تاثرات رقم کرتے ہیں۔ ان کے تبصروں میں گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی۔ اردو زبان پر ان کا عبور اور ان کے مزاج کی بزلہ سنجی سونے پر سہاگہ کا کام کرتی ہیں۔ شعری مجموعوں کے حوالے سے انہوں نے شاعروں کا چیدہ چیدہ کلام بھی درج کیا ہے جس کے چند نمونے یہاں پر درج کرتا ہوں۔

ے جسم تو خاک ہے خاک میں مل جائے گا　　میں بہر حال کتابوں میں ملوں گا تم کو

(ھوش نامہ ص ۲)

ے سسکتی وادیاں کہتی ہیں دیواروں سے　　شرارے بن کے برستے ہیں اب چنار کے پھول

(دل کی دنیا / دل کاشمیری ۴۷)

ے روشنی دل کی ضرورت ہے مگر اس کے لیے　　کسی بستی میں کوئی گھر نہ جلایا جائے

(میں چپ رہی / کسم پار اشر ۸۶)

ے مندر کبھی مزار پر بھوکی پیاسی سانجھ　　ایک کھلونے کے لیے در در بھٹکی بانجھ

(ھم کتنے ھاتھوں بکے /
بھگوان داس اعجاز ۳۵)

'تفہیم و توازن' میں شامل اکثر و بیشتر تصانیف کے مصنفین زیادہ تر پنجاب سے تعلق رکھتے ہیں تاہم انوار احمد انصاری نے ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ادیبوں جیسے بھگوان داس اعجاز، پروفیسر ساحل احمد، سردار پنچھی، پرتپال سنگھ بیتاب، ڈاکٹر سیفی سرونجی، عطا عابدی، انوری بیگم، معین الدین عثمانی اور راقم التحریر کی کتابوں پر بھی بڑی دقیقہ شناسی سے تبصرے مرحمت فرمائے ہیں۔ ان کے بیشتر تبصرے پرواز ادب پٹیالہ کی زینت بنتے رہے ہیں۔ انوار احمد انصاری کی تنقیدی بصیرت کو دیکھ کر مجھے ان سے کافی امیدیں ہیں۔

❖ ❖ ❖

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

بکھرے شیرازے

ـــــ محمد توفیق خاں

مالوہ، ٹونک خاص کر سرونج اُردو ادب کا گہوارہ رہ چکا ہے۔ البتہ یہاں کے قلمکاروں کو نثر کی جانب کم رغبت رہی ہے جس کی وجہ سے نہ تو کوئی مستند تذکرہ منصۂ شہود پر آسکا اور نہ ہی کسی شاعر پر تحقیقی کام ہوسکا۔ اتنا ہی نہیں، اقتصادی حالات کے سبب کئی شعراء کا کلام بھی تلف ہو چکا ہے۔ تاہم حال ہی میں چند محققوں نے، جن میں محمد توفیق خان، مختار شمیم اور ڈاکٹر سیفی سرونجی شامل ہیں اس طرف توجہ دی اور اس علاقے کی اردو کے تئیں خدمات قلم بند کیں۔

۱۹۲۵ء میں جنمے محمد توفیق خاں نے ایم اے بی ٹی کی ڈگریاں حاصل کر کے نائب تحصیلداری پر معلمی کے پیشے کو ترجیح دی جو آج کل کی مادی دنیا میں حیران کن بات لگتی ہے۔ موصوف آٹھ کتابوں کے مصنف و مؤلف ہیں۔ (۱) جگن ناتھ آزاد۔ اردو ادب کی آبرو (۲) مختار شمیم ایک تاثر (۳) علیم شناسی (۴) گاؤں کا مسافر سیفی سرونجی (۵) سیفی سرونجی۔ شخصیت اور فن (۶) مشاہیر کے خطوط سیفی سرونجی کے نام (۷) گنبد خضراء (نعتیہ کلام) سیفی سرونجی، اور (۸) ناؤ سمندر موجیں (شعری مجموعہ) سیفی سرونجی۔ ان کتابوں کے علاوہ صلاح الدین نیّر کے اداریے، سیفی سرونجی اور گدی قبیلہ، اور کچھ حقیقت، کچھ فسانہ، زیر ترتیب ہیں۔

'بکھرے شیرازے' محمد توفیق خان کے چوبیس تنقیدی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے جو انہوں نے مختلف اوقات پر رسالوں کے لیے لکھے ہیں۔ گویہ مضامین مختلف ادیبوں کے کارناموں پر روشنی ڈالتے

ناشر: انتساب پبلی کیشنز، سرونج، ایم پی۔ 464228 سن اشاعت: ۲۰۰۸ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ہیں تاہم اکثر و بیشتر مضامین سرونج اور اس کے گردونواح سے تعلق رکھنے والے ادیبوں پر فوکس کرتے ہیں۔ پہلا مضمون مرمت خان مرمتؔ پر رقم کیا گیا ہے جو میر تقی میرؔ کے زمانے میں سرونج میں گمنامی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کا دیوان تو دستیاب نہ ہو سکا البتہ نادم سیتاپوری نے ان کے بارے میں پاکستانی مجلّہ 'نقوش' میں ذکر کیا ہے۔ ان کے چند اشعار ذیل میں درج ہیں۔

- گلہ میں کس سے کروں تیری بے وفائی کا — رکھے نہیں ہے جو تو پاس آشنائی کا
- نرگس حیراں، سرو لرزاں، لالہ پرخوں رشک سے — سن کے اس کا حسن ہیں گے یہ پریشان سب کے سب
- یہ سیلِ اشک آنکھوں سے مری کب تک رہے جاری — برابر رات دن چشمے سے پانی کب تلک نکلے

'سرونج کے شعری مجموعوں پر ایک نظر' اور 'دبستان سرونج کی شعری تخالیق پر ایک نظر' میں مضمون نگار نے نامور اور گمنام دونوں طرح کے شاعروں پر اپنے تاثرات قلمبند کیے ہیں۔

- اک پرتوِ ظلمت کے سوا کچھ نہیں دنیا — کہنے کے لیے جلوہ گہہ شمس و قمر ہے
(ناطقؔ مانوی)
- غم نہیں شامِ محبت کی سحر ہو کہ نہ ہو — شمع امید بہرحال جلائے رکھیے
(دانشؔ مالوی)
- یہ کوئی سانحہ ہے، یا کہ معراجِ محبت — ترا دامن جھٹکنا مرا قدموں سے پٹ جانا
(رازؔ سرونجی)
- پرواز کی ضد چھوڑو شاہین سے مت اُلجھو — جان اپنی گنوا دوگے دو چار اڑانوں میں
(ضیاءؔ اسدی)
- میں ہوں سر سے پا تک زہر بھرا ساگر — خود ہی اپنے جسم کو ڈستا رہتا ہوں
(دلکشؔ ساگری)
- کہہ دو کہ ہوشیار رہیں پروانِ شوق — راہ وفا میں سینکڑوں پتھر بھی آئیں گے
(کلیمؔ سرونجی)
- نازک سا آئینہ تھا دکھانے چلا تھا میں — سارا نگر اُبل پڑا پتھر لیے ہوئے
(رؤف جاوید)
- میں اپنے آئینہ کو توڑ دوں یہ بھی نہیں ممکن — کہ اس میں صرف میرا ہی نہیں تیرا بھی چہرہ ہے
(مختار شمیم)

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

21

ے بجھ گئے غالباً امید کے سارے ہی چراغ
ابھی کچھ دیر ہوئی ایسا اندھیرا تو نہ تھا
(خالد محمود)

ے جیون جینا کٹھن ہے وِش پینا آسان
انسان بن کر دیکھ لو او شنکر بھگوان
(شاہد میر)

ے پھر کرنا آپ میرے گناہوں پہ تبصرے
پہلے زمیں پہ کوئی فرشتہ تو دیکھیے
(سیفی سرونجی)

ے تم جا کہاں رہے ہو سنو میر کارواں
لے جاؤ میرے پاؤں کے چھالوں سے مشورے
(ظفر سرونجی)

ے یہ بھی اعجاز ہے آپ کے نطق کا
بد زبانوں کو طرز کلام آگیا
(غازی ولی احمد)

ے اے میر انہیں خط کیسے لکھوں اب ہاتھ مرے تھراتے ہیں
یہ سادہ کاغذ دے دینا، پیغام زبانی کہہ دینا
(میر عرفانی)

ے خدارا امن کے دریا کی جانب دیکھیے ورنہ
قیامت خیز طوفاں سے کنارے ڈوب جائیں گے
(خادم طاہری)

ے غم سے سلگ رہے ہیں دل وجاں تو کیا ہوا
دنیا کے سامنے تو ہیں چہرے سجے ہوئے
(اسمٰعیل ذبیح)

ے عکس در عکس کئی چہرے چھپے ہیں مجھ میں
مرے آئینہ میں حیرانی ہی حیرانی ہے
(نفیس سرونجی)

جس شہر تمنا کی تجھے فکر ہے اشرف
اس شہر نگاراں میں کہیں اپنا بھی گھر ہے
(اشرف سرونجی)

زیر نظر تصنیف میں محمد توفیق خاں نے کئی نامور شعراء اور نثر نگاروں پر روشنی ڈالی ہے۔ نام ہیں۔ دانش مالوی، دلکش ساگری، ڈاکٹر مختار شمیم، خالد محمود، شاہد میر، سیفی سرونجی، جوش ملیح آبادی، محمد ایوب واقف، شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ، بشیر بدر، شعری بھوپالی، کوثر صدیقی، منور رانا، گلشن کھنہ اور ساحر شیوی۔ حضرت مفتی عبدالمجید خاں صاحب کی شخصیت پر لکھی گئی محمد سرور علی خاں خوش نفس کی کتاب پر لکھا گیا تبصرہ بھی

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

شامل اشاعت ہے۔اس کے علاوہ مضمون نگار نے یادوں کی پرچھائیاں، کے تحت وقار فاطمی اور فضل تابش کی تربتوں پر عقیدت کے پھول چڑھائیں ہیں۔مذکورہ شاعروں کے چند اشعار پیش کر رہا ہوں۔

ے اجنبی دیس بھی ہے کوئی پرایا بھی نہیں — میں کہ اس بھیڑ میں تنہا بھی ہوں، تنہا بھی نہیں

(دلکش ساگری)

ے اپنی شوریدہ سری دیوانگی آوارگی — قید ہستی سے جو نکلے رنگ و بو بنتے گئے

(مختار شمیم)

ے روٹھتا مجھ سے بھی لڑتا کوئی — کاش ہوتا اپنا یہاں کوئی

(خالد محمود)

ے دامن خزاں سے ہم نے چھڑا تو لیا مگر — پتوں کے ٹوٹنے کی صدا ساتھ ہوگئی

(شاھد میر)

ے لوگ ٹوٹ جاتے ہیں ایک گھر بنانے میں — تم ترس نہیں کھاتے بستیاں جلانے میں

(بشیر بدر)

حسن سے نظریں ملائی تھیں، بس اتنا یاد ہے — پھر جو دیکھا لٹ چکا تھا کاروانِ زندگی

(شعری بھوپالی)

ے برق گرنے کا چمن میں یہ کیسا انداز ہے — چند شاخوں کے ہمیشہ آشیاں محفوظ ہیں

(کوثر صدیقی)

شخصیات سے ہٹ کر محمد توفیق خان نے عام موضوعات جیسے 'صنف انانیت اور ہمارے شاعر'، 'ہمارے فن کار اور شراب.....' اور 'زبان وادب میں اضافہ کا راز' پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔'ایک اہم خط نعیم کوثر کے نام' جو کتاب میں شامل کیا گیا ہے میں بھی توفیق خاں کے فکر کی عکاسی ہوتی ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے زندگی سے وابستہ کچھ یادگار تصویروں سے بھی اس تصنیف کو مزین کیا ہے۔

زبان وبیاں کی روانی، دلکش اسلوب، شخصیات سے قربت اور واردات کا ذاتی مشاہدہ مذکورہ تصنیف کو چار چاند لگاتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ موصوف کی یہ کوشش آئندہ آنے والی نسلوں کی رہنمائی کرنے میں اہم رول نبھائے گی۔

❖ ❖ ❖

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ادبی معاصرین کا مطالعہ

ـــــ معین الدین عثمانی

معروف افسانہ نگار معین الدین عثمانی، جن کے دو افسانوی مجموعے (متحرک منظر کی فریم اور نجات) اور ایک مراٹھی کہانیوں کا ترجمہ (صورت حال) پہلے ہی شائع ہو چکے ہیں، اب انتقادیات کے میدان میں اُتر آئے ہیں۔ زیر نظر کتاب میں ۴ مضامین، ۵، تاثرات، ۴ شخصیات پر خاکے، ۵ مطالعات، ۱۰ کتابوں پر تبصرے اور ایک سفر نامہ شامل کیا گیا ہے جو خود ہی موضوعات کے تنوع کی دلیل ہے۔

علاقۂ خاندیش خصوصاً جلگاؤں کے ادب اور ادیبوں پر عثمانی نے خاص طور پر فوکس کیا ہے جو ایک خوش آئند بات ہے کہ اس طرح ان گوہروں پر نظر پڑتی ہے جن کی آواز ادب کے نقار خانے میں شورش تشہیر کے سبب دب کر رہ جاتی ہے۔

مضمون 'خاندیش میں اردو افسانہ' میں جہاں عثمانی نے اس علاقے کے افسانہ نگاروں پر کسی تعصب کے بغیر روشنی ڈالی ہے، وہیں 'جلگاؤں ماضی و حال کے آئینہ میں' میں اس شہر کی تواریخی اور ادبی اہمیت کو بھی ذہن نشین کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی طرح 'اردو مدارس میں ادب اطفال کی سرگرمیاں' کے تحت ادب اطفال کی بنیادی ضرورتوں، خاص کر اردو اسکولوں کے حوالے سے، پر بحث کی گئی ہے جبکہ 'اردو صحافت اور اخلاقیات' میں عثمانی نے صحافتی قدروں کو بحال کرنے پر زور دیا ہے۔

ناشر: میمونہ عثمانی، ۲۶۴، شاہو نگر جلگاؤں (مہاراشٹر) سن اشاعت: ۲۰۰۹ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

تاثرات کے تحت 'ادب میں ذہانت اور شہرت پسندی کا مسئلہ' 'کیا ۷۰ء کے بعد کا ادب ماقبل ادب سے کمتر ہے؟'، 'شعراء کی نئی نسل کہاں ہے؟' اور 'کرشن چندر اور چند معروضات'، جیسے موضوعات پر اپنے خیالات کا بے ٹوک اظہار کیا ہے۔ جیسا کہ ظاہر ہے یہ موضوعات عصری تقاضوں کے عین مطابق ہیں اور اپنی جلو میں بہت کچھ سمائے ہوئے ہیں۔

باب شخصیات میں ناظر انصاری، ساحر ادیبی، فاروق اعظمی، اکبر رحمانی، حمید سہروردی، احمد عثمانی، نذیر فتح پوری، سلیم انصاری، شکیل ابن شرف، قمر ہاشمی، رئیس احمد قتیل، مقیت اعظمی، جاوید ندیم اور صغیر احمد پر تنقید نگار نے اپنے تاثرات قلمبند کیے ہیں۔ اس باب میں جن شخصیات کا انتخاب کیا گیا ہے وہ زندگی کے مختلف پہلوؤں سے تعلق رکھتے ہیں مگر جو بات ابھر کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ تنقید نگار نے ان کو بہت قریب سے دیکھا ہے، جانچا ہے اور پرکھا ہے۔ ان میں سے چند ایک شاعر بھی ہیں جن کے کچھ اشعار یہاں درج کرتا ہوں:

ے سر چھپائے گی کہاں اب ڈار پر چڑیوں کی نذیر
سنتے ہیں پیڑوں پہ سانپوں کا بسیرا ہوگیا

(نذیر فتح پوری)

ے ریل کی کھڑکی میں ہلتے ہاتھ گم ہو جائیں گے
ذہن کے محور پہ چہرہ گھومتا رہ جائے گا

(سلیم انصاری)

ے روشن جب تک ذہنوں کی قندیل نہ ہوگی
اچھی باتوں کی ہرگز ترسیل نہ ہوگی

(شکیل ابن شرف)

ے آنکھوں کے آئینوں میں وہ منظر ہی خوب تھے
اڑ کر نہ جانے سارے پرندے کہاں گئے

(قمر ہاشمی)

ے منزلوں کے ساتھ ہر گام پر خطرہ بھی ہے
میرے ساتھ آنے سے پہلے تو نے یہ سوچا بھی ہے

(رئیس احمد قتیل)

ے شیشے کا ہو مکان یا پتھر کا کوئی گھر
ہر ایک قید اپنی ہی پرچھائیوں میں ہے

(مقیت اعظمی)

ے رکھا قدم جہاں بھی نیا مسئلہ ملا
جیون کا راستہ ہمیں الجھا ہوا ملا

(جاوید ندیم)

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

باب چہارم (مطالعات) میں بھی نقاد نے 'یادوں کے چراغ' (خود نوشت/ فاروق اعظمی) 'ٹوٹی چھت کا مکان'، (افسانے/ ایم مبین)، 'ذرا سی کمی' (افسانے/ بانو سرتاج)، 'اگلی صدی کے موڑ پر' (افسانے/ عظیم راہی) اور لمحوں کا سفر (شاعری/ نذیر فتح پوری) پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ انہوں نے نہ صرف فن بلکہ فنکار پر بھی بھرپور روشنی ڈالی ہے۔

جہاں تک کتابوں پر تبصروں کا تعلق ہے، معین الدین عثمانی نے ان تصانیف کا غور سے مطالعہ کرنے کے بعد ہی ان پر قلم اٹھایا ہے۔ یہ تبصرے انفرادی پسندیدگی کے بجائے معروضیت اور غیر جانبداری کی مثال پیش کرتے ہیں۔ یہاں بھی نقاد نے نہ صرف تصنیف بلکہ مصنف کے ساتھ بھی پورا انصاف کرنے کی کوشش کی ہے۔ البتہ آخر میں جو ایک سفر نامہ 'سفر ہے شرط مسافر' کتاب میں شامل کیا گیا ہے، کچھ زیادہ متاثر نہیں کرتا۔ اس میں سفر نامے کی مبادیات سے انحراف کیا گیا ہے۔

معین الدین عثمانی کی زبان آسان اور رواں ہے۔ وہ انتقادیات کے کلیشے کا استعمال نہیں کرتے۔ اس لیے قاری کو ان کی بات سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔ مجھے امید ہے کہ آئندہ بھی وہ اردو ادب میں یوں ہی نگینے جڑتے رہیں گے۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

جاں نثار اختر۔ حیات وفن

ڈاکٹر کشور سلطان

ڈاکٹر کشور سلطان نے جبل پور یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے 'جاں نثار اختر۔ حیات وفن' مقالہ تحریر کیا تھا جو پہلی بار نسیم بک ڈپو نے ۱۹۷۷ء میں کتابی صورت میں منظر عام پر لایا۔ اب اس مقالے کا دوسرا ایڈیشن حال ہی میں شائع ہو چکا ہے۔ اس دوران ڈاکٹر کشور سلطان، جن سے اردو ادب کو بہت ساری امیدیں تھیں، اپنی زندگی کا سفر ادھورا چھوڑ کر راہِ عدم اختیار کر گئیں۔ مختار شمیم نے دوسرے ایڈیشن میں ان کی زندگی کے مختصر کوائف رقم کر کے اپنی بچھڑی ہوئی ہم سفر کو بہترین خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

مقالہ آٹھ ابواب پر مشتمل ہے جن میں جاں نثار اختر کی حیات وسیرت، ان کے عہد کی خصوصیات، ان کی رومانی اور سیاسی نظم نگاری، غزل اور دیگر اصناف سخن میں طبع آزمائی اور اختر کی نثر نگاری پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ مقالے میں اختر کی شائع شدہ تصانیف (سلاسل ۱۹۴۲ء، تار گریباں ۱۹۴۹ء، جاوداں ۱۹۵۵ء، نذرِ بتاں ۱۹۵۹ء، گھر آنگن ۱۹۷۱ء، خاکِ دل ۱۹۷۴ء، ہندوستان ہمارا۔ قومی شاعری، پچھلے پہر ۱۹۷۵ء، ہزاروں باتیں۔ ادبی لطائف جو ہفت روزہ بلٹز میں 'یادیں' کے تحت شائع ہوتے تھے) اور غیر شائع شدہ مواد خصوصاً خطوط وغیرہ کا احاطہ کیا گیا ہے۔ جاں نثار کی کئی تحریروں کا ترجمہ فارسی، انگریزی اور روسی زبانوں میں بھی

ناشر: ڈاکٹر مختار شمیم، ۱۰، کوئنس ہوم، احمد آباد،
پلیس روڈ، کوہ فضا بھوپال ۴۶۲۰۰۱
سن اشاعت: جلد دوم ۲۰۰۸ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

شائع ہو چکا ہے۔

سادات گھرانے سے تعلق رکھنے والے جاں نثار اختر ۸ر فروری ۱۹۱۴ء کو گوالیار میں پیدا ہوئے حالاں کہ ان کا آبائی وطن خیر آباد ضلع سیتاپور (اودھ) ہے۔ اختر نے ابتدا تو رومانی شاعری سے کی مگر جستہ جستہ ترقی پسند تحریک کی طرف مائل ہو گئے اور پھر صفِ اول کے ترقی پسند شعراء میں گنے جانے لگے۔ جوش نے انہیں "اردو شاعری کا اختر تابندہ" کہا ہے۔ اس کے باوجود حسن پرستی، رومان اور جمالیات کا دامن انہوں نے کبھی نہیں چھوڑا۔ بقول کشور سلطان "جاں نثار اختر ایک ایسا ترقی پسند شاعر ہے جو حسن و عشق کے روایاتی معاملات کو بھی اسی تیور سے بیان کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ عشق بے نیاز رسم و راہ ہوتا ہے اور وہ قید و بند سے آزاد ہے۔ وہ تخت و تاج کو بھی قربان کر دیتا ہے۔ شاہی تزک و احتشام سے مرعوب نہیں ہوتا اور شہنشاہی جاہ و جلال کے سامنے سر خم نہیں کرتا" (ص ۳۲۰)۔ یہ بھی سچ ہے کہ اختر کبھی "کھل کر اعتراف محبت بھی نہیں کرتے"۔ صفیہ ان کے بارے میں فرماتی ہیں۔ "میرا اندازہ ہے کہ لطیف اور پاکیزہ حسن سے زیادہ انہیں شوخ حسن (Voluptuous beauty) متاثر کرتا ہے۔ جس کے معاملے میں وہ روحانی لطافت سے زیادہ حواس کی کیف کے قائل ہیں"۔ (ص ۸۷)۔ جاں نثار اختر نے زندگی کے آخری پڑاؤ پر جدید تحریک سے بھی استفادہ کیا۔

اختر کی شاعری کے بارے میں مقالہ نگار کے خیالات مندرجہ ذیل اقتباسات سے ظاہر ہوتے ہیں۔

- جاں نثار اختر نے نظم اور غزل دونوں میں اپنے لطیف اور نازک احساسات کو اپنے شاعرانہ خلوص، اپنے شیریں تغزل، اپنے ہلکے ترنم اور اپنی مدھم مگر دل نشین آواز میں پیش کیا ہے۔ ان کی شاعری میں اچھے اسلوب اور سچے خیالات کا امتزاج ہے۔
- "بنیادی طور پر جاں نثار اختر عشق و محبت کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کا محور بالعموم یہی جذبہ رہا ہے۔ اگر انہوں نے انقلاب کے گیت بھی گائے ہیں تو صرف دنیا کے امن و عافیت کی خاطر کیونکہ امن کی پر کیف فضا میں محبت کا پودا پروان چڑھتا ہے۔"
- اختر کا مسلک زندگی سے گریز اور فرار نہیں ہے۔ وہ زندگی کی مشعل کو حوادث کے طوفانی تھپیڑوں میں جلائے رکھنے کا عزم جواں رکھتے ہیں۔ مایوسی و بیزاری ان کی ہمت پست نہیں کرتی۔ لیکن تقاضائے بشری سے وہ بھی کبھی کبھی قدرت کے بھیانک مذاق سے کراہ اٹھتے ہیں۔ اور وقتی طور پر انہیں بھی بیزاری کا احساس ہوتا ہے۔"

؎ پینے کو کیا، پی لوں مگر جب بھی اٹھاتا ہوں شراب

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ے کہتا ہے چپکے سے کوئی پینا نہیں ہے زندگی
ے یوں زندگی سے بھاگ کر جینا نہیں ہے زندگی

جاں نثار اختر کی نظموں میں دردمندی، شوخی، سادگی، صداقت، اپنائیت، معقولیت اور رجائیت سبھی کچھ ملتا ہے۔ غزل کے بارے میں ان کا رویہ مثبت تھا جو ان کے دور کے دیگر شاعروں سے قدرے ہٹ کر تھا۔ غزل گوئی انہیں ورثے میں ملی تھی اس لیے انہوں نے اس صنف کی آبیاری خونِ جگر سے کی۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں عشق و محبت کے علاوہ کئی عصری موضوعات بھی برتے ہیں۔

فلسفہ:

ے زندگی کیا ہے مسلسل شوق و پیہم اضطراب
ہر قدم پہلے قدم سے تیز تر رکھتا ہوں میں

سماجی ناانصافی:

ے کیا تماشا ہے کہ غنچے تو ہیں پژمردہ و زرد
خار آسودہ و شاداب نظر آتے ہیں

بے ثباتی:

ے فرصت کار فقط چار گھڑی ہے یارو
یہ نہ سوچو کہ ابھی عمر پڑی ہے یارو

رجائیت:

ے اپنے تاریک مکانوں سے تو باہر جھانکو
زندگی شمع لیے در پہ کھڑی ہے یارو

بلند حوصلگی:

ے ہم نے ان تند ہواؤں میں جلائے ہیں چراغ
جن ہواؤں نے الٹ دی ہیں بساطیں اکثر

نقلی چہرے:

ے وطن سے عشق، غریبی سے بیر، امن سے پیار
سبھی نے اوڑھ رکھے ہیں نقاب جتنے ہیں

سیاست:

ے کوئی آسودہ نہیں اہل سیاست کے سوا
یہ صدی دشمن ارباب ہنر لگتی ہے

چاہت:

ے ہم سے بھاگا نہ کرو دور غزالوں کی طرح
ہم نے چاہا ہے تمہیں چاہنے والوں کی طرح
ے گنگناتے ہوئے در آ کبھی ان سینوں میں
تیری خاطر جو مہکتے ہیں شوالوں کی طرح

جہاں تک جاں نثار اختر کی سیاسی شاعری اور سیاسی شعور کا تعلق ہے، وہ کبھی کسی پارٹی کے رُکن نہیں

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

بنے البتہ ان کی شاعری پر مارکسی نقطہ نظر کی چھاپ واضح طور پر ملتی ہے۔ ان کی بہت ساری نظموں کے موضوعات طبقاتی کشمکش اور جدلیات پر مبنی ہیں۔ بقول کشور سلطان۔ ''وہ انقلاب کے نقیب تھے اور ان کے گیتوں میں بغاوت کا آہنگ اور ان کی لے میں شمشیر کی تیزی پیدا ہوگئی۔''

اگر ممکن ہو تو بھی آج رنگین جام کے بدلے لہو کے رنگ میں ڈوبا ہوا پرچم اٹھا ساقی

تو بھی آوقت کے سینے میں شرارہ بن جا

تو بھی اب عرش بغاوت کا ستارہ بن جا

زندگی صرف محبت تو نہیں ہے انجم

جاں نثار اختر نے دوسری اصناف سخن جیسے رباعیات، قطعات، مثنویات، مراثی اور گیتوں کے میدان میں بھی اپنے جلوے دکھائے۔ بقول ندا فاضلی ''گھر آنگن کی رباعیوں میں موجودہ عہد کے زمین و آسمان کو نمایاں طور سے ابھارا ہے۔'' اختر کی مثنویاں جیسے امن نامہ، ساقی نامہ، پانچ تصویریں اور شخصی مراثی جیسے خاموش آواز، خاکِ دل اردو کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔ شخصی مراثی پر رائے ظاہر کرتے ہوئے کرشن چندر فرماتے ہیں کہ ''اردو میں اس نوع کی نظمیں بہت کم کہی گئی ہیں۔

مرثیہ:

ے تجھ کو روؤں بھی تو کیا روؤں کہ ان آنکھوں میں اشک پتھر کی طرح جم سے گئے ہیں میرے

رباعی:

ے یہ راز سمجھ میں نہیں آتا میرے ہر چند اپنا جائزہ لیتا ہوں

جو بات چھپاتا ہوں میں خود اپنے سے وہ بات تجھ سے کیسے کہہ دیتا ہوں

قطعہ:

ے دوست تجھ سے اگر خفا ہوں تو کیا آپ سے بھی تو خود خفا ہوں میں

ے آج تک یہ نہ کھل سکا مجھ پر بے وفا ہوں کہ باوفا ہوں میں

انہوں نے شاعری میں استادی شاگردی کے طریقے کو کبھی روا نہیں رکھا اور فانی کی اس ہدایت پر ہمیشہ عمل کیا کہ ''مذاق سلیم سے بڑھ کر کوئی استاد نہیں۔'' (صفحہ ۱۲۳)

جاں نثار کو شاعری اپنے والد ماجد مضطر خیر آبادی سے، جو ہندی شاعری سے خاص لگاؤ رکھتے تھے،

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ورثے میں ملی۔ مضطر صاحب پر بھی ڈاکٹر کشور سلطان نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے زیر نظر کتاب میں جاں نثار اختر کی زندگی کے مختلف گوشوں مثلاً پیدائش، تعلیم، ادبی ذوق، معاشقے وغیرہ پر کھل کر اظہار خیال کیا ہے۔ مقالہ نگار نے اختر کی شخصیت کا تجزیہ صفیہ کے خطوط اور بیگم فاطمہ زبیر کی تحریروں کے آئینے میں بھی کیا ہے۔ جاں نثار کے کردار کی مضبوطی کو بیاں کرتے ہوئے مقالہ نگار لکھتی ہیں کہ اس نے مالی استحکام کی پرواہ نہ کر کے اشتراکیت کو ترجیح دی اور حمیدیہ کالج کی نوکری سے استعفیٰ دے کر ممبئی کی راہ لی۔ یہی وجہ ہے کہ اختر کی زندگی ناکامی، مجبوری اور خانگی پریشانیوں میں گزری۔ بقول کشور سلطان جاں نثار اختر زندگی میں مذہب کے رول کا اعتراف کرتے تھے اور اسلام پر حتمی عقیدہ رکھتے تھے۔ مگر سیاسی طور پر اشتراکیت، بقائے باہمی اور امن عالمی کے نظریات پر یقین رکھتے تھے۔

ڈاکٹر کشور سلطان اختر کی گیت کاری کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں: ''فلمی شاعری میں جدید رجحانات کو داخل کرنے اور ان گیتوں میں زبان اور فن کی عظمت واحترام کو برقرار رکھنے میں اختر نے کس قدر زبردست کارنامہ انجام دیا ہے۔'' وہ مزید لکھتی ہیں کہ ''اختر کے گیتوں میں فکر ونظر کی گہرائی ہے، رس ہے، سوز وساز ہے، لطافت وپاکیزگی ہے۔

جاں نثار اختر نثر نگاری کے ساتھ طالب علمی کے زمانے سے ہی جڑے رہے۔ ان کے مضامین اور تبصروں سے ان کی انتقادی صلاحیت کا پتہ چلتا ہے۔ انہوں نے واقعات نگاری (ہزاروں باتیں) اور خاکہ نگاری (میرا دوست، میرا مہمان) میں بھی اپنا قلم آزمایا۔ اپنی نثری تحریروں میں انہوں نے شاعری کی مختلف اصناف، ہیئت اور معنی پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو زیر نظر کتاب جاں نثار اختر کی شخصیت اور فن کے مختلف پہلوؤں پر دقیقہ شناسی کے ساتھ تحریر کی گئی ہے۔ ادبی حلقوں میں اس کتاب کی خوب پذیرائی ہوئی ہے جس کا شاہد کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہے۔ آخر میں ڈاکٹر کشور سلطان کے مندرجہ ذیل الفاظ پیش کرتا ہوں جو اختر صاحب کی شخصیت کا آئینہ ہیں۔

> ''جاں نثار اختر محبت اور امن کا شاعر ہے، امن واتحاد، عشق ومحبت کے بعد دوسرا موضوع ہے جو ان کی فکر رسا سے ہم آہنگ ہے اور جسے نظم کرنے میں انہیں مہارت حاصل ہے، امن والی نظموں میں موسیقی کا زیر وبم ایک نیا لطف پیدا کر دیتا ہے۔

❖ ❖ ❖

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

رَاس المال

ـــــ عرفان ترابی

حمد، نعت، منقبت اور مرثیہ اُردو ادب کی روایت کا اہم جزو بن کر رہ گئے ہیں۔ جہاں مسلمان شعرا کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسولؐ کو یاد کریں وہیں غیر مسلم شعرا نے بھی میلاد کی محفلوں، مولود کے جشنوں اور محرم کی مجلسوں میں شرکت کر کے اپنی عقیدت کے پھول چڑھائے ہیں۔ بقول کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ:۔

ہم کسی دن کے ہوں صاحب کردار تو ہیں ہم ثنا خواں شہِ حیدرؑ کرار تو ہیں
نام لیوا ہیں محمدؐ کے پرستار تو ہیں یعنی مجبور پئے احمدؐ مختار تو ہیں
عشق ہو جائے کسی سے کوئی چارہ تو نہیں صرف مسلم کا محمدؐ پر اجارہ تو نہیں ہے

سکھ شعرا کے حمد، نعت، منقبت، سلام، قطعات اور رباعیات کا مجموعہ 'راس المال' عرفان ترابی کی تحقیقی صلاحیت کا مظہر ہے۔ تحقیق کا کام بہت محنت طلب ہوتا ہے۔ ہندوستان کے طول و عرض میں رہنے والے سکھ شعرا کے بارے میں جانکاری حاصل کرنا اور پھر ان کا کلام اکٹھا کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ کتاب کا مواد حاصل کرنے کے لیے مرتب کو کن کٹھنائیوں کا سامنا کرنا پڑا، اس کی طرف انہوں نے پیش لفظ بعنوان 'در رہِ لیلیٰ کہ خطرہاست بسی.....' میں اشارہ کیا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ترابی نے ان سکھ

ناشر: ترابی پبلی کیشنز، سوناواری، کشمیر
سن اشاعت: ۲۰۰۷ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

شعراء کا نہ صرف نمونۂ کلام پیش کیا ہے بلکہ ان کے نقوش حیات بھی درج کیے ہیں۔ ترابی کی اس کوشش کے بارے میں ڈاکٹر عظیم امروہوی فرماتے ہیں:۔

''دراصل عرفان ترابی کی فکر ونظر کا محور وہ ادب ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آل محمدؐ کی مدح وثنا میں تخلیق ہوا ہے اور ان ذوات مقدسہ کی حیات وحالات اور واقعات وتعلیمات پر مشتمل ہے۔'' اس کتاب سے پہلے عرفان ترابی کی مندرجہ ذیل کتابیں بھی منظر عام پر آچکی ہیں۔ (۱) رتہِ اوش (پنڈت شعرا کا کشمیری کلام) (۲) خوننا ب (مسلم شعرا کا کشمیری ارثائی کلام) (۳) نوائے مقتل (سکھ شعراء کا اردو ارثائی کلام) (۴) نوائے سروش (ہندو اور عیسائی شعراء کا اردو کلام)

اپنی اس کوشش کے بارے میں خود عرفان ترابی تحریر کرتے ہیں۔ ''اُردو کے سکھ شعرا نے بھی یہی روش اختیار کی ہے میری سابقہ کتاب 'نوائے مقتل' یا اس نئی کتاب 'راس المال' کے اشعار بہ بانگ دُہل یہ اعلان کررہے ہیں کہ سکھ شعرا کے عقائد بھی مسلم شعرا سے مختلف نہیں ہیں۔ البتہ ایک بات کی وضاحت ضروری ہے کہ شاعری کو مذہب یا مسلک کی آنکھوں سے دیکھنا بدذوقی کی دلیل ہے۔ شاعری جیسا لطیف فن ایک وجدانی کیفیت ہوتی ہے۔ شاعر اپنے فکر وفن اور تخیل میں بالکل آزاد ہے۔ شاعری کے ساتھ اس کا ظاہری مسلک، وضع قطع اور رنگ روپ کو جوڑنا ادب کے ساتھ زیادتی ہے۔'' عرفان ترابی نے زیر نظر کتاب میں سکھ شعرا کے علاوہ برصغیر کے نامی گرامی شعرا کے وہ اشعار بھی درج کیے ہیں جو آل رسولؐ اور معرکۂ کربلا سے تعلق رکھتے ہیں۔ اشعار کے ساتھ ساتھ انہوں نے دین اسلام کے بانیؐ کی سیرت اور اسوۂ حسنہ، حضرت علیؑ، حضرت زینبؑ، امام حسینؑ وغیرہ کے کرداروں پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ جن شعرا کے اشعار کتاب میں درج کیے گئے ہیں۔ ان میں سے چند معروف نام یوں ہیں۔ حافظ شیرازی، شیخ سعدی، عمر خیام، مولانا روم، نظام الدینؒ، امیر خسروؒ، قلی قطب شاہ، ملا وجہی، ولی اورنگ آبادی، میر، غالب، انشا، ناسخ، جرأت، سودا، شاکر ناجی، مولانا ضیا القادری، نظیر اکبر آبادی، مصحفی، آتش، ذوق، ظفر، انیس، دبیر، اقبال، نسیم، میر مہدی مجروح، سراج اورنگ آبادی، مومن، حالی، آزاد، جوش، حسرت موہانی، حفیظ جالندھری وغیرہ۔ ان کے علاوہ غیر مسلم شعرا کے اشعار بھی شامل کیے گئے ہیں۔

چند غیر مسلم شعرا کے منتخب اشعار یہاں پر درج کررہا ہوں۔

؎ پانچ انگلیوں میں یہ حرف زن ہے یعنی کہ مطیع پنجتنؑ ہے

(دیا شنکر نسیمؔ)

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ے آدمؑ سے یہ اوّل ہیں حواؑ سے یہ افضل ہیں زہرائے مطہرؑ کی یہ خاص فضیلت ہے

(مہاراج کشن پرساد شادؔ)

ے ہر سمت زمانے میں اس بات کا ہے چرچا کاشانۂ احمدؐ میں دختر ہوئی پیدا

چہرے سے عیاں جس کی اللہ کی قدرت ہے

(منی لال جوان سندھیلوی)

ے قرآن کا جیسے ذکر ہے عالم میں جابجا ویسے ہی ہے حسینؑ کا دنیا میں تذکرہ

(دلورام کوثریؔ)

ے فارغؔ بھی اے محبّ بہ امید نجات حشر وردِ زباں ہمیشہ رکھے ہے علیؑ علیؑ

(لالہ مکند سنگھ فارغؔ دھلوی)

ے کیا بے نشاں ہوئے رقبیانِ بوترابؑ سنگ مزار ہے نہ چراغ مزار ہے

(نوبہار صابرؔ)

ے اپنے مہمان پہ کب ظلم ہیں ڈھاتے ہندو ہے اسے اپنے سر آنکھوں پہ بٹھاتے ہندو

ے اے بھونؔ کیسے مسلمان تھے شاہؑ کے قاتل دل میں اکثر یہ خیال اپنے ہیں لاتے ہندو

(بھونیش کمار شرما بھون امروھوی)

راس المال میں بارہ سکھ شعرا کے کوائف اور نمونہ کلام شامل کیے گئے ہیں۔ (۱) پورن سنگھ ہنر (پیدائش ۱۹۰۴ء لاہور، وفات ۱۹۹۵)۔ (۲) ڈاکٹر ست نام سنگھ خمار (پیدائش جون ۱۹۳۵ء ساہیوال پاکستان، وفات ۱۹۹۷ء) (۳) سردار پنچھی (پ ۱۹۳۵ء، شیخوپورہ پاکستان) (۴) کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ (پ ۱۹۰۹ء منٹگمری پاکستان) (۵) مہندر سنگھ آزاد گورداسپوری (پ ۱۹۳۳ء ظفروال پاکستان) (۶) شمشیر سنگھ شیرؔ (پ ۱۹۲۶ء راولپنڈی پاکستان) (۷) بلونت سنگھ فیضؔ (پ ۱۹۲۶ء ڈیرہ اسماعیل خان پاکستان) (۸) جوگندر سنگھ پاندھیؔ (پ ۱۹۴۳ء سنگھ پورہ بارہمولہ کشمیر) (۹) نرمل سنگھ رائے پوری (پ ہوشیار پور پنجاب) (۱۰) ہرمہندر سنگھ ہرجی (پ ۳ جولائی ۱۹۳۹ء پٹن بارہمولہ کشمیر (۱۱) سردار گوربخش سنگھ مخمور جالندھری (۱۲) بوادتی اہلیہ بوڈ سنگھ بیرؔ امرتسر۔ ان شعرا کے چند اشعار یہاں درج کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

ے آخری وقت تجھے فکر ہوئی عقبےٰ کی اے ہنرؔ! چاہیے تھا کچھ سروسامان پہلے

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ے دنیا سے عرض اس کو نہ عقبیٰ کا طلبگار
آزاد دوعالم ہے گرفتار محمدؐ

(پورن سنگھ ہنر)

ے کوئی ہو سامنے مشکل تو یا علیؑ کہیے
نظر سے دور ہو منزل تو یا علیؑ کہیے

ے ان منچلوں کے قافلۂ سردار تھے علیؑ
پنہاں تھی جن کی موت میں بھی زندگی کی بات

ے تعظیم کو زہراؑ کی کھڑے ہونا نبیؐ کا
یہ شان وشرف کس کو پیمبرؐ سے ملے گا

ے لکھا پیاسوں نے لمحوں پر قلم سے بھی زباں سے بھی
کہیں تحریر ہے روشن کہیں تقریر زندہ ہے

(ڈاکٹر ستنام سنگھ خمار)

ے اگر دیکھی محمدؐ تو نبوت آپ کی دیکھی
کرم دیکھا، عمل دیکھا، مثالی زندگی دیکھی

ے غموں کا کوئی پربت اپنے آڑے آ نہیں سکتا
محمدؐ چاہیں تو ہر راستہ ہموار ہوجائے

ے نیزے سے اونچا کردیا اسلام کا بھی سر
اپنا ہی سر حسین نے اونچا نہیں کیا

ے جھوٹ کے پردے جلے اور سامنے سچ آ گیا
ایک لاوہ ایسا پھوٹا زینبیؑ تقریر کا

(سردار پنچھی)

ے رسائی شمع تک کرتا ہے پروانہ شعاروں سے
خدا کے نور سے یعنی خدا معلوم ہوتا ہے

ے ہے مرتبہ حضورؐ کا بالائے فہم وعقل
معلوم ہے خدا ہی کو عظمت رسولؐ کی

(کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ)

ے شہر حکمت تھے نبیؐ اور علیؑ دروازہ
ان کے رتبے کا کرے گا کوئی کیا اندازہ

ے نور ایماں کی چمک تھی رخ پر
جرأت وجوش کے پیکر تھے علیؑ

ے وہ علیؑ مرد جری، صاحب ایمان بھی تھے
پیرو دین مبین، نازش انسان بھی تھے

ے وہ سخن فہم، سخن سنج، سخن دان بھی تھے
وہ مجاہد بھی تھے اور غازیٔ میدان بھی تھے

(آزاد گورداس پوری)

ے ہم سخن گوئی میں یارو میرؔ کہلانے لگے
شاعروں کے شہر میں اک پیر کہلانے لگے

ے نکہت جام محمدؐ ہوگئی جب سے نصیب
شیرؔ ہم بھی صاحب تقدیر کہلانے لگے

ے دنیا کی ہر خوشی ہے یہ دنیا کا چین ہے
جب میرے دل میں یاد شہ مشرقینؑ ہے

(شمشیر سنگھ شیرؔ)

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ے تیرے ہی جلوؤں سے توحید کا پرچم چھایا
تیری ہی ذات سے وحدت ہے نمایاں احمدؐ
ے دنیا کو آج بھی ہے بھروسہ حسینؑ کا
انسانیت کی لاج ہے جذبہ حسینؑ کا

(بلونت سنگھ فیضؔ)

ے اے سرخیِ افق، وہ شہیدانِ کربلا
اپنے لہو سے تجھ کو بھی گل نار کر گئے
ے اس کے بھی دل پہ چھایا ہوا ہے غم حسینؑ
پاندھیؔ کو بھی وہ اپنا عزادار کر گئے

(جوگندر سنگھ پاندھی)

ے میرا وجود ہی تیرے ہونے کو ہے دلیل
میری طرح تو کوئی تجھے سوچتا نہیں
ے کوئی حضرت حسینؑ کے نقش قدم دکھا دو
مجھے یہ نیاز نام شہدائے کربلا دو
ے یہ سچ ہے کہ نانک کا پرستار ہوں میں
اور عشق محمدؐ سے بھی سرشار ہوں میں
ے حسینیؑ ہے چلن جن کا عقیدہ حق پرستی ہے
یزیدوں کی کسی صورت طرفداری نہیں کرتے

(نرمل سنگھ رائے پوری)

ے پیاسے ترس کے رہ گئے پانی کے واسطے
یہ ظلم تھا رسولؐ کے جانی کے واسطے
ے قربانیاں یہ دی تھیں رسولوں کے واسطے
سچائیوں کے زندہ اصولوں کے واسطے

(ہرمہندر سنگھ ہرجی)

ے ظلمت کدوں میں سحر نو کی تابشیں
یہ فیض ہے ولادتِ ختم مابؐ کا

(سردار گوربخش سنگھ مخمور جالندھری)

ے کافور ہوگئی ہے میرے دل کی تیرگی
شکر خدا کہ خواب سے بیدار ہوگئی

(بوا دِتی اہلیہ بوڈسنگھ بیر امرتسر)

راس المال کی زبان رواں اور شیریں ہے۔ الفاظ کا استعمال اس خوبی سے کیا گیا ہے کہ ہر لفظ سے عقیدت کے پھول برستے ہیں۔ اسلام کی تاریخ، واقعات کربلا، سکھ اور غیر سکھ شعرا کا کلام عرفان ترابی نے اس طرح یک رنگی اور یک فنی سے پیش کیا ہے کہ قاری عش عش کرتا ہے۔ عرفان ترابی کی ادبی خدمات ان کی تدوین اور ترتیب دی گئی کتابوں سے صاف ظاہر ہے۔ انہوں نے جس عرق ریزی اور جانفشانی کے ساتھ زیر نظر تحقیقی دستاویز مکمل کی ہے اس کی مثالیں آج کے سہولت پسند دور میں بہت کم ملتی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ عرفان ترابی آئندہ بھی اپنے پراجیکٹوں کو اسی طرح پایۂ تکمیل تک پہنچاتے رہیں گے۔ ❖ ❖ ❖

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

جگن ناتھ آزاد۔ اُردو ادب کی آبرو

محمد توفیق خاں

بیسویں صدی کے مایہ ناز شاعر، نثر نگار، حافظِ کلام اقبال اور اقبالیات کے ماہر جگن ناتھ آزاد نے بقول محمد توفیق خاں ''تمام عمر اُردو زبان اور ادب کی نہ صرف خدمت کی ہے بلکہ اردو کی ترقی کے لیے اردو کو دنیا کی سب سے بڑی زبان بنانے کے لیے اپنی ساری زندگی صرف کردی ہے۔'' نامور شاعر تلوک چند محروم کے فرزند اور ادبی وارث جگن ناتھ آزاد کا آبائی وطن عیسیٰ خیل ضلع میاں والی پاکستان ہے۔ تقسیم وطن کے بعد دہلی میں سکونت اختیار کی اور پھر ۱۹۶۸ء کے بعد ریاست جموں وکشمیر میں مستقل طور پر مقیم رہے۔ لاہور سے ایم اے کی ڈگری حاصل کر کے مولانا تاجور نجیب آبادی کے تلامذہ میں شامل ہوئے۔ انہوں نے علامہ اقبال کے پیغام کو اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے دنیا کے کونے کونے میں پھیلانے کی کامیاب کوشش کی۔

محمد توفیق خاں نے، جو درس وتدریس کے ساتھ ہمیشہ جڑے رہے، 'جگن ناتھ آزاد۔ اردو ادب کی آبرو' تحریر کر کے نہ صرف اس عاشق اقبال کو خراج عقیدت پیش کیا بلکہ ان کے فن اور شخصیت کو سمجھنے کے لیے راستہ بھی ہموار کیا۔ مذکورہ کتاب جگن ناتھ آزاد کی زندگی کے مختلف گوشوں، ان کی منظوم ونثری تخلیقات اور ان کی ادبی خدمات پر بھرپور روشنی ڈالتی ہے۔ محمد توفیق خاں کا شوق مطالعہ، ادبی ذوق اور اردو نثر پر مکمل

ناشر: کریسنٹ ہاوس پبلی کیشنز، جموں
سن اشاعت: ۲۰۰۴ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

دسترس انہیں ہم عصر ادیبوں میں امتیازی مقام عطا کرتی ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ۸۴ سال کی عمر میں بھی وہ کافی فعال ہیں۔ بقول خاں صاحب جگن ناتھ آزاد بچپن سے ہی ان کے مطالعے میں رہے ہیں اور گذشتہ پچاس برسوں سے وہ اپنی ذاتی ڈائری میں آزاد کے دلکش اور فکر انگیز اشعار نوٹ کرتے رہے ہیں۔ جگن ناتھ آزاد کے ساتھ اُنس کا ایک اور سبب یہ بھی ہے کہ انگریزی ادب کے وسیع مطالعے کے باوجود ان کی شاعری اور فکر میں اپنی دھرتی کی بو باس ملتی ہے۔

جگن ناتھ آزاد اور اقبال کے بارے میں توفیق خاں یوں رقم طراز ہیں۔ ''میں نے دو کام کیے کہ جگن ناتھ آزاد کو پڑھا اور اقبال کو بھی۔ جب اقبال سمجھ میں نہ آتے تھے تو جگن ناتھ آزاد کی کتابیں پڑھنے بیٹھ جاتا تھا۔'' جگن ناتھ آزاد نے اقبال کے بارے میں بہت کچھ لکھا اور ان پر اسلام پرستی کا الزام لگانے والوں کو دوٹوک جواب دیا۔ وہ ہمیشہ کہتے رہے کہ جب تلسی داس، ملٹن اور دانتے پر ایسے سوالات نہیں اٹھائے گئے تو پھر اقبال پر کیوں؟ محمد توفیق خاں مزید فرماتے ہیں کہ ''سب سے زیادہ بڑی غلط فہمی تو یہ ہے کہ انہیں تقسیم ہند کا ذمے دار ٹھہرایا گیا ہے۔ جگن ناتھ آزاد نے اقبال کے کلام کے نمونوں کے ذریعے ان کے سیکولر اور ایک سچے وطن پرست ہونے کا ثبوت فراہم کیا ہے۔'' اقبال اور اسلام سے اس قدر محبت کے باوجود ''جگن ناتھ آزاد صحیح معنوں میں سیکولر ہیں۔ صرف اپنی تحریر و تقریر میں ہی نہیں بلکہ اپنی روزانہ کی زندگی میں بھی۔ ان کی نظم و نثر ان کی زندگی کا ہی پرتو ہے۔'' بقول مصنف اقبال پر بہت سارے ادیبوں نے لکھا ہے مگر جگن ناتھ کو اقبال سے عشق تھا اس لیے ان کی تحریروں میں الگ ہی بات ملتی ہے۔ خود آزاد نے اعتراف کیا ہے کہ ''وہ اقبال سے اتنے مرعوب تھے کہ اُن سے ملنے کی ہمت نہ کر سکے۔''

جگن ناتھ آزاد کی کئی تصانیف منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ چند ایک کے نام یوں ہیں: اقبال اور اس کا عہد (۱۹۷۰ء) اقبال اور مغربی مفکرین، بے کراں (۱۹۴۹ء)، ستاروں سے زروں تک (۱۹۵۰ء) وطن میں اجنبی، نوائے پریشاں (۱۹۵۱ء)، بچوں کے لیے کہی گئی نظموں کا مجموعہ (۱۹۶۸ء) اور بوئے رمیدہ۔

جگن ناتھ آزاد نے علامہ اقبال کے فلسفے کو مغربی مفکرین۔ بیکن، لاک، کانٹ، نطشے، برگساں، آئن سٹاین، ملٹن، گوئٹے اور کارل مارکس کے نظریات سے بھی موازنہ کیا ہے اور اقبال کو ہندوستان کے ایک عظیم شاعر اور مفکر کے روپ میں پیش کیا ہے۔ مغربی مفکرین کے گہرے مطالعے نے ہی اقبال کے ذہن کو وسعت اور رفعت بخشی۔ ان مفکرین میں سے اقبال نطشے سے بے حد متاثر تھے جو ان کی تحریروں سے بھی جھلکتا ہے۔ مغربی مفکرین کے علاوہ اقبال نے قرآن اور احادیث سے از حد استفادہ کیا ہے۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

جگن ناتھ آزاد کی شاعری بھی اعلیٰ فکر واحساس کا آئینہ ہے۔ پیش ہیں چند اشعار جو مذکورہ کتاب میں درج کیے گئے ہیں:

ے جہاں ماحول میں نفرت ہی نفرت راج کرتی ہے
وہاں ہم پیار کی دنیا بسائیں بھی تو کیا ہوگا

ے ہر بشر ہے درپے آزاد تیرے شہر میں
زندگی ہے درد کا انبار تیرے شہر میں

ے کہو دیر وحرم والو یہ تم نے کیا فسوں پھونکا
خدا کے گھر پہ کیا بیتی صنم خانوں پہ کیا گزری

ے آسماں کے اوج سے افکار کو واپس بلا
یہ زمین سب کچھ ہے ناداں! آسماں کچھ بھی نہیں

ے ہمیں گرداب سے اے ناخدا تو کیا ڈراتا ہے
کہ ہم گرداب کو بھی دامن ساحل سمجھتے ہیں

ے قاصد پیام کو تو اتنا نہ طول دے
بس اس قدر ہی کہنا آنکھیں ترس گئی ہیں

وحدت انسانی کے علمبردار، ہمدردی، اخوت اور مساوات کے پیکر جگن ناتھ آزاد کے بارے میں امین بنجارا 'نذر آزاد' میں یوں فرماتے ہیں۔ ''آزاد ایسی پرخلوص شخصیت ہے جس کو ماہر اقبالیات، اُردو کا سفیر، امن کا پیغامبر اور ہندو پاک کے درمیاں محبتوں کا قاصد کہہ کر پکارا جاتا ہے۔''

مجموعی طور پر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ محمد توفیق خاں کی مذکورہ تصنیف جگن ناتھ آزادؔ اور اقبالؔ کو سمجھنے کے لیے راستہ ہموار کرتی ہے اور اس لیے اُردو ادب میں ایک اہم اضافہ ہے۔

❖ ❖ ❖

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

محمد خالد عابدی۔ ایک مطالعہ

ڈاکٹر رضیہ حامد اور رہبر جونپوری

خالد عابدی ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ انہوں نے ساری زندگی اُردو کی بقاء کے لیے صرف کی۔ ضروری تھا کہ ان کی حیات اور کارنمایاں پر ایک مبسوط کتاب ترتیب دی جائے۔ 'محمد خالد عابدی۔ ایک مطالعہ' اسی خواب کی تعبیر ہے۔ اس کتاب میں خالد عابدی کی شخصیت اور کارناموں پر لکھے گئے مضامین، انٹرویوز، مکتوبات، سپاس نامے اور ان کے فن و مکتبہ عابدیہ پر مشاہیر کے تاثرات شامل ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ پڑھتے پڑھتے قاری کہیں اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا۔

محمد خالد عابدی ۱۷ اگست ۱۹۴۷ء (رجسٹرڈ پیدائش ۱۷ نومبر ۱۹۴۹ء) کو بھوپال میں محمد عابد خیاط کے گھر میں پیدا ہوئے۔ ایم اے کر کے پی ایچ ڈی کے لیے مقالہ (موضوع۔ ''بیسوی صدی میں اُردو کا مکتوباتی ادب'') تقریباً مکمل کیا مگر شومئی قسمت کہ بیتول کے سیلاب نے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ پہلے محکمہ بجلی اور پھر آل انڈیا ریڈیو میں ملازم ہو گئے جہاں انہوں نے اردو ادب کی بے لوث خدمت کی۔ خالد عابدی نے پوری عمر دوشوق دیوانگی کی حد تک پالے۔ وہ ہیں فلموں میں فلموں سے متعلق تحقیقات و مواد جمع کرنا اور دوسرے قیام مکتبہ عابدیہ بھوپال جس میں چھ سات ہزار نادر و نایاب کتابیں اور اردو کے اہم رسائل خوش ترتیبی سے رکھے گئے ہیں۔ اس لائبریری سے سینکڑوں طالب علموں نے استفادہ کیا اور چند ایک نے تو

ناشر: مکتبہ عابدیہ، ۵۴۵، دل آرام ہاوس۔ ہوا محل روڈ، بھوپال — سن اشاعت: ۲۰۰۷ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں بھی حاصل کیں۔ بقول رشید انجم۔ ''فلمیں دیکھنا، فلموں کی تکنیک سے واقف ہونا، ہر منظر کو گہرائی سے دیکھنا اور اداکاروں کی فنی باریکیوں کو سمجھنا، فلم کے اسلوب، فلم کی تخلیق اور ان عوامل کو تلاش کرنا جن سے فلم کاغذ سے نکل کر کیمرے کی آنکھ سے سلولائیڈ کی باریک جھلی میں قید ہوتی ہے اور پھر مخصوص روشنیوں سے سلولائیڈ کی قید سے پردۂ سیمیں پر متحرک کرتی ہے اور فلم بین کی تسکیں کا باعث بنتی ہے، محمد خالد عابدی کے لیے بے حد دلچسپ موضوع ثابت ہوا۔'' یہی وجہ ہے کہ انہیں فلموں کا انسائیکلو پیڈیا کہتے ہیں۔'' اس کے علاوہ خالد صاحب مکتوب نگاری، خوش نویسی اور ڈاک ٹکٹیں و سکے جمع کرنے میں بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔

خالد عابدی کے بارے میں رضیہ حامد رقم طراز ہیں: ''خالد عابدی صرف مطالعہ ہی نہیں کرتے وہ ایک تخلیق کار، محقق، نقاد، مزاح نگار اور ڈرامہ نگار ہیں۔'' انہوں نے ادبی شروعات تو شاعری سے کی اور خالد بھوپالی تخلص اختیار کیا مگر بعد میں نثر کی طرف رجوع کیا اور آصف کمال اور خالد عابدی کے نام سے لکھتے رہے۔ بقول صابر ادیب ''خالد بھائی مخلص، ملنسار، خوش مزاج اور انکسارانہ طبیعت کے مالک ہیں۔ ان کی شخصیت میں انسانیت نوازی، غمگساری اور اپنائیت ہے۔ ان کی بذلہ سنجی اور زندہ دِلی انہیں دوسرے فنکاروں سے ممیّز کرتی ہے۔ وہ دھن کے پکے اور کام کے سچے ہیں۔'' مولانا نعمت اللہ ندوی فرماتے ہیں۔ ''خالد عابدی صاحب کی زندگی کا ایک دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ صبر و تحمل کا پیکر ہیں۔ ان کی زندگی میں طوفان وحوادث آئے مگر نہ شکستگی سے دوچار ہوئے اور نہ ان کے قدم تزلزل کا شکار ہوئے۔'' آل انڈیا ریڈیو میں انہوں نے پروگرام آفیسر کے فرائض بخوبی نبھائے۔ اخلاص کے سبب وہ بہت ہی مقبول ہوئے۔ ڈاکٹر بشیر بدر کے تاثرات ملاحظہ ہوں: ''دراصل اپنے کام اور منصب سے ان کی دلی وابستگی، فرض کا احساس، محنت اور صلاحیت نے انہیں اردو پروگراموں کا قابل قدر فرد بنا دیا ہے۔''

محمد خالد عبادی کی گیارہ تصنیفات منصۂ شہود پر رونما ہو چکی ہیں:

(۱) **آواز نما** (۱۹۷۵ء)۔ آٹھ ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ، اور چند افسانے۔ ڈرامے دراصل ۱۵ منٹ کی جھلکیاں ہیں۔

(۲) **باغ فکر معروف بہ مقطعات نساخ** (۱۹۷۷ء) بنگال کے معروف استاد عبدالغفور نساخ کے مقطعات پر مشتمل کتابچہ۔ دراصل اوریجنل کتاب جون ۱۸۸۷ء میں پہلی بار شائع ہوئی تھی۔ بقول قمر رئیس نساخ پر آپ کی کتاب محنت لگن اور علمی استعداد کا اچھا نمونہ ہے۔ کاش ہمارے

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

آج کے نوجوان محقق ایسی علمی کتابوں کو پڑھیں اور انہیں ماڈل بنائیں۔''

(۳) **پیکر آواز** (۱۹۸۳ء) ریڈیائی اور اسٹیج ڈرامے۔ محمد خالد عبادی پلاٹ کے انتخاب، کرداروں کی معنویت، مکالموں کی بندش، زبان کی فصاحت اور ظرافت میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ ان ڈراموں میں خود ان کی حیات کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ چنانچہ ریڈیو اور اسٹیج کے لیے مختلف ٹریٹمنٹ کی ضرورت ہوتی ہے، خالد صاحب کو ہمیشہ اس بات کا احساس رہا ہے۔ بقول رفعت سروش، ''ان کے ڈرامے ہلکے پھلکے اور نشاطیہ بلکہ بعض اوقات طنز و مزاح کی چاشنی لیے ہوتے ہیں۔''

(۴) **زخموں کے دریچے** (۱۹۸۸ء) رومانی اور سماجی مسئلوں پر تحریر کیے گئے افسانے۔ ان کے افسانوں کے بارے میں کوثر چاند پوری اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں۔ ''زبان میں پاکیزگی ہے اور سماجی افسانوں میں انسانوں کا دکھ درد اور ان کی سچی داستان حیات ہے۔ بقول معروف افسانہ نگار رام لعل ''اس کے افسانے نہ صرف یہ کہ ابلاغ کی شرط کو پورا کرتے ہیں بلکہ اپنے پڑھنے والوں کو ایک ایسی دنیا میں لے جاتے ہیں جو ہمارے آس پاس کی ہوتی ہے۔''

(۵) **شکایتاً عرض ہے** (۱۹۹۱ء) ۱۲ طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا مجموعہ۔ ان کا طنز سبک، نرم اور خوش ذائقہ ہوتا ہے۔ بقول وجاہت علی سندیلوی۔ ''وہ اپنے قاری کو ایک لمحہ کے لیے بھی جمود کا شکار نہیں ہونے دیتے۔'' فوزیہ کمال اس بارے میں لکھتی ہیں۔ ''خالد عابدی کا مزاج مکالموں کی ادائیگی، جملوں کی ساخت اور ماحول سے پیدا ہوتا ہے اور ایک زیر لب تبسم کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ وہ بات سے بات پیدا کرنے کے ہنر سے آگاہ ہیں اور انشائیوں کو پھیلانے اور وسیع کرنے کے لیے واقعہ اس خوبصورتی سے انشائیہ میں ضم کرتے ہیں کہ لطف آجاتا ہے۔''

(۶) **اردو انٹرویوز** (۱۹۹۲ء) پانچ نامور ادیبوں اور شاعروں کے مراسلاتی انٹرویوز جو ادبی شخصیات کی تفہیم میں کارگر ہو سکتے ہیں۔

(۷) **ٹیچر کے بغیر** (۱۹۹۴ء) بچوں کے لیے چھ مقصدی ڈرامے۔

(۸) **مضامین خالد** (۱۹۹۵ء) ۱۲ تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ جن میں اوجین کے ہندو شعرا کا تذکرہ اور فراق پر لکھا گیا مضمون خاصے کی چیز ہے۔ اس کتاب پر راشٹریہ سہارا میں جو تبصرہ کیا گیا اس کے مطابق ''(خالد عابدی نے) اپنے مفروضات اور حقائق کو دلائل اور ثبوت کے ساتھ پیش کیا ہے۔'' یہ مضامین عابدی کے عمیق مطالعے، تحقیق اور تلاش و جستجو کے مظہر ہیں۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

(۹) **اُردو مراسلاتی انٹرویوز** (۱۹۹۶ء) پچیس نامور شعراء، ادباء اور فلمی ہستیوں کے مراسلاتی انٹرویوز۔

(۱۰) **نقطہ نو گریز**۔ منی افسانوں کا مجموعہ جس میں سماجی مسائل کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ بقول مناظر عاشق ہرگانوی۔ ''محمد خالد عابدی کے افسانچے گلہائے رنگا رنگ کے گلدستے ہیں جن میں انفرادیت ہے، جلوہ افروزی ہے، اجتماعی زندگی کے نشیب وفراز ہیں۔ لطف اندوز ہونے کی کیفیت ہے۔ فکر کی نئی تلاش ہے، طنز کا عمل دخل ہے، عصری حسیت کی تیز آنچ ہے، فنکارانہ جودت وفطرت کی جولانیاں ہیں اور ان کی تطہیر کی حرمت ہے۔'' افسانوں کے بارے میں دیویندر اِسر اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں۔ ''آپ نے مختلف موضوعات کو پر اثر طریقے میں فنی ملحوظات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہ ایک خوشگوار عمل ہے۔''

(۱۱) **ہماری فلمیں اور اُردو**۔ اُردو ادیبوں کا فلموں میں یوگدان۔ اس کتاب میں دلیپ کمار کے بارے میں بھی ایک مضمون شامل ہے۔

مذکورہ بالا مشمولات کے علاوہ کتاب میں خالد عابدی سے لیے گئے انٹرویوز بھی ہیں۔ ان انٹرویوز میں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ خالد عابدی نے سوالوں کا جواب بے روک ٹوک، اور دلیرانہ انداز میں دیا ہے۔ وہ چاہے ان کی نجی زندگی سے تعلق رکھتے ہوں یا سماجی مسائل پر۔ انہوں نے اردو کے مستقبل کے بارے میں یاسیت اور قنوطیت کا اظہار بھی کیا ہے۔

مجموعی طور پر مذکورہ کتاب محمد خالد عابدی کی حیات اور کارناموں کو مدلل اور شفاف طریقے سے پیش کرنے میں کامیاب ہوئی ہے۔ خالد عابدی پر تحقیق کرنے والوں کے لیے یہ کاوش حوالہ جاتی حیثیت رکھتی ہے۔

❖ ❖ ❖

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

مختار شمیم۔ایک تاثر

ـــــ محمد توفیق خاں

ڈاکٹر مختار شمیم سرونج کے نامور شاعر، افسانہ نگار اور تنقید نگار ہیں۔اُن کی حیات اور فن پر ایک بھرپور کتاب لکھنا بہت بڑا کارنامہ ہے جسے محمد توفیق خاں نے بہ طریق احسن انجام دیا ہے۔حیرت تو اس بات کی ہے کہ ہیڈ مدرس محمد توفیق خاں نے ڈھلتی عمر میں اپنے ہاتھ میں قلم اٹھایا اور تب سے کتابوں اور مضامین کا انبار لگا رہے ہیں۔اب تک ان کی آٹھ کتابیں منصۂ شہود پر رونما ہوئی ہیں جو اکثر و بیشتر سرونج اور اس کے گردونواح کے قلمکاروں کا احاطہ کرتی ہیں۔

زیر نظر تصنیف میں محمد توفیق خاں نے نہ صرف مختار شمیم کی حیات پر باریک بینی سے نظر ڈالی ہے بلکہ ان کے فن کے الگ الگ شعبوں جیسے غزل گوئی، نظم نگاری، افسانہ نگاری، تحقیق نگاری اور تنقید نگاری پر بھی بحث کی ہے۔ساتھ ہی ان کے کلام اور مضامین کے نمونے بھی کتاب میں شامل کیے ہیں۔ایک بات جو مختار شمیم کو اپنے ہم عصروں میں انفرادیت بخشتی ہے وہ یہ ہے کہ ایک پوسٹ گریجویٹ کالج کے پرنسپل ہونے کے باوجود وہ کم گو اور محتاط شخصیت کے مالک ہیں اور خود تشہیری سے ہمیشہ دامن کھینچ لیتے ہیں۔اس کے علاوہ وہ ایک اچھے آرٹسٹ اور خوشنویس بھی ہیں۔

مصنف نے جہاں قدیم زمانے میں سرونج کی ادبی سرگرمیوں کو کھنگال کر مختار شمیم کے خاندان کا

ناشر: انتساب پبلی کیشنز، سرونج (ایم پی) 464228 سن اشاعت: ۲۰۰۴ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

رشتہ اسے جوڑا ہے وہیں انہوں نے اس خاندان کی جڑیں پیلی بھیت اتر پردیش میں بھی ڈھونڈ نکالی ہیں۔ بچپن میں ماں کا سایہ سر سے اٹھ جانا اور سخت گیر دادی کے تحت پرورش پانا، ۱۵ سال کی عمر میں اسی موضوع پر اپنا پہلا افسانہ رقم کرنا اور پھر پیام مشرق اور دین و دنیا جیسے رسالوں میں چھپ جانا، سرونج سے قلمی رسالہ 'راہی' نکالنا بھوپال سے ایم اے کر کے پھر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنا، مشہور ادبیہ کشور سلطانہ کو اپنا ہم سفر بنانا اور پھر زندگی کا پورا سفر طے کرنے سے پہلے ہی اس کا ساتھ چھوٹ جانا مختار شمیم کے سفر حیات کے چند اہم سنگِ میل ہیں۔

۱۹۴۵ء میں سرونج میں جنمے مختار شمیم نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۶۰ء میں افسانہ نگاری سے کیا۔ ان کا پہلا افسانہ 'ماں' کے عنوان سے سکول میگزین میں شائع ہوا۔ اس کے بعد ان کے افسانے پیام مشرق دہلی اور دین و دنیا دہلی میں تسلسل کے ساتھ چھپتے رہے۔ ۱۹۸۰ء میں افسانوی مجموعہ 'پس غبار' منظر عام پر آیا۔ افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ وہ ریڈیو کے لیے ڈرامے بھی لکھتے رہے مگر طبعی رجحان شاعری کی طرف مائل تھا۔ اس لیے شاعری کے ہی ہو کر رہ گئے۔ ان کے شائع شدہ شعری مجموعوں کے نام ہیں۔ (۱) نامۂ گل۔ (۲) دریچۂ گل۔ (۳) حرف حرف آئینہ۔ ان کی شاعری ذاتی تجربات کے علاوہ ماحول کے مشاہدات سے بھی منسوب ہے۔ وہ میرؔ اور داغؔ سے کافی حد تک متاثر نظر آتے ہیں۔ تمثیلوں اور استعاروں کا بھی کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو ان کے چند اشعار:۔

ہر ایک شخص مسیحا دکھائی دیتا ہے ۔۔۔ یہاں سب اپنی صلیبیں اٹھائے پھرتے ہیں

جب کبھی خود سے ملا ہوں زخم اک تازہ ملا ۔۔۔ ٹوٹ جاتا ہوں شکستہ آئینہ کو دیکھ کر

خود کو اجنبی پایا آج اپنے گاؤں میں ۔۔۔ شہر میں بھی تنہا تھا، پھر یہ حادثہ گزرا

تیرے وصال کو اب تک مگر بھلا نہ سکا ۔۔۔ جدا ہوا ہوں میں خود سے کہ خود کو پا نہ سکا

شب ہجراں کے مقدر میں اجالا نہ ہوا ۔۔۔ چاند کے سینے میں روشن تو ہوا داغِ الم

کبھی کبھی تو ہمارا قدم بہکتا ہے ۔۔۔ کبھی کبھی تو بدلتی ہے کروٹیں دنیا

نظموں میں بھی مختار شمیم کا الگ ہی رنگ ہے۔ بقول توفیق خاں، ان کے یہاں معنویت اظہار کا کھلا پن اور طاقتور لہجہ ملتا ہے۔ حرف سادہ، تنہائی، فکر نو اور شرط جیسی نظمیں بلا واسطہ دل میں اتر جاتی ہیں۔ ان کی ایک نظم کرفیو، یہاں پر نقل کرتا ہوں۔

کرفیو کے سائے میں...../ اونگھتے ہوئے لمحے/ دن بجھے بجھے سے ہیں/ سرد سرد

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

راتیں ہیں/شہر کی فصیلوں پر/ خامشی کا پہرا ہے/خوف کے دریچوں سے جھانکتا ہے سناٹا/
ہر مکان سہما ہے/کس قدر اندھیرا ہے روشنی نہیں ملتی/ دور تک کہیں یارو! زندگی نہیں ملتی۔

تحقیق اور تنقید میں بھی مختار شمیم نے 'ریاست ٹونک اور اردو شاعری'، 'ظہیر دہلوی، حیات وفن' اور 'تناظر اور تشخص' جیسی بیش بہا کتابیں اردو ادب کو عنایت کی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے کئی مضامین رسالوں میں چھپے ہیں۔ انتساب کی اشاعت میں بھی ڈاکٹر سیفی سرونجی ان کے مشوروں سے مستفید ہوتے رہے ہیں۔ ڈاکٹر مختار شمیم کے تنقیدی و تحقیقی مضامین کی خوب پذیرائی ہوئی کیونکہ ان کا مطالعہ عمیق اور مشاہدہ وسیع ہے اور ان کے مضامین میں گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی۔

دیکھا جائے تو 'مختار شمیم۔ایک تاثر' رقم کرنے میں کافی محنت صرف ہوئی ہے جس کے لیے محمد توفیق خاں مبارکباد کے مستحق ہیں خاص طور پر جبکہ خود مختار شمیم اس کے لیے راضی نہ تھے۔ محمد توفیق خاں کی زبان کی سلاست اور شگفتگی، انداز بیان اور ترتیب مضامین قارئین کو بے حد متاثر کرتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آگے بھی موصوف ایسے ہی گرانقدر کارنامے انجام دیتے رہیں گے۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

ہماری فلمیں اور اُردو

—— محمد خالد عابدی

محمد خالد عابدی نے اپنی زندگی کے شروعاتی دور میں فلموں پر تبصرے لکھنا اور فلموں کا تجزیہ کرنا اختیار کیا اور اس میدان میں انہیں سرخروئی بھی حاصل ہوئی۔ یہاں تک کہ انہیں 'فلموں کا انسائیکلوپیڈیا' بھی کہا جانے لگا۔ زیرِ نظر کتاب میں خالد عابدی نے فلموں میں اردو کے مشہور ادیبوں کے یوگدان کی نشاندہی کی ہے۔ کتاب نہ صرف ان ادیبوں کی شخصیت اور کامرانیوں کی داستاں ہے بلکہ اردو کے تئیں ان کے رویے اور نظریے پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔ حالانکہ فلم سے وابستہ سینکڑوں اردو شاعر اور نثر نگار رہے ہیں لیکن مصنف نے چند ایک کا ہی انتخاب کیا ہے۔ ان کے علاوہ خالد عابدی نے مشہور فلمی اداکار دلیپ کمار اور گائیکہ لتا منگیشکر پر بھی سیر حاصل مضمون لکھے ہیں کیونکہ انہیں اردو سے لگاؤ ہے۔ البتہ اس تصنیف میں جو کمی محسوس ہو رہی ہے وہ ہے آغا حشر کاشمیری، سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی کی۔ ان تینوں ہستیوں کو فلموں سے گہرا رشتہ تھا۔

پیش لفظ میں محمد خالد عابدی نے فلموں کے ارتقاء کا مختصر خاکہ کھینچا ہے۔ ۱۹۱۳ء میں خاموش فلموں کا آغاز ہوا، ۱۹۳۱ء میں پہلی ناطق فلم 'عالم آرا' ریلیز ہوئی۔ حالانکہ اس سے پہلے ہی اخباروں اور رسالوں میں

ناشر: مکتبہ عابدیہ، چوبدار پورہ، پرانا قلعہ بھوپال
سن اشاعت: ۲۰۰۹ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

فلموں پر تبصرے آنے لگے تھے۔ کئی اخبار اور رسالے تو فقط فلموں کے لیے ہی وقف کیے گئے۔ ہندوستانی فلموں کا ابتدا سے ہی اردو کے ساتھ گہرا سمبندھ رہا ہے جس کے سبب کئی شاعروں اور نثر نگاروں نے فلم نگری ممبئی کا رُخ کیا۔ غزلوں، گیتوں اور قوالیوں کا ہر دور میں چرچا رہا۔ البتہ اردو فلموں کو ہندی فلموں کا لیبل لگا کر پیش کرنا اردو سے بہت بڑی ناانصافی کی گئی۔ ساحر لدھیانوی نے اس بارے میں اپنا احتجاج بھی درج کیا۔

پریم چند اقتصادی حالات کے باعث یکم جون ۱۹۳۴ء کے روز ممبئی میں وارد ہوئے۔ لیکن یہاں کی آب و ہوا انہیں راس نہیں آئی۔ فلمی پرڈیوسروں اور ڈائرکٹروں کی کارستانیوں سے وہ اکتا گئے اور جلدی ہی مارچ ۱۹۳۵ء میں واپس چلے گئے۔ ممبئی میں وہ اجنتا سنی ٹون سے وابستہ رہے۔ ان کی کئی کہانیوں اور ناولوں مثلاً سیوا سدن (بازار حسن)، نوجیون یا شیر دل عورت، تریا چرتر (عورت کی فطرت) رنگ بھومی، دو بیلوں کی جوڑی (ہیرا موتی) گودان، غبن، عید گاہ (عید مبارک) اور کفن کو فلمایا گیا مگر اکثر و بیشتر ناکام رہیں۔ البتہ پریم چند کی تحریر کی ہوئی فلم مل مزدور (غریب مزدور) میں مقبول خاص و عام ہونے کی صلاحیت تھی مگر وہ حکومت کے عتاب کا شکار ہو کر رہ گئی جس وجہ سے اس کی نمائش بند ہو گئی۔ اس بارے میں خود پریم چند کا بیان ہے۔ ''جن ہاتھوں میں فلم کی قسمت ہے وہ بدقسمتی سے اسے انڈسٹری سمجھ بیٹھے ہیں۔ انڈسٹری کو مذاق اور اصلاح سے کیا نسبت وہ تو اکسپلائٹ کرنا جانتی ہے۔''

رومانی ترقی پسندی کے موجد کرشن چندر کافی عرصے تک فلموں سے جڑے رہے۔ اس دوران انہوں نے اپنے دوست احباب کو بھی اس انڈسٹری میں قدم جمانے میں مدد کی۔ ان کا فلمی سفر 'من کی جیت' سے شروع ہوا اور ان کی لکھی ہوئی تقریباً ۲۴ فلمیں ریلیز ہوئیں۔ کرشن چندر نے خود بھی تین فلمیں بنائیں (سرائے کے باہر، دل کی آواز اور راکھ) مگر تینوں میں انہیں کافی خسارہ اٹھانا پڑا۔ وہ فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کے صدر بھی رہے اور گاہے بہ گاہے فلموں پر تبصرے اور تنقیدی مضامین بھی لکھتے رہے۔ بقول مصنف 'کرشن چندر کا دوسرا نام 'اردو' تھا۔ وہ اردو کے مخالفین سے بڑی سے بڑی جنگ لڑنے کو تیار رہتے تھے۔'' جب اردو رسم الخط کا مسئلہ شدت اختیار کرنے لگا تو کرشن چندر نے بھی اردو دشمنوں کے مضامین کے جوابات لکھے۔'' فلموں میں ان کی کامیابی چست مکالموں، تیکھے طنز اور بقول قرۃ العین حیدر Lyrical Realism کا نتیجہ ہے۔

راجندر سنگھ بیدی نے ادبی زندگی کی ابتداء پوسٹ آفس کی کلرکی کے دوران 'محسن لاہوری' کے قلمی نام سے شروع کی۔ پھر ریڈیو لاہور اور ریڈیو کشمیر سے وابستہ ہو کر ممبئی چلے گئے۔ اس سے پہلے ہی لاہور میں

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

انہوں نے مہیشوری فلمز کے لیے 'کہاں گئے' کا اسکرپٹ لکھا تھا۔ ممبئی میں انہوں نے 'بڑی بہن' سے شروعات کی جو نہ صرف بہت مقبول ہوئی بلکہ اس کے گیت امر ہو گئے۔ فلم مرزا غالب کو مکمل کرنے کا سہرا بھی بیدی کے سر بندھتا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے متعدد فلمیں لکھیں جن میں دیوداس، مدھومتی، انوپما، انورادھا، ستیہ کام، ایک چادر میلی سی، دستک اور ابھیمان قابل ذکر ہیں۔ وہ کئی فلموں کے ہدایت کار بھی رہے۔ بقول خالد عابدی ''راجندر سنگھ بیدی ہماری فلمی صنعت کے ایک ایسے قلم کار تھے جنہوں نے اپنی تحریر سے متعدد کامیاب فلموں کو ہمکنار کرایا۔'' بیدی نے وقتاً فوقتاً ہندوستانی فلموں کے بارے میں اپنے نظریات، مشاہدات، تجربات اور تاثرات بھی قلم بند کیے۔

خواجہ احمد عباس ترقی پسندی کا مجسمہ تھے۔ علی گڑھ سے بی اے ایل ایل بی کر کے انہوں نے صحافت کا پیشہ اختیار کیا۔ ممبئی میں 'بامبے کرانیکل' میں وی شانتارام کی فلم 'آدمی' پر ان کے تبصرے نے تہلکہ مچا دیا اور پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ ان کے بے لاگ تبصروں کے باعث فلم انڈسٹری کی کئی ہستیاں ان سے خفا بھی ہو گئیں۔ عباس کی پہلی فلم 'نیا سنسار' بامبے ٹاکیز نے فلمائی۔ عجیب بات یہ رہی کہ جو فلمیں خواجہ احمد عباس نے دوسروں کے لیے لکھیں وہ اکثر کامیاب رہیں۔ البتہ جو کہانیاں انہوں نے خود اپنے لیے لکھیں وہ ناکام رہیں۔ انہوں نے فلمی دنیا کو آوارہ، شری چار سو بیس، بوبی، شہر اور سپنا، دو بوند پانی، آسمان محل، اور نکسلائیٹ جیسی عمدہ فلمیں دیں۔

ترقی پسند شاعر، نثر نگار اور مجاہد آزادی علی سردار جعفری نے فلموں کے لیے گیت اور اسکرپٹ لکھے اور خود بھی فلمسازی کی۔ وہ فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کے صدر بھی رہے۔ مصنف کی تحقیق کے مطابق انہوں نے پہلا گیت فلم 'نیا ترانہ' کے لیے ۱۹۴۳ء میں لکھا تھا حالانکہ کچھ 'انہونی' اور کچھ 'دھرتی کے لال' جن کے لیے جعفری نے گیت لکھے تھے، ان کی پہلی فلم مانتے ہیں۔ چند اور فلمیں جن کے ساتھ علی سردار جعفری وابستہ رہے یوں ہیں۔ دھوبی ڈاکٹر، پردیسی، گیارہ ہزار لڑکیاں، شہر اور سپنا، ہمارا گھر، انارکلی وغیرہ۔ بقول خالد عابدی، علی سردار جعفری فلموں کے لیے سنجیدہ نہیں تھے۔ وہ فلموں کے لیے تفریحاً لکھ دیا کرتے تھے کیونکہ ان کے احباب فلموں سے وابستہ تھے۔ ان کی فرمائش اور اصرار کو وہ ٹال نہیں سکتے تھے۔''

فلموں سے وابستگی کے بارے میں مولانا ابوالکلام آزاد کا بھی نام لیا جا رہا ہے مگر مصنف کی تحقیق کے مطابق یہ سچ نہیں ہے۔ وہ لکھتے ہیں ''مولانا ابوالکلام آزاد نے نہ تو کسی فلم میں ہیرو کا رول ادا کیا اور نہ ہی انہوں نے کسی فلم کی ہدایت کاری کی اور نہ ہی کبھی وہ فلمساز رہے۔''

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر ''گونا گوں اور مختلف النوع طبیعت و مذاق کے آدمی تھے۔ ان کا ایک ذوق فلم سازی بھی تھا..... کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کے سب سے چھوٹے بھائی سریندر سنگھ بیدی بھی فلم سازی میں ان کے شریک کار رہے ہیں۔'' خالد عابدی مزید لکھتے ہیں کہ ''کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے پانچ فلمیں بنائی تھیں۔ تین پنجابی زبان میں اور دو اردو زبان میں۔ ان کی فلموں کے نام تھے۔ دُکھ بھنجن تیرا، من جیتے جگ جیت، پالی تیرے انیک، چرن داس اور پیاسی آنکھیں۔'' بہر حال انہوں نے فلم سازی کو ذرائع آمدنی کے بدلے محض تفریح کے طور پر اپنایا۔

مضمون 'محافظ حیدر۔ ایک شاعر، ایک ادیب اور فلم نگار' میں مصنف تحریر فرماتے ہیں۔ ''فلموں میں منظر نامہ، مکالمہ نویسی، ریڈیو کے لیے ڈرامہ نگاری، صداکاری ان کے مشغلوں کے ساتھ ذریعہ معاش بھی تھا۔'' ان کا تخلص 'ثاقب' تھا۔ انہوں نے پہلی شعری تخلیق 'سلام' ایک مسالمے میں پڑھی تھی جبکہ نثر میں ان کی پہلی ادبی تخلیق ایک افسانہ تھا جو روزنامہ میزان حیدرآباد میں ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا تھا۔ موصوف صحافت کے ساتھ بھی وابستہ رہے اور کئی ثقافتی و ادبی اداروں کے رکن بھی تھے۔ علاوہ ازیں وہ ایک ماہر اور تجربہ کار 'یوگی' بھی تھے۔

فلموں میں اساتذہ کا کلام بھی استعمال ہوتا رہا ہے۔ مضمون فلم 'مرزا غالب اور اس کی وجہ تخلیق' بقول خالد عبادی جواہر لال نہرو کی شہ پر بنی تھی۔ انہوں نے سہراب مودی کو مرزا غالب پر فلم بنانے کی ترغیب دی تھی۔ ابتداء میں فلم کا اسکرپٹ سعادت حسن منٹو نے لکھا مگر ان کے پاکستان جانے کے بعد یہ کام راجندر سنگھ بیدی نے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ فلم کامیاب بھی رہی اور اس پر صدر جمہوریہ ہند نے ایوارڈ بھی دیا۔ اس کے بعد کیفی اعظمی کے اسکرپٹ پر ایک دستاویزی فلم بھی بنی تھی۔ ۸۹۔۱۹۸۸ء میں مرزا غالب پر ٹیلی ویژن کے لیے گلزار نے ایک سیریل بنایا جو کافی مقبول ہوا۔ جہاں تک اقبال کے کلام کا تعلق ہے ان کا قومی ترانہ (سارے جہاں سے اچھا) کئی فلموں کی زینت بنا۔ اس کے علاوہ 'لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری'، 'کونسی قوم' فقط تیری طلبگار ہوئی' 'ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں تیرا نام رہے' 'اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں' نے بھی فلموں میں جگہ پائی۔ ان کے علاوہ اقبال کی کئی غزلوں اور نظموں سے تحریک پا کر کئی فلموں کے گیت لکھے گئے۔

'دلیپ کمار۔ اُردو رسائل کی خصوصی اشاعتوں میں' کے عنوان سے ایک طویل مضمون کتاب میں شامل ہے۔ شہنشاہ جذبات دلیپ کمار اپنے آپ میں ایک ادارہ ہیں۔ مصنف نے عکاس ویکلی کولکتہ، ماہنامہ

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

روبی دہلی، اداکار فلم ڈائجسٹ، فلمی ستارے اور ماہنامہ گلفام کے خصوصی نمبروں کی روشنی میں دلیپ کمار (اوران کی اہلیہ سائرہ بانو) کی شخصیت اور فنکاری کو اجاگر کیا ہے۔ دلیپ کمار کا اعتراف ہے کہ وہ جب تک کردار کے مزاج کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہوتے تھے تب تک وہ کوئی بھی رول ادا نہیں کر پاتے تھے۔ یوسف خاں کو دیوکا رانی کی وساطت سے شری بھگوتی چرن ورما نے 'دلیپ کمار' کا فلمی نام تجویز کیا تھا۔ ان کی پہلی ہیروئن مردولا تھی۔ وہ کہتی ہیں کہ ان دنوں دلیپ کمار کافی شرمیلے، کم سخن اور کچھ ڈرے ڈرے سے رہتے تھے۔ مضمون میں دلیپ کمار کے معاشقوں کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ بقول ساحر لکھنوی۔ ''دلیپ کمار کو ادب سے عشق کی حد تک لگاؤ ہے۔ فرصت کے اوقات کا بیشتر حصہ مطالعہ میں صرف ہوتا ہے۔ ان کی لائبریری نایاب کتب کا مخزن ہے۔'' کئی بار دلیپ کمار نے بڑے مشاعروں کی نظامت بھی انجام دی ہے۔ دلیپ کمار اور راج کپور چنانچہ ہم عصر تھے اس لیے پیشہ وارانہ رقیب بھی سمجھے جاتے تھے مگر انہوں نے باہم دوستی سے کبھی منہ نہیں موڑا۔ دلیپ کمار پر کئی طرح کے الزامات بھی لگائے جا چکے ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ ہر کام میں دخل اندازی کرتے ہیں اور انہوں نے پاکستان میں 'امتیاز پاکستان' کا اعزاز قبول کیا۔ جواباً یہ کہنا کافی ہوگا کہ تعمیری تنقید Constrictive Criticism کو دخل اندازی سمجھنا بڑی بھول ہے کیونکہ دلیپ کمار خود کو فلمی کنبے کا ایک فرد سمجھتے تھے۔ دوسرے یہ کہ ان سے پہلے پرائم منسٹر مرار جی ڈیسائی نے بھی یہ اعزاز قبول کیا تھا۔ فلم ڈائجسٹ روبی کے دلیپ سائرہ نمبر کے مضمون۔ ''دلیپ کا فن اور چار دور' میں پہلا دور ملن، جگنو، شہید، شبنم، ندیا کے پار، دوسرے دور میں بابل، میلہ، انداز، جوگن، آرزو، ہلچل، دیدار، داغ، امر، سنگدل اور شکست، تیرے دور میں آزادی، آن، انسانیت، کوہ نور اور چوتھے دور میں نیا دور، پیغام اور گنگا جمنا شامل کی جاسکتی ہیں۔ البتہ یہ بات بھی سچ ہے کہ اس حزن کے شہنشاہ (Tragedy king) نے نفسیاتی دباؤ کو کم کرنے کے لیے طربیہ (Comedy) کی طرف رجوع کیا۔

'ہماری فلمیں اور اردو' عام موضوعات سے ہٹ کر ہے۔ اس لیے اردو ادب میں ایک اہم اضافہ ہے۔ یہ امر مسلم ہے کہ اردو اور ہندوستانی فلموں کا آپس میں اٹوٹ بندھن رہا ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ ان فلموں میں اردو کے یوگدان پر پوری تحقیق کی جانی چاہیے تاکہ آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ رہے۔ چونکہ میدان بہت وسیع ہے اس لیے میں یہ سمجھتا ہوں کہ مذکورہ تصنیف اس سمت میں ایک چھوٹا سا مگر مثبت قدم ہے جس کو آگے بڑھانے کی از حد ضرورت ہے۔

❖ ❖ ❖

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

پونے میں اُردو افسانہ۔ایک تحقیق

—— نذیر فتح پوری

'پونے میں اُردو افسانہ۔ایک تحقیق' اردو ادب میں ایک گراں بہا اضافہ ہے جس میں نذیر فتح پوری نے پونے کے حوالے سے ۱۹۲۳ء سے لے کر اب تک کے افسانوی سفر کا زمانی اعتبار سے خاکہ کھینچ لیا ہے۔بقول نذیر فتح پوری پونے میں افسانے کے حوالے سے کبھی کوئی اجتماعی سرگرمی نظر نہیں آئی البتہ انفرادی طور پر افسانہ نگار اپنا کام کرتے رہے۔اس کتاب میں وہ ادیب بھی شامل کیے گئے ہیں جو کسی نہ کسی صورت میں پونے سے بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر وابستہ رہے ہیں۔پونے کی خوش قسمتی یہ بھی رہی ہے کہ یہ ممبئی کی فلم نگری کے نزدیک ہے جس کے سبب کئی نامور فلمی قلم کار یہاں کچھ وقت کے لیے آتے رہے اور یہاں کی ادبی محفلوں کو گرماتے رہے۔شاعر،افسانہ نگار،ناول نگار،خاکہ نگار،تنقید نگار اور محقق نذیر فتح پوری کی یہ بیالیسویں تصنیف ہے جس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ موصوف کس قدر محنت اور لگن سے اردو کی خدمت میں جٹے ہوئے ہیں۔

نذیر فتح پوری کی تحقیق کے مطابق پونے کا سب سے پہلا افسانہ نگار صادق دُرانی تھا جس کا افسانہ 'گلزارِ سخن' میں ۱۹۲۳ء میں بعنوان 'جنہیں ہے عشق صادق وہ کہاں فریاد کرتے ہیں' دو قسطوں میں چھپا تھا۔ سب سے پہلا ناول خود مصنف نے ہی 'چٹانوں کے بیچ' کے عنوان سے تحریر کیا تھا جبکہ مس خورشید نکہت ناول نگاری کے میدان میں کافی فعال رہی۔کرشن چندر نے دو افسانے 'ان داتا اور موبی' اور سعادت حسن

ناشر:حاجی غلام محمد اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ،پونے
سن اشاعت:مئی ۲۰۱۰ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

منٹو نے ایک افسانہ 'ممی' پونے کے قیام کے دوران ہی لکھے تھے۔ محقق نے جہاں ماہنامہ گلزارِ سخن، ماہنامہ شاہین اور سہ ماہی اسباق میں چھپے افسانوں کی تفصیل دی ہے وہیں ماہنامہ شاعر ممبئی میں چھپی پہلی کہانی کا ذکر بھی کیا ہے۔ اردو کی خدمت میں ادارہ' اسباق کی کوششوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ سب سے اچھی بات یہ کہ انہوں نے جہاں تک ممکن ہو سکا ہر افسانہ نگار کے کوائف اور ایک نمائندہ افسانہ بھی کتاب میں شامل کیا ہے۔ جن افسانہ نگاروں کا اس کتاب میں ذکر ملتا ہے ان کے نام یوں ہیں۔ صادق دُرانی، پریم شرر، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر عصمت جاوید شیخ، مس خورشید نکہت، ایم ایف پرویز، نذیر فتح پوری، رشید اعجاز، مشتاق مدنی، قاضی مشتاق احمد، محمد خالد انصاری، زین العابدین خان، بالقیس ظفیر الحسن، رفیق جعفر، معراج انور، اندرا شبنم اندو، نسرین رمضان سید، شیخ طاہرہ عبدالشکور، اور تاکیدار شمشاد جلیل شاد۔ ان میں بیشتر افسانہ نگاروں پر ترقی پسندی کا خاصا اثر نظر آتا ہے جبکہ چند ایک نے جدید اسلوب کو اختیار کیا ہے۔ کچھ قلم کاروں نے اردو ادب میں اپنا ایک خاص مقام بنایا ہے۔ اس طرح یہ کتاب نہ صرف ان افسانہ نگاروں کی فہرست سازی کرنے میں کامیاب ہو چکی ہے بلکہ ان کے کارناموں کی جھلک پیش کرنے میں بھی کامیاب ہو چکی ہے۔ قاضی مشتاق احمد کا افسانہ 'میں مسز درگا بھارگو کا شوہر ہوں' اور بالقیس ظفیر الحسن کا افسانہ 'میرا نام بنتِ زینب ہے' ان افسانہ نگاروں کی شہرت کا آئینہ دار ہے۔ بہر حال یہ عین ممکن ہے کہ پونے میں افسانے کے ارتقاء کے حوالے سے مذکورہ کتاب میں کئی خامیاں رہ گئی ہوں کیوں کہ اس موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے لیکن اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ یہ حوالہ جاتی حیثیت رکھتی ہے اور مجھے پورا یقین ہے کہ یہ تصنیف ان تحقیق نگاروں کے لیے باعث تحریک ثابت ہوگی جو آئندہ اسی موضوع پر مزید تحقیق کرنے کے خواہاں ہوں۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.

Digitized By eGangotri

Asri Taqaze

By: Deepak Budki

ہماری تازہ ترین مطبوعات

جموں کشمیر کے روحانی شاعر	نور شاہ	پروفیسر محبوب انجانی کی اردو ادبی خدمات	شمیم احمد بٹ
فکر و فن	(تنقیدی تحقیقی مطالعات)	گفتگو ہوتی جواب گرا	(اردو کشمیری شاعری)
محمد یوسف ٹینگ			ممتاز مجید جاوید احمد مالکی
جدید اردو شاعری کا حسن شعور	ڈاکٹر محمد شفیع ملک	نالۂ نیم شب	ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی
اصغر وجاہت کشمیری	ڈاکٹر نذیر پرتی	دیتی مرق آئینہ	شہاب عنایت ملک / فریدہ پرتی
دشت نوردی	(ایک کشمیری عورت کی داستان)	اقبال اور اقبالیات	پروفیسر مجید انجم
غیر مجید محمد		شمشان ہندو	(ایک صحافی کی سرگزشت)
مقبول ساحل		شریقم	محمد یوسف ٹینگ
کشمیر اور جدید	نور شاہ / جاوید وانی	محمد مجید کے بہترین افسانے	سیم ساحل
تحریری مطالعے	جاوید احمد وانی	بریلوی ادبیات	(افسانوں کا مجموعہ)
دیپک بدکی		بانوں کے کس	شہاب عنایت ملک
ہندو کی سیر	(کشمیری تاریخی جغرافیائی آئینہ)	ڈاکٹر عزیز حاجنی	
تنقید مطالعہ اور تاثر	شبیر اختر	تشنگی نغمہ	(غزلوں کا مجموعہ)
اشرف عادل		تصنیفات اقبال	پروفیسر مشتاق سلطانپوری
یادوں	(یادوں کے لمحے)	اردو ادبی	(شعری مجموعہ)
عبدالرحمٰن تخلص		ڈاکٹر میر جلال الدین	
آمین جیسی آمیز	نگہت نسیم	پروفیسر محبوب انجانی / شخصیت اقبال شناس	ڈاکٹر سید نسیم احمد
بھولے ہوئے اختر اور شعر	پروفیسر شہاب عنایت ملک	موج نیل موج	(اردو کشمیری)
جاوید احمد وانی		دیپک بدکی کی افسانہ نگاری	جاوید اقبال شاہ
قرۃ العین حیدر	(افسانوں کا مجموعہ)	محمد شبیل عادل	صحبت صالحین (فکر اقبال کی روشنی میں)
فیض احمد فیض		دل نوازیات	(انتقادی مضامین)	محمد حبیب	گردش دوراں	(افسانے)
حسن سادہ		معنی تحریریں	(تنقیدی مضامین)	دیپک بدکی	کاشرنگ کا بیٹا	
رشید کاشپوری		اقبال اور قوم و ملت	(اقبال کا مجموعہ)	ڈاکٹر اقبال آفاقی	کہاں گئے وہ دن	
رشید اعل		کاشر	فاروق نازکی		عصری تحریریں	(تبصرے تنقیدی مضامین) جلد اول
دیپک بدکی					عصری شعور	(تبصرے تنقیدی مضامین) جلد دوم
دیپک بدکی						
اردو میں علامتی افسانہ نگاری	ڈاکٹر سلطانہ بیگم				نور شاہ کے تین ناول	
رافت عزت					تعمیر سیرت (ریڈیائی تقاریر)	
عبدالمجید خان (نوشہری)						
اردو افسانہ تنقید	ڈاکٹر ساحل				سونہ سائی اچھر	
سید اختر حسین						
قلم سوئی بیل	ڈاکٹر سیت لکھی انجانی				نکات ۱۰۰	(برائے نیٹ)
ڈاکٹر زور کشمیری						
کتاب جہاں بیکر	پروفیسر حامدی کاشمیری				کتاب ریچھ	(انجانی کا قلم)
محمد سیم ساحل						
اردو شعری روایت (جلد اول)	پروفیسر حامدی کاشمیری				جاہل پر محمد چند اور میدان عمل	
ڈاکٹر زور کشمیری						
اردو شعری روایت (جلد دوم)	پروفیسر حامدی کاشمیری				غالب شناسی	
ڈاکٹر محسن عمل نگلت						
اردو غزل شناسی	پروفیسر شہاب عنایت ملک				تفسیر اقبال	(سوال جواب اقبالیات)
فیض احمد فیض						
حقیقت شناسی	پروفیسر شہاب عنایت ملک				برج پریمی کی ادبی خدمات	
ڈاکٹر محسن عمل نگلت						
سوغات بلبل	(کلیات سعد اللہ بلبل)	مولوی سعد اللہ بلبل			قرۃ العین حیدر کا فن	
سید نگہت فاروقی						
جہان اقبال	ڈاکٹر ریاض توحیدی					

Meezan Publishers
Opp. Fire Service HQRS Batamaloo Srinagar 190009 Kashmir
Ph: 2470851 Fax: 0194-2457215 Cel:9419002212
email: meezanpublishers@rediffmail.com

ISBN 978-81-909941-0-1
978-81-909941-0-1

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.